پاکستان میں تجدید واحیائے دین کی معاصر جہتیں و منہاج

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

محمد فاروق

ایم فل سکالر علوم اسلامیہ

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی

لیکچرار، علومِ اسلامیہ

نمل اسلام آباد

شعبہ علوم اسلامیہ

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

سیشن ۲۰۱۷ء

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کی دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز سے اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **پاکستان میں تجدید واحیائے دین کی معاصر جہتیں و منہاج**

Topic : Contemporary Aspects and Methodology of Islamic Revivalism in Pakistan.

Topic in Roman Urdu: Pakistan main Tajdeed wa Ahyaye Din ki Maasir Jehatay wa Minhaaj.

نام ڈگری: **ایم فل علوم اسلامیہ**

نام مقالہ نگار: **محمد فاروق**

رجسٹریشن نمبر: **1350 MPhil/IS/S17**

ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی ____________________

نگران مقالہ — دستخط نگران مقالہ:

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی ____________________

ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز — دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ____________________

پرو-ریکٹر اکیڈمکس، نمل — پرو-ریکٹر اکیڈمکس کے دستخط

تاریخ: ____________________

Declaration حلف نامہ

(Candidate Declaration Form)

میں (مقالہ نگار) محمد فاروق ولد فضل مولا

رجسٹریشن نمبر **1350 MPhil/IS/S17**

طالبعلم، ایم فل، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان:

پاکستان میں تجدید واحیائے دین کی معاصر جہتیں و منہاج

Topic : **Contemporary Aspects and Methodology of Islamic Revivalism in Pakistan.**

Topic in Roman Urdu: **Pakistan mein Tajdeed wa Ahyaye Din ki Maasir Jehatay wa Minhaaj.**

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، **ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، ماسوائے جہاں متن مقالہ میں بیان کیا گیا ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: _______________

دستخط مقالہ نگار: _______________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

مقالہ جمع کرانے کی تاریخ: ___________

انتساب

اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے نام

جن کی محنت اور دعاؤں سے علم و تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے کے قابل ہو سکا۔

اظہار تشکر

اولاً اللہ رب العزت کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جس کی خاص مدد اور توفیق سے راقم کے لیے تحقیق کرنا اور اس کو تکمیل تک پہنچنا آسان ہوا۔ اس کے بعد والدین کا بے حد احسان مند ہوں کہ ان ہی کی دی ہوئی راہنمائی، تربیت اور دعاؤں سے تحقیق کے راستوں پر چلنے کی توفیق ملی ۔ خاص طور پر اپنے بہن بھائیوں کا بے حد مشکور ہوں جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی اس دوران ہر پہلو سے شامل حال رہی۔

میں بالخصوص محترم **ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی** اور **ڈاکٹر ذوالقرنین صاحب** کا بے حد مشکور ہوں جن کا سایہ راہنمائی ہر لمحے ساتھ رہی۔ اپنے استاد محترم ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ جناب **ڈاکٹر نور حیات صاحب** کا بھی مشکور ہوں جن کے زیر سایہ یہ ادارہ بہترین نتائج اور علمی ماحول مہیا کر رہا ہے۔

اسی طرح شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ نمل کے ان تمام اساتذہ کرام اور دیگر دوستوں کا خصوصاً محترم سلمان حنیف کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں ، جنہوں نے میری علمی معاونت فرمائی، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو دنیا اور آخرت کی خیر و برکتیں نصیب فرمائیں۔ آمین

محمد فاروق

ایم فل سکالر، علوم اسلامیہ، نمل، اسلام آباد

تاریخ: 10-12-2020

Abstract

Allah has bestowed upon us a great blessing that he has blessed us with a great blessing like Islam, and then Allah has sent his Prophets from time to time for the Guidance of Mankind. From Hazrat Adam (A.S) to Hazrat Muhammad (S.A.W), all the prophets have presented a straightforward religion to the world.

All these prophets have presented the original shape of Islam to the people, but unfortunately, after centuries, the dust fell on the original shape of Islam, some people tried to change the original form of religion, and the condition of Islam today is that in Islamic beliefs, in worship, in matters and in civilizations many new things have been added which have no concern with Islam.

This Thesis not only identifies new things in beliefs, worship matters and civilizations, but also what strategies can be adopted to prevent such new things in religion in the future.

Islam is a universal religion ordained by Allah, the lord of glory, in which Allah has embraced the virtues of all the previous religions but laws have been formulated in Islam through which the society can be taken in the right direction.

The thesis also deals with such laws, in light of which make sure to bring reforms in all fields including media in the light of divine teachings and teachings of the Prophet (PBUH).

The thesis is consisted of five chapters and each chapter has three sub chapters. The first chapter and second chapter consists the Aspects of renewal and revival of religion in Islamic beliefs and Islamic concept of worship and contemporary understanding. The third and fourth chapter is about the Islamic teachings and contemporary ideas on matters and cultural aspects of Modernization, and the fifth chapter deals about the action plan for the future renewal and revival of Islam.

مقدمہ

موضوع تحقیق کا تعارف(Introduction Of The Research Topic)

یہ قانون فطرت ہے کہ کوئی بھی فکر اپنی پہلی اور اصل حالت پر ہمیشہ باقی نہیں رہتی بلکہ وقت کے ساتھ مختلف اثرات اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں، اسی لیے ان اثرات کو دور کر کے اصل حقیقت اور روح کو سامنے لایا جاسکتا ہے اور دوبارہ اس کی سابقہ کارکردگی اور نتیجہ آفرینی کی قوت بحال کی جاسکتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی صورت میں وقت کے ساتھ اس میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے،اس وجہ سے اس کی اصل حقیقت نگاہوں سے مستور اور اس کا نفع محدود ہو جاتا ہے۔ تجدید کا عمل یہ ہے کہ اس کہنگی اور کمزور بنیادوں کو منہدم کرنا اور نئی تعمیر اٹھانا نہیں ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت اور شکل کو از سر نو زندہ کرنا ہے۔

موضوع تحقیق کا پس منظر(Back Ground Of The Research Topic)

اسلام کی اصطلاحی زبان کے جو الفاظ کثرت سے زبان پر آتے ہیں ان میں سے ایک لفظ ''مجدد'' بھی ہے۔اس لفظ کا ایک مجمل مفہوم تو قریب قریب ہر شخص سمجھتا ہے،یعنی یہ کہ جو شخص دین کو از سرِ نو زندہ اور تازہ کرے وہ مجدد ہے۔لیکن اس کے تفصیلی مفہوم کی طرف بہت کم ذہن منتقل ہوتے ہیں۔کم لوگ جانتے ہیں کہ تجدیدِ دین کی حقیقت کیا ہے، کس نوعیت کے کام کو ''تجدید'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے،اس کام کے کتنے شعبے ہیں، مکمل تجدید کا اطلاق کس کارنامے پر ہو سکتا ہے اور جُزوی تجدید کیا ہوتی ہے۔اسی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ لوگ ان مختلف بزرگوں کے کارناموں کی پوری طرح تشخیص نہیں کر سکتے جن کو تاریخ اسلام میں مجدد قرار دیا گیا ہے۔وہ بس اتنا جانتے ہیں کہ عمر ابن عبد العزیز بھی مجدد،امام غزالی بھی مجدد،ان تیمیہ بھی مجدد، شیخ احمد سرہندی بھی مجدد اور شاہ ولی اللہ بھی مجدد، مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ کون کس حیثیت سے مجدد ہے اور اس کا تجدیدی کارنامہ کس نوعیت اور کس مرتبہ کا ہے۔ اس غفلت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جن ناموں کے ساتھ ''حضرت''،''امام''، حجۃ الاسلام''،''قطب العارفین''، ''زبدۃ السالکین'' اور اسی قسم کے الفاظ لگ جاتے ہیں ان کی عقیدت مندی کا اتنا بوجھ دماغوں پر پڑ جاتا ہے کہ پھر کسی میں یہ طاقت نہیں رہتی کہ آزادی کے ساتھ ان کے کارناموں کا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھیک مشخص کر سکے کہ کس نے اس تحریک کے لیے کتنا اور کیسا کام کیا ہے ،اور اس خدمت میں اس کا حصہ کس قدر ہے۔ عموماً تحقیق کی نپی تُلی زبان کے بجائے ان بزرگوں کے کارنامے عقیدت کی شاعرانہ زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والے پر یہ اثر پڑتا ہے،اور شاید لکھنے والے کے ذہن میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جارہاہے وہ فردِ کامل تھا اور اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ہر حیثیت سے کمال کے آخری مرتبے پر پہنچا ہوا تھا۔ حالانکہ اگر اب ہم کو تحریکِ اسلامی کی تجدید و احیاء کے لیے کوئی کوشش کرنی ہے تو اس قسم کی عقیدت مندی اور اس ابہام و اجمال سے کچھ کام نہ چلے گا۔ ہم کو

پوری طرح اس تجدید کے کام کو سمجھنا پڑے گا۔اور اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہوگا کہ ان بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے جتنے کام کئے ہیں اور کس طرح کیے ہیں،ان سے ہم کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں،اور ان سے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے جس کی تلافی پر اب ہمیں متوجہ ہونا چاہیے۔

ضرورت واہمیت(Need and Importance)

اسلامی فکر ماضی میں ایک توانا فکر رہی ہے جس نے تاریخ کو ایک نئی سمت عطا کی اور دنیا کو ایک نئی تہذیب سے روشناس کرایا، موجودہ حالات میں فکر افراط و تفریط کا شکار ہوگئی ہے جس کی وجہ سے وہ عصر حاضر کے فکری چیلنجوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر رہی۔اس لیے ضرورت ہے کہ ماضی کی اساس پر حال کے علمی اور عملی تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فکر اسلامی کی عمارت کو بلند اور مضبوط کرنے کی کوشش کی جائے۔اس کی دوبارہ اس طرح تشکیل و تجدید کی جائے کہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کر سکے اور اس کے مثبت نتائج دنیا کے سامنے آسکیں۔

بنیادی مسئلہ(Basic Problem)

مجددین اسلام نے ہر دور میں اسلام کو اسکی اصلی شکل میں پیش کرنے کے لیے تجدید دین کے لیے کوششیں کی ہیں۔اس حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں موجودہ دور میں دین اسلام کے کن کن پہلوؤں میں تجدید کی ضرورت ہے اور کار تجدید کی نوعیت کیا ہے؟ نیز یہ کہ تجدید واحیائے اسلام کے لیے کیا منہج اختیار کیا جائے؟

مقاصد تحقیق(Objectives Of The Research)

اس کے اہم مقاصد درج ذیل ہیں:

۔تجدید واحیائے دین کی اہمیت اور اصولوں کو واضح کرنا۔

۔عقائد اسلامیہ میں تجدید واحیا کی جہتوں کو سامنے لانا۔

۔تجدید دین کے تہذیبی و تمدنی پہلوؤں کو اجاگر کرنا۔

۔اسلام کے وسیع تصور عبادت کو واضح کرنا۔

۔قرآن وسنت کی روشنی میں معاملات کے صحیح تصور کے لئے اصلاح کی کوشش کرنا۔

۔پاکستان میں تجدید دین کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔

۔ تجدید دین میں حائل رکاوٹوں کا جائزہ اوران کے ادراک کے لئے ممکنہ حل پیش کرنا۔

۔ مستقبل میں تجدید واحیائے دین کے لئے فریم ورک بنانا۔

تحدید کار(Limitation Of The Research Topic)

موجودہ مقالے میں پاکستان میں تجدید واحیائے دین میں حائل رکاوٹیں اوران مجددین کے اصولوں کا جائزہ لیا جائیگا جنہوں نے اصلاحی معاشرے کو کھڑا کرنے میں وہ اصول اپنائے ہو۔

موضوع پر سابقہ کام کا جائزہ:(Previous Work)

اگر دیکھا جائے تو تجدید واحیائے دین میں حائل رکاوٹوں پر کوئی کام سامنے نہیں آیا جس پر ایم فل لیول پر جامع کام ہوا ہو البتہ تجدید و احیائے دین پر آرٹیکلز لکھے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہیں:

۱۔ تجدید واحیائے دین میں مولانا مودودی کا کردار۔(احمد حامدی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد ۲۰۱۵)

۲۔ عصری تقاضے اور فکر اسلامی کی تجدید۔(محمد طیب، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۸)

۳۔ غزالی اور مسئلہ تکفیر۔(وارث مظہری، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۰۱۰)

اسلوب تحقیق مقالہ(Research Methodology)

مقالہ ہذا میں اندازبیانیہ اختیار کیا گیا ہے۔ترجمہ قرآن مجید کے لیے فتح محمد جالندھری کا فتح المجید کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔قرآن مجید کی آیات اوراحادیث مبارکہ کے حوالہ نمل یونیورسٹی کے مقرر کردہ اُصولوں کے مطابق دیئے گئے ہیں۔

- موضوع سے متعلق کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔
- موضوع سے متعلق مختلف آرٹیکلز سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔
- دور جدید کی سہولیات (مثلاانٹرنیٹ)وغیرہ ے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

بنیادی تحقیقی سوالات(Research Question)

۱۔ عبادات کا اسلامی تصور اور معاصر تفہمات میں تجدید کا کیا منہاج ہو سکتا ہے؟

۲۔ عصر حاضر میں مختلف پہلوؤں میں تجدید کا کیا طریقہ ہو سکتاہیں؟

۳۔ تجدید دین کے راستے میں کیا رکاوٹیں ہیں اور انکو کیسے ختم کیا جاسکتا ہے؟

۴۔اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اسلام کے فکری و عملی مسائل کو تجدید کے ذریعے کیسے حل کیا جا سکتا ہے ؟

ابواب بندی

باب اول: عقائد اسلامیہ میں تجدید واحیاء کی جہتیں

فصل اول: اصلاح العقائد کا نبوی طریقہ کار

فصل دوم: عصر حاضر میں عقیدہ کے اصلاح طلب پہلو

فصل سوم: عقائد اسلامیہ کی تجدید کے اصول و طریقہ کار

باب دوم: عبادات کا اسلامی تصور اور معاصر تفہیمات

فصل اول: عبادت کے متعلق معاصر تفہیمات

فصل دوم: عبادات کے ظاہری ڈھانچے اور مقاصد میں فرق

فصل سوم: اسلام کے وسیع تصور عبادت کے معمولات زندگی پر اثرات

باب سوم: معاملات کے متعلق اسلامی تعلیمات اور معاصر تصورات

فصل اول: معاملات زندگی کی شریعت اسلامیہ میں اہمیت

فصل دوم: معاملات کے متعلق معاصر دینی تصورات و رویے

فصل سوم: قرآن وسنت کی روشنی میں معاملات کے صحیح تصور کی وضاحت

باب چہارم: تجدید دین کے تہذیبی و تمدنی پہلوؤں

فصل اول: معاصر طرز فکر اور اسلامی طرز فکر کا باہم موازنہ

فصل دوم: اسلامی اور غیر اسلامی تمدن میں فرق کی وضاحت

فصل سوم: تہذیب و تمدن کی جدید شکلوں کی اسلامائزیشن

باب پنجم: مستقبل میں تجدید واحیائے اسلام کے لیے لائحہ عمل

فصل اول: تجدید دین میں حالیہ رکاوٹیں

فصل دوم: تجدید دین کے لئے جدید وسائل اور ان کا استعمال

فصل سوم: اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اسلام کے فکری و عملی مسائل کا حل

فصل چہارم: مولانا مودودی، مولانا اسد محمود اور ڈاکٹر اسرار کے نظام حکومت کا ڈھانچہ

فہرست عنوانات

تمہید 7

تجدید واحیائے دین کا تعارف : 8

مجدد کی خصوصیات اور اصول تجدید : 10

مجدد اور نبی کا فرق : 11

اسلامائیزیشن اور تجدید میں فرق : 11

اصول تجدید : 11

باب اول : عقائد اسلامیہ میں تجدید واحیاء کی جہتیں 14

فصل اول : اصلاح العقائد کا نبوی طریقہ کار 15

فصل دوم : عصر حاضر میں عقیدہ کے اصلاح طلب پہلو 29

فصل سوم : عقائد اسلامیہ کی تجدید کے اصول و طریقہ کار 48

باب دوم : عبادات کا اسلامی تصور اور معاصر تفہیمات 77

فصل اول : عبادت کے متعلق معاصر تفہیمات 78

فصل دوم : عبادات کے ظاہری ڈھانچے اور مقاصد میں فرق 91

فصل سوم : اسلام کے وسیع تصور عبادت کے معمولات زندگی پر اثرات 104

باب سوم : معاملات کے متعلق اسلامی تعلیمات اور معاصر تصورات 122

فصل اول : معاملات زندگی کی شریعت اسلامیہ میں اہمیت 123

فصل دوم : معاملات کے متعلق معاصر دینی تصورات و رویے 135

فصل سوم : قرآن وسنت کی روشنی میں معاملات کے صحیح تصور کی وضاحت 154

باب چہارم : تجدید دین کے تہذیبی و تمدنی پہلو 163

فصل اول : معاصر طرز فکر اور اسلامی طرز فکر کا باہم موازنہ 164

فصل دوم : اسلامی اور غیر اسلامی تمدن میں فرق 175

فصل سوم : تہذیب و تمدن کی جدید شکلوں کی اسلامائزیشن 192

باب پنجم : مستقبل میں تجدید واحیائے اسلام کے لیے لائحہ عمل 213

فصل اول : تجدید دین میں حالیہ رکاوٹیں 214

فصل دوم : تجدید دین کے لیے جدید وسائل اور ان کا استعمال 232
فصل سوم : اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اسلام کے فکری و عملی مسائل کا حل 250
فصل چہارم : مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار اور محمد اسد کے نظام حکومت کا ڈھانچہ 271
نتائج بحث 290
سفارشات و تجاویز 291
فنی فہارس 292
الف۔ فہرست آیات 293
ب۔ فہرست احادیث 298
ج۔ فہرست اصطلاحات 300
د۔ فہرست اعلام 301
فہرست مصادر و مراجع 303

تمہید

- تجدید واحیائے دین کا تعارف
- عصر حاضر میں تجدید دین کے مختلف پہلو
- مجدد کی خصوصیات اور اصول تجدید

تجدید واحیائے دین کا تعارف:

تجدید واحیائے دین کی اصطلاح آج کل دینی ادب میں عام ہے، لیکن اس کا مطلب وہ نہیں ہے، جو اس کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، کیونکہ دین اسلام کو جو اللہ تعالی کی جانب سے آنے والا آخری دین ہے، نہ تو معروف معنوں میں کسی تجدید کی ضرورت ہے، اور نہ ختم ہو گیا ہے کہ اس کے احیا کی ضرورت ہو، بلکہ اس اصطلاح میں تجدید سے مراد دین کو جدید انداز میں اسطرح پیش کرنا ہے، کہ لوگ اسے صحیح تناظر میں دیکھے اور سمجھ سکیں یا اسے جدید اسلوب میں اسطرح پیش کرنا کہ اس میں جدید تقاضوں کے پورا کرنے اور عصری مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نظر آئے۔ اسی طرح اس اصطلاح میں دین اسلام کی تعلیمات کو اس طریقے سے سامنے لانا جیسا کہ وہ اپنی ابتداء میں تھا اور اسے حشو وزوائد اور ان بدعات و محدثات اور انحرافات سے صاف کر کے خالص انداز میں پیش کرنا بھی شامل ہے جو مرورزمانہ سے اس میں داخل ہو گئے ہوں۔

آج کل لوگ تجدید اور تجدد میں تمیز نہیں کرتے اور ہر نئے کام کرنے والے یا نیا طریقہ نکالنے والے کو مجدد کہنے لگ جاتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ جو کوئی نیا کام کرے اور اسے ذرا زور سے چلائے اس کو مجدد کہتے ہیں۔ جو لوگ محض اسلام کا نام لیتے ہیں اور پوری قوم کو جاہلیت کے اندھے کنویں میں دھکیل دیتے ہیں، انہیں مجدد کے لقب سے نوازتے ہیں حالانکہ ایسے لوگ متجدد کہلاتے ہیں جو تجدد سے کام لیتے ہیں۔ تجدید کا کام ایسا نہیں ہے، بلکہ اصل تجدیدی کام یہ ہے، کہ اسلام کو کم علمی کی وجہ سے جنم لینے والے غلط رسم ورواج اور غلط طریقوں سے پاک کر دیا جائے اور کسی حد تک اسلام کو اپنی اصل حالت میں از سرنو اجاگر کیا جائے۔ اس حوالے سے مجدد جاہلیت کے مقابلے میں مصالحت کا راستہ نہیں اپناتا اور چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی جاہلیت کی حمایت نہیں کرتا، یہ بھی ذہن میں رہے کہ تجدید سے مراد تجدد نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں۔ تجدد کا مطلب اسلام کو عصر حاضر کے حالات وخیالات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے[1]۔

- **عصر حاضر میں تجدید دین کے مختلف پہلو**

اس کار تجدید کے مختلف پہلو حسب ذیل ہیں جو کہ موجودہ زمانہ کے لحاظ سے مطلوب ہیں۔

- موجودہ زمانہ میں تلفظ کلمہ کو ایمان سمجھا جانے لگا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس حقیقت کو لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح کیا جائے کہ معرفت کلمہ کا نام ایمان ہے نہ کہ مجرد تلفظ کلمہ کا۔
- موجودہ زمانہ میں قرآن مجید کو تلاوت کی کتاب بنایا گیا ہے اس میں تجدید کا کام یہ ہے کہ قرآن مجید کو از سرنو لوگوں کے لیے وعظ ونصیحت اور کتابِ تدبر بنانے کی کوشش کی جائے۔

---

1 سید ابوالاعلیٰ مودودی، تجدید واحیائے دین، اسلامک پبلی کیشنز، کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور، فروری ۲۰۱۰ ص: ۳۵

- موجودہ زمانے میں عبادت کو مسائل پر مبنی قرار دے دیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ دوبارہ صحیح تصور عبادت کو نمایاں کیا جائے جس میں عبادت کو خشوع پر مبنی قرار دیا گیا ہو۔
- موجودہ زمانہ میں کچھ ایسی تحریکیں اٹھی ہیں جنہوں نے اسلام کی اس طرح تعبیر کی گویا اسلام کا نشانہ اجتماعی نظام ہے۔ اس تعبیری غلطی کو واضح کرتے ہوئے یہ بتانا کہ اسلام کا اصل نشانہ فرد کے اندر تبدیلی لانا ہے نہ کہ اجتماعی نظام بدلنے کے نام پر سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کرنا۔
- موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی داعیانہ ذمہ داری کو بھول چکے ہیں۔ انھوں نے دوسرے کاموں کو دعوت کا عنوان دے رکھا ہے۔ اس صورت حال کو ختم کرنا اور دعوت و شہادت کے کام کو اس کی اصل روح کے ساتھ زندہ کرنا۔
- رسول کے معاملہ میں مسلمانوں کو اتباع رسول کا حکم دیا ہے، مگر اس کو انھوں نے عشق رسول کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ اس مبتدعانہ عقیدہ رسالت کو ختم کرنا اور صحیح قرآنی عقیدہ کو زندہ کرنا۔
- موجودہ مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر خدا پرستی کے بجائے اکابر پرستی رائج ہو گئی ہے اس گمراہی کو ختم کرکے مسلمانوں کو سچی خدا پرستی پر قائم کرنا۔
- سیرت و اسلامی تاریخ کی موجودہ کتابوں میں جنگوں کو سب سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے، اس کے بجائے سیرت اور تاریخ پر ایسی کتابیں تیار کرنا جن میں دعوت کو نمایاں حیثیت سے بیان کیا گیا ہو۔
- موجودہ زمانہ میں ایک روایتی مذہبی ڈھانچہ بن گیا ہے۔ مسلمان اسی کو دین سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس خود ساختہ ڈھانچہ سے نکالنا اور ان کو خدا اور رسول والے اصل دین سے وابستہ کرنا۔
- اپنے ارد گرد کے حالات کا پورا جائزہ لے کر یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ جاہلیت نے کہاں کہاں اپنے پنجے جما لیے ہے۔
- اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازلگانا کہ میں کتنی طاقت رکھتا ہوں اور کون سے راستے سے اصلاح کرنے کی قدرت رکھتا ہوں۔
- اصلاح کی تجویز، یعنی یہ معلوم کرنا کہ اس وقت کہاں وار کیا جائے کہ جاہلیت کے پنجے جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور اسلامی نظام پھر سے غالب آجائے۔
- ذہن کو مثبت سوچ کی طرف کرنے کی کوشش، اس سے مراد یہ ہے کہ افراد کے افکار کو تبدیل کرنا، تعلیم و تربیت کے نظام کی اصلاح اور اسلامی علوم کا احیا کرنا اور اسلامی اذہان کو از سر نو زندہ کرنا۔
- عملی اصلاح کے لیے کوشش، یعنی جاہلی رسم و رواج کو ختم کرنا، تزکیہ نفس کرنا، لوگوں میں شریعت کی اتباع کا جوش اور ولولہ پیدا کرنا اور ایسے لوگوں کو تیار کرنا جو اسلامی طرز کے حکمران بن سکیں۔

- دین میں اجتہاد، یعنی دین کے تمام اصول کو جاننا، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وقت کے ساتھ حالات کا صحیح جائزہ لینا اور یہ تقرر کرنا کہ اسلامی اصول کے تحت تہذیب و تمدن کے قدیم نقشے میں کس طرح تبدیلی لائی جائے جس سے اسلام کی اصل شکل بھی برقرار رہے، جس مقصد کے لیے اللہ نے اسلام کو ہماری ہدایت کے لیے بھیجا ہے وہ غرض وغایت بھی پورا ہو جائے اور صحیح معنوں میں اسلام پوری دنیا پر غالب بھی آجائے۔
- دفاعی جدوجہد، اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو ختم کرنے والی قوت کا ڈٹ کر اس کے خلاف کھڑا ہونا اور اسلام کو تمام قوتوں پر غالب کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کرنا۔
- اسلامی نظام کو زندہ کرنا، یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی چابیاں چھین کر حکومت کو عملی طور پر اسلامی نظام پر قائم کرنا[1]۔

مجدد کی خصوصیات اور اصول تجدید:

- مجدد نبی تو نہیں ہوتا لیکن اپنے مزاج میں نبی کے مزاج سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔
- مجدد نہایت کھلا ذہن، حقیقت تک نگاہ پہچانے والا، ہر قسم کے ٹیڑھے پن سے پاک، صاف گو، توسط و میانہ روی کی سیدھی راہ دیکھنے اور متوازن شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔
- مجدد اپنے ارد گرد کے ماحول اور سینکڑوں سالوں کے جمے ہوئے متعصبانہ سوچ سے بالاتر ہو کر سوچنے کی طاقت رکھتا ہے۔
- مجدد زمانہ کی بے ڈگر رفتار سے لڑنے کی جرات وطاقت رکھتا ہے۔
- مجدد قیادت وراہنمائی کی پیدائشی صلاحیت رکھتا ہے۔
- مجدد اجتہاد اور تعمیر نو کی اہلیت اور دین اسلام میں مکمل شرح صدر، نقطہ نظر اور ادراک میں کامل ہوتا ہے
- مجدد چھوٹی سے چھوٹی اجزاء میں بھی اسلام اور جاہلیت کے درمیان فرق کرنا اور مدت ہائے دراز کی الجھنوں میں سے حق کو الگ کر لیتا ہے۔

ان خصوصیات کے بنا کوئی بندہ مجدد نہیں ہو سکتا اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں[2]۔

---

1 مولانا وحیدالدین خاں، تجدید دین، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، اشاعت ۱۹۹۰، ص: ۱۰ .... تجدید واحیائے دین، ص: ۳۷

2 تجدید واحیائے دین، ص: ۳۶

مجدد اور نبی کا فرق:

وہ بنیادی چیز جو نبی اور مجدد میں امتیاز پیدا کرتی ہے یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امر تشریعی سے مامور ہوتا ہے، اسے اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے، اس پر وحی آتی ہے، نبی اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے، اسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینا پڑتی ہے اور اس کی دعوت ہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر لوگوں کے کافر یا مومن ہونے کا مدار ہوتا ہے، بر عکس اس کے مجدد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں۔ وہ اگر مامور ہوتا ہے تو امر تکوینی سے ہوا کرتا ہے نہ کہ امر تشریعی سے۔ اسے خود اپنے مجدد ہونے کی خبر نہیں ہوتی بلکہ اس کی موت کے بعد اس کی زندگی کے کارنامے سے لوگوں کو اس کے مجدد ہونے کا علم ہوتا ہے۔ اس پر الہام ہونا ضروری نہیں اور اگر ہوتا ہے تو لازم نہیں کہ اسے الہام کا شعور ہو۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا، نہ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے، کیوں کہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اس کے زمانہ کے تمام اہل اصلاح و خیر رفتہ رفتہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس سے الگ رہتے ہیں جن کی طبیعت میں کوئی ٹیڑھ ہوئی ہے مگر اسے ماننا مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہوتا ان تمام فروق کے ساتھ مجدد کو اسی نوعیت کا کام کرنا ہوتا ہے جو نبی کے کام کی نوعیت ہے [1]۔

اسلامائیزیشن اور تجدید میں فرق:

اسلامائیزیشن میں بنیادی نکتہ اسلامی ریاست میں اداروں اور دیگر معاشرتی معاملات میں اسلامی قوانین نافذ کرنا، اور ان کو اسلامی معاشرہ بنانا جیسی سوچ قابل ذکر ہے جبکہ تجدید میں نبی ختم الرسل ﷺ کا بیان کردہ قوانین پر جو انہی کے عہد میں تھے ان کا از سر نو احیاء کرنا مراد ہے۔

اصول تجدید:

جہاں تک تجدید و احیائے دین کی ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے تو اسلام میں اس کی دو بنیادیں ہیں: ایک اس کا تصور اجتہاد اور دوسرے اس کا تصور اصلاح۔ چونکہ اسلام اللہ کا آخری دین ہے، قرآن اللہ کی آخری کتاب اور حضرت محمدؐ اللہ کے آخری رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نہ تو صرف قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، بلکہ اپنی حکمت بالغہ سے کام لیتے ہوئے یہ انتظام بھی فرمایا ہے کہ زندگی کے وہ اہم مسائل جن کی اصلاح پر انسانی زندگی کا انحصار ہے انہیں واضح اور دو ٹوک الفاظ میں قرآن اور نبیؐ کے ذریعے وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جو انسان کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں اور جن پر تمدنی و تہذیبی ترقی اثر انداز ہوتی ہے تو وہاں منصوص تفصیلی احکام دینے کی بجائے محض اصول بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور یہ امت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ نا قابل تغیر نصوص، پالیسی اصولوں اور عمومی مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفصیلی احکام کا تعین خود کر لیں نصوص سے استنباط اور نئے امور میں حکم شرعی دریافت کرنے کا یہ منہاج اسلام میں اجتہاد کہلاتا ہے۔ نبیؐ نے نہ تو صرف خود

---

1 تجدید و احیائے دین، ص: ۳۶، ۳۷

اجتہاد کیا ہے، بلکہ اپنے صحابہ کرام کو بھی اس تربیت دی اور صحابہ کے بعد یہ روایت بعد کی صدیوں میں بھی جاری رہی۔ اگرچہ قرون متاخرہ میں مضمحل ہوگئی اور اس جمود و تقلید کے آثار ابھی تک امت مسلمہ میں باقی ہیں۔ شرعی اصولوں کے مطابق اجتہاد اسلام میں تجدید کا بہترین ذریعہ اور شکل ہے۔ اجتہاد کی حجت اور شرعی حیثیت واضح ہے۔ اس کی اساس قرآن اور احادیث نبویہ پر ہے۔

اسلام میں ''اصلاح'' کا تصور یہ ہے کہ چونکہ اب نبی نہیں آئے گا لہٰذا اب یہ امت کی عمومی ذمہ داری اور اس کے اصحاب علم و اقتدار کا فرض ہے کہ وہ نیکی کا حکم اور بدی سے روکنے کا عمل جاری رکھیں اور دین دوسروں تک پہنچائیں، چنانچہ بہت سی مسلم حکومتوں نے اس فرض کی ادائیگی کے لیے احتساب، ''امر بالمعروف'' و ''نہی عن المنکر'' اور دعوت و ارشاد کے محکمے بنائے گئے، مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کی آبادکاری کے لیے اوقاف کا انتظام کیا یا بیت المال سے ان کی اعانت کی۔ مسلمان علماء و صلحا نے حکومتوں سے باہر رہ کر یہ فریضہ انجام دیا اور آج کل افراد کے علاوہ بہت سی مسلم جماعتیں اور تحریکیں بھی یہ ذمہ داری ادا کر رہی ہیں۔ اصلاح، انداز، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم قرآن حکیم میں بہت سی جگہ آیا ہے لہٰذا اس کی شرعی حجیت متفق علیہ اور مستند ہے۔

بعض علماء نے تجدید و احیائے دین کے ثبوت کے لیے نبیؐ کی وہ حدیث بھی پیش کی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنُھَا "[1]

ترجمہ: بے شک اللہ ہر صدی کے سرے پر اس امت میں ایک ایسا شخص بھیجے گا جو دین کی تجدید کرے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظام تجدید و اصلاح صرف اسی ایک حدیث پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کی اساس قرآن و سنت کی بہت سی نصوص پر ہے۔ علاوہ ازیں یہ اسلام کے مزاج اور نوعیت کا بھی اقتضا ہے۔ جب اس دین کو تا قیامت رہنا ہے تو یقیناً امت میں ہمیشہ ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں گے، جو اس کے دینی فکر و عمل میں خرابیوں کے ازالے اور اسے اس کی اصل پر قائم رکھنے کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔ چنانچہ سنن ابوداؤد کی مذکورہ حدیث کی تشریح کے ضمن میں بعض علماء نے یہ تصریح کی ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ تجدید کرنے والا ایک ہی شخص ہو بلکہ یہ متعدد اشخاص بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ صدی کے سرے پر ہی آئے بلکہ وہ صدی کے وسط میں بھی آسکتا ہے[2]۔

---

1 سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب: مایذکر فی قرن المائۃ، مکتبہ دارالسلام ریاض، ۲۰۰۰ء، حدیث: ۴۲۹۱۔ صحیح

2 عون المعبود، شرح سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب: مایذکر فی قرن المائۃ، تحت حدیث ۴۲۹۱، نسخۃ الالیکترونیۃ

خلاصہ:

آج اسلام پر گرد و غبار اسی طرح پڑ چکے ہیں جس طرح وہ پچھلی امتوں کے دین پر پڑے تھے۔ اسلام کی تجدید کا کام سب سے پہلے ان آمیزشوں کو اس سے الگ کرنا ہے۔ خدا کے دین کو از سر نو زندہ کرنے کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کو انسانی گرد و غبار سے پاک نہ کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام نے مختلف انداز سے اپنی امت کو واضح تنبیہ کر دی تھی کہ وہ اس فتنہ سے بچیں۔ کتاب الٰہی کا کوئی حامل گروہ جب انتہا درجے کی سختی پر آجائے تو اس کو دوبارہ خشوع کی سطح پر لانے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ دین کو انسانی آمیزشوں سے پاک کیا جائے حقیقی دین داری انسانوں کے وضع کئے ہوئے دین سے نہیں بلکہ خدا اور سولؐ کے بتائے ہوئے دین سے آسکتی ہے۔

تجدید دین ایک لفظ میں دین کو انسانی اضافوں سے پاک کر کے اس کو ابتدائی ربانی صورت میں نمایاں کرنا ہے تاکہ انسان براہ راست خدا سے مربوط ہو جائے تاکہ خدا اور انسان کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ رہے۔

باب اول: عقائد اسلامیہ میں تجدید واحیاء کی جہتیں

فصل اول: اصلاح العقائد کا نبوی طریقہ کار

فصل دوم: عصر حاضر میں عقیدہ کے اصلاح طلب پہلو

فصل سوم: عقائد اسلامیہ کی تجدید کے اصول وطریقہ کار

فصل اول: اصلاح العقائد کا نبوی طریقہ کار

عرب کے اندرون ملک کے باشندوں پر خود مختاری نے بہت برا اثر ڈالا تھا۔ ان میں خود مختاری سے خود سری پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی شجاعت کا نشانہ اپنے ہی بھائیوں کو بنا رکھا تھا۔ بیکاری اور کاہلی نے جوا اور شراب کی عادت پیدا کر دی اور طبیعت ثانی بنا دی تھی۔ ممالک غیر سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ان کی زبان اور نسل بے شک کھری تھی لیکن فصاحت کا استعمال وہ زیادہ تر خود ستائی یا دوسری قوموں کی تحقیر میں کیا کرتے تھے یا اپنے فحش کاموں کو عیاں کرنے کے لئے زبانوں کی پوری قوت استعمال کر کے خود کے ساتھ اپنی معشوقہ کی بھی خوب پرچار کیا کرتے تھے، اور شرافت کا دعٰوی کرنے والے بڑی بہادری اور فخر سے اپنی بیٹیوں کو زندہ زمین میں دفن کیا کرتے تھے۔

جہالت نے ان میں بت پرستی رائج کر دی تھی اور بت پرستی نے انسانی دل و دماغ پر قابض ہو کر ان کو توہم پرست بنا دیا تھا۔ فطرت کی ہر ایک چیز پتھر، درخت، چاند، سورج، پہاڑ، دریا وغیرہ کو وہ اپنا معبود سمجھنے لگ گئے تھے اور اس طرح وہ اللہ کی عظمت و جلال کو فراموش کر دینے کے ساتھ ساتھ خود اپنی قدر و قیمت بھی بھول چکے تھے۔ اس لیے انسانی حقوق کے لئے نہ کوئی ضابطہ تھا اور نہ ایسے حقوق کو صحیح مرکز پر لانے کے لئے کوئی قانون تھا، انسانوں کا قتل، انسانوں کو لوٹنا، ناجائز خرچ، بے جا مداخلت سے عورتوں کو ذبردستی اغوا کرنا، زمین میں بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا اسی درخت کے پھل تھے کہ غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے انسان ان کے لیے قابل نفرت ہستی بنا تھا۔ برسوں بلکہ سینکڑوں سالوں کے جمے ہوئے گرد و غبار نے ان کے دلوں میں یہ نقش کر دیا تھا کہ ان کے حالات، ان کے تہذیب و تمدن اور ان کے دین سے افضل کچھ بھی نہیں ہو سکتا[1]۔

عرب کے مختلف اطراف میں مختلف حکومتوں اور سلطنتوں کے تعلق کی وجہ سے تمام ملک میں مختلف مذاہب اور بھی پائے جاتے تھے۔ یہودی، عیسائی، صابی ایسے مذاہب ہیں جن کے نام سن کر ناواقف شخص دھوکا کھا سکتا ہے کہ ان لوگوں میں ان مذاہب کی عمدگیوں کے نمونہ بھی پائے جاتے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہی لوگوں نے اپنے آپ کو مذہب سے درست کرنے کی بجائے مذہب اپنی وجہ سے خراب کر دیا تھا۔ اگر موسیٰؑ و عیسیٰؑ و شعیبؑ و صالحؑ کو توریت کے از بر لکھ دینے سے "ابن اللہ" کہا کرتے تھے مگر عرب کے یہودی اپنی قوم کے سب زن و مرد کو اللہ کے بیٹے، بیٹی پیارے، پیاری کہا کرتے تھے۔ آتش پرست بیٹی، بہن کو گھر میں ڈال لیا کرتے تھے مگر عرب کے ملحد اپنی حقیقی والدہ کو چھوڑ کر اپنے باپ کی تمام جوروں کو اپنی لونڈیاں بنا لیا کرتے تھے۔ ملحد اور دہریے بھی عرب میں آباد تھے۔ وہ حیات اور موت کو اتفاق اور وقت سے موسوم کر کے دنیا کے ہر انقلاب کو

---

1 قاضی محمد سلیمان منصورپوری، رحمت للعالمین، اشاعت ۲۰۰۷، ص: ۶۳

دور زمانہ سے منسوب کیا کرتے تھے۔ اللہ کی ہستی کا اقرار اور جزا و سزا کا تصور، نیک و بد افعال پر نیک و بد نتائج مرتب ہونا ان کے نزدیک قابل تسخیر خیال تھا۔ ان جملہ عیوب کی وجہ سے عرب گویا جملہ مذاہب باطلہ اور تخیلات کی برائیوں کا مجموعہ تھا[1]۔

قرآنی و نبوی طریقہ کار:

عرب میں جہالت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سے خرافات داخل ہوئے تھے، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے نبی ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔ ذیل میں ہم نبوی طریقہ کار کو تفصیلاً بیان کرتے ہیں:

1۔ مشرکانہ عقائد کی اصلاح:

شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص یا کسی شے کی تعظیم ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں سیدنا عیسیٰؑ، رام چندر کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے اللہ تعالیٰ بنا دیا اس بناء پر قرآن مجید میں نہایت پر زور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی۔

{يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ}[2]

ترجمہ: اے اہل کتاب اپنے دین میں حد پار نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہی کہو جو حق ہے مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہے۔

رسول اللہ ﷺ حاصل کون و مکاں تھے لیکن اس کے باوجود قرآن میں بار بار یہ تاکید آتی تھی۔

{قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ}[3]

ترجمہ: کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری جانب وحی بھیجی جاتی ہے، کہ تمہارا اللہ تعالیٰ ایک اللہ تعالیٰ ہے۔

جس قدر جلیل القدر انبیاء گذرے ہیں ان کے خاص لقب ہیں مثلاً سیدنا موسیٰؑ کلیم اللہ تھے، سیدنا ابراہیمؑ کا لقب خلیل اللہ تھا، سیدنا عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن رسول اللہ ﷺ اشرف الانبیاء تھے اس کے باوجود آپؐ نے اپنی ذات کے لیے صرف رسالت اور عبدیت جیسے الفاظ کا انتخاب کیا۔ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ یہ امتیازی وصف شامل کیا گیا۔ صرف رسالت اور عبدیت!

---

1 قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمت للعالمین، اشاعت ۲۰۰۷، ۱/ص: ۶۳

2 سورۃ النساء ۴ : ۱۷۱

3 سورۃ الکہف ۱۸ : ۱۱۰

"اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ"

میں گواہی دیتا ہوں، کہ محمدؐ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہے۔

اس میں عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے۔

"انْطَلَقْتُ فِي وَفْدِ بَنِي عَامِرٍ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا: أَنْتَ سَيِدُنا قَالَ: (السيدُ الله) قالُوا: وأفضَلُنا فَضْلا وأَعَظَمُنا طَوْلا، قال: (قُولُوا بِقَوْلِكُم ولا يَسْتَجْرِيَنَّكُم الشيطان)" [1]

ترجمہ: بنو عامر کا وفد نبی ﷺ کے پاس آیا ،تو لوگوں نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں آپ نے فرمایا سید اللہ تعالیٰ ہے ،لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں آپ نے فرمایا اچھا یہ کہو، لیکن دیکھو تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے۔

"أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا سَيِّدَنَا، وَابْنَ سَيِّدِنَا، وَيَا خَيْرَنَا، وَابْنَ خَيْرِنَا، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَاَيُّهَا النَّاسُ، قُولُوا بِقَوْلِكُمْ وَلَا يَسْتَهْوِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ، أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، وَرَسُولُ اللهِ، وَاللهِ، مَا أُحِبُّ أَنْ تَرْفَعُونِي فَوْقَ مَا رَفَعَنِي اللهُ"[2]

ترجمہ :ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ ﷺ کو مخاطب کیا اے ہمارے سردار! اور ہمارے سردار کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے بیٹے! آپ ﷺ نے فرمایا لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو شیطان تمہیں گرا نہ دے دیں۔ میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھ کو اللہ تعالیٰ نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔

یہاں یہ توجہ طلب ہے کہ نبیؐ کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں ہے مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ اللہ سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کی عاجزی اور جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا درکار ہے ،اس کا رخ دوسری طرف بدل جاتا ہے ،ہزاروں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین اسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں انہیں دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں انہیں کو حاجت روا جانتے ہیں، ہر جگہ انہیں کا نام لیتے ہیں، غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے انہیں معبودوں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء وصلحاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے اس بناء پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ

---

[1] محمد بن اسماعیل بخاری، الادب المفرد' باب: ہل یقول سیدی، مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع الریاض' ۱۹۹۸ء، حدیث: ۲۱۱

[2] احمد بن محمد بن حنبل' مسند احمد بن حنبل، مؤسسۃ الرسالۃ' ۲۰۰۱ "۲۱/ ۱۶۶' حدیث: ۱۳۵۲۹' صحیح

معبودین کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے اور صاف بتادیا جائے کہ اللہ کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کرسکتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا
{لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ}[1]

ترجمہ: میں آپ کے لیے مغفرت کی دوخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔
''قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي أَنْ أَسْتَغْفِرَ لِأُمِّي فَلَمْ يَأْذَنْ لِي، وَاسْتَأْذَنْتُهُ أَنْ أَزُورَ قَبْرَهَا فَأَذِنَ لِي ''[2]

ترجمہ: نبی ﷺ نے اپنی والدہ کی مغفرت کی درخواست کی تھی وہ نہیں قبول ہوئی، البتہ یہ درخواست ضرور قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کرلوں۔

شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود اللہ تعالیٰ نہیں ہیں، لیکن ان میں اللہ تعالیٰ کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیوں سرزد ہوتے ہیں جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتاؤں اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ تک پہنچادیتا ہے سیدنا عیسیٰؑ اسی بناپر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس سے بھی منہ نہیں پھیرا جاسکتا کہ پیغمبرانؑ سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوت میں ہے تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا۔ معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (اللہ تعالیٰ کی اجازت سے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

2۔حلت وحرمت کے اصول کی وضاحت:

شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ پیشویان مذہب کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کردیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرادیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت نازل ہوئی:
{اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ}[3]

ترجمہ: اوران لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنالیا ہے۔

---

[1] سورۃ الممتحنۃ ٦٠ : ٤

[2] مسلم نیشاپوری، صحیح مسلم، کتاب: الجنائز، باب: استئذان النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: 976، داراحیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن

[3] سورۃ التوبۃ ٩: ٣١

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ [1] جو کہ اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں'' عرض کیا کہ ''ہاں'' آپ ﷺ نے فرمایا ''یہی رب بنانا ہے''۔ [2]

اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے تھے لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بناء پر قرآن مجید میں ذات نبوی کی صفت رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

{وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ} [3]

ترجمہ: محمد ﷺ تو صرف ایک رسول ہیں اس سے پہلے اور رسول گذر چکے۔

شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات تھا لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے سجدۂ عبادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایان دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امراء کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا رسول اللہ ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنی اسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا اسی لیے سیدنا یوسف کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا سجدہ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا۔

''ایک دفعہ ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ، میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے اور وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دیں تو ہم بھی آپ کو سجدہ کریں، آپ ﷺ نے فرمایا، تو کیا میری قبر پر گذرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟ عرض کی کہ نہیں۔ فرمایا تو اب بھی نہ کرو، اگر میں کسی شخص کو سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کریں''۔ [4]

---

[1] عدی بن حاتم بن عبداللہ الطائی، مہاجری، جلیل القدر صحابی ہیں۔ ۷ ہجری یا ۹ ہجری کو اسلام قبول کیا۔ خطیب اور حاضر جواب شخصیت تھے۔ فتح عراق میں شریک تھے۔ ۶۸ھ مطابق ۶۸۷ کو وفات پائی۔

ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ۳ : ۱۰۵۷، دار الجیل بیروت، ۱۹۹۲ء۔۔۔ الاعلام، خیر الدین زرِکلی، ۴ : ۲۲۰، دار العلم للملایین، ۲۰۰۲

[2] محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، کتاب: تفسیر القرآن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب: ومن سورۃ التوبۃ (۱۰)، ۵ : ۲۷۸، مصطفی البابی الحلبی، ۱۹۷۵، حدیث: ۳۰۹۵، حسن

[3] سورۃ آل عمران ۳: ۱۴۴

[4] سنن ابی داؤد، کتاب النکاح (۱۲)، باب: حق الزوج علی المراۃ (۳۹) حدیث: ۲۱۴۰، صحیح۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو اوصاف ہیں وہ اوروں میں تسلیم کئے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشن گوئیاں کیا کرتے تھے عرب میں بھی کاہن یہ پیشہ کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں خود قرآن مجید میں کثرت سے اس کے متعلق آیات نازل ہوئی :{ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ }[1]

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے پاس غیب کی چابیاں ہیں جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

کائنات میں اللہ کے علاوہ جن غیبی اسباب وعلل اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی نذر چڑھائی جاتی تھی قربانی کی جاتی تھی رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمام دوسری مخفی وپوشیدہ قوتوں کا ڈر انسان کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا اور دعا وکلمات الٰہی کے سوا ہر نوع کے جھاڑ پھونک، منتر وغیرہ جن میں کسی غیر اللہ تعالیٰ سے غیبی استعداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پائے اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

{اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ}[2]

ترجمہ: اے عالم کے پروردگار ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

3۔اوہام وخرافات کا ابطال:

وہ تمام اوہام وخرافات جن سے شرک پرست اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات موثر اور متصرف سمجھتے تھے رسول اللہ ﷺ ان نے انکا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمادیا کہ ان کی کوئی اصل نہیں نبی ﷺ نے فرمایا:

”لَا عَدْوَى، وَلَا طِيَرَةَ، وَلَا صَفَرَ، وَلَا هَامَّةَ“[3]

ترجمہ: نہ چھوت ہے نہ بدفالی ہے نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔

ایک اور صحابی نے بیان فرمایا:

"الْعِيَافَةُ، وَالطِّيَرَةُ، وَالطَّرْقُ مِنَ الجِبْتِ"[1]

---

[1]سورۃالانعام ٦ :٥٩

[2]سورۃالفاتحۃ ١ : ٤

[3]سنن ابی داؤد، کتاب: الطب، باب: فی الطیرۃ (٢٤)، حدیث: ٣٩١١ ، صحیح۔

ترجمہ: پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا، اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

"نچھتر" (نو) کچھ نہیں[2] یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپؐ نے ایک لفظ سے باطل کر دیا فرمایا: "لَا غُولَ"[3]

ترجمہ: غول بیابانی کچھ نہیں۔

اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، نبی ﷺ نے انکا استیصال فرمایا، نبی ﷺ نے ان تمام اوہام کو تصریح اور تعین کے ساتھ باطل قرار دیا۔ مثلاً:

1۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند یا سورج گرہن لگتا ہے، سیدنا ابرہیم آپؐ کا بیٹا جب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تو سورج میں گرہن لگا ہوا تھا لوگوں نے گمان کیا کہ انہی کے مرنے کا اثر ہے، نبی ﷺ نے جب یہ بات سنی تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگ جاتا[4]۔

2۔ یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

3۔ ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف رکھے تھے ایک ستارہ ٹوٹا آپؐ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے[5]۔

4۔ شیر خوار بچوں کے سرہانے استراء (چھری) رکھ دیا کرتے تھے کہ جنات ان کو نہ ستانے پائے۔ ایک دفعہ سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ نبی ﷺ ان باتوں کو ناپسند کیا کرتے تھے[6]۔

5۔ نظر بد سے بچنے کے لئے اونٹوں کے گلے میں قلاوہ لٹکاتے تھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلاوہ نہ رہنے پائے۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب: الطب، باب: فی الخط وزجر الطیر (۲۳)، حدیث: ۳۹۰۷، ضعیف۔

[2] سنن ابی داؤد، کتاب: الطب، باب: فی الطیرۃ (۲۴)، حدیث: ۳۹۱۲، صحیح

[3] سنن ابی داؤد، کتاب: الطب، باب: فی الطیرۃ (۲۴)، حدیث: ۳۹۱۳، حسن صحیح

[4] صحیح مسلم، کتاب: الکسوف (۱۰)، باب: ما عرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صلاۃ الکسوف (۳)، حدیث: ۹۰۴

[5] صحیح مسلم، کتاب: الطب (۱۲)، باب: تحریم الکہانۃ واتیان الکہان (۳۵)، حدیث: ۲۲۲۹

[6] بخاری، الادب المفرد، باب الطیرۃ من الجن، صفحہ: ۳۱۴، دار البشائر الاسلامیۃ، ۱۹۸۹ء، حدیث: ۹۱۲، ضعیف

4۔اصلاح العقائد کے صحیح تصور کی وضاحت:

شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ لئے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی درباری سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے درباری سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے بھی خوش رکھنے کی ضرورت کے معتقد تھے چنانچہ وہ اپنے بتوں دیوتاؤں اور فرشتوں کو اس نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے۔:

{هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ}[1]

ترجمہ: یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

{مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى}[2]

ترجمہ: ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا اللہ تعالیٰ کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیارے اور محبوب ہیں اس لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو ان کے خاندان کے بزرگ جو اللہ تعالیٰ کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے ان کو دعوی تھا کہ:

{نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُه}[3]

ترجمہ: ہم اللہ تعالیٰ کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔

قرآن میں ارشاد ہے:

{بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ }[4]

---

[1] سورۃ یونس ۱۰ : ۱۸

[2] سورۃ الزمر ۳۹ :۳

[3] سورۃ المائدۃ ۵ : ۱۸

[4] سورۃ المائدۃ ۵: ۱۸

ترجمہ: بلکہ تم بھی اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو یہ اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔

اور اسی بناء پر ان کا دعٰوی تھا:

{لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ}[1]

ترجمہ: ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔

{لَّا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا}[2]

ترجمہ: یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن جس نے رحم والے اللہ تعالیٰ سے اقرار لے لیا۔

5۔اجرام سماوی کی قدرت کا انکار:

اس دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہے اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

{لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَهُنَّ}[3]

ترجمہ: اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی موثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

{وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ}[4]

ترجمہ: ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ''فلک کج رفتار'' اور ''دہر ناہنجار'' کی شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے، اور زمانے کو برا کہتے تھے[5]۔ نبی ﷺ نے اس سے منع کیا اور ارشاد فرمایا کہ ''زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود اللہ تعالیٰ ہے''[6]۔

اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں[1]۔

---

[1] سورۃ آل عمران ۳: ۲۴

[2] سورۃ مریم ۱۹: ۸۷

[3] سورۃ فصلت ۴۱: ۳۷

[4] سورۃ الجاثیۃ ۴۵: ۲۴

[5] ابن حجر عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح بخاری، ۸: ۴۴۱ ۔۔۔کتاب الاسماء والصفات، بیہقی، صفحہ: ۱۱۵، طباعت: الہ آباد، س۔ن

[6] صحیح مسلم، کتاب: الالفاظ من الادب وغیرھا (۴۰)، باب: النھی عن سب الدھر (۱)، حدیث: ۲۲۴۶

یعنی جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق زمانہ کو سمجھ کر لوگ اس کو برا کہتے ہیں حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے اس لیے یہ گالی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو ہی دی جاتی ہے۔

6۔ غیر اللہ کی قسم سے روکنا:

شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں جس کی قسم کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھیں قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، نبی ﷺ نے اس چیز سے منع فرمایا[2]۔

لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ دے۔ یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا اس بھی آپؐ نے منع فرمایا۔ ایک دفعہ سیدنا عمرؓ کو آپؐ نے باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم نہ کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو یا تو اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے فرمان کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی[3]۔

نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، اس میں نہ صرف بد عقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، نبی ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف اللہ کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے تمام مشیتیں اور خواہش اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی منشا کے ساتھ اوروں کی منشا کو بھی شریک کر لیا تھا، نبی ﷺ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جابجا اس حقیقت کی وضاحت کی کہ مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اسکی تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو اللہ چاہے اور جو

---

[1] صحیح مسلم، کتاب: الالفاظ من الادب وغیرھا (۴۰)، باب: النھی عن سب الدھر (۱)، حدیث: ۲۲۴۶ [۵۸۶۶]

[2] سنن نسائی، احمد بن شعیب، کتاب: الایمان والنذور (۳۵)، باب: الحلف باللات والعزیٰ (۱۲)، حدیث: ۳۸۰۷، دار السلام ریاض، ۲۰۰۹، یونس بن ابی الخلق کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے (تفصیل کے لیے تہذیب الکمال ملاحظہ ہو)

[3] صحیح بخاری، کتاب: الاَیمان والنذور (۸۳)، باب: لا یحلف باللات والعزیٰ ولا بالطواغیت (۵)، حدیث: ۶۶۵۰۔۔۔ سنن نسائی، کتاب الایمان والنذور (۳۵)، باب: الحلف بالآباء (۵)، حدیث: ۳۷۹۹۔۔۔۳۸۰۷

رسولؐ چاہیں، نبی ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، حتٰی کہ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا۔

سنن نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمت نبوی ﷺ میں آکر مسلمانوں سے کہا" تم لوگ شرک کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ چاہے اور جو محمدؐ چاہیں"" آپؐ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یوں کہو کہ "وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں"[1]

7۔ مشتبہات شرک کی ممانعت:

جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا، ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً عبد الشمس، عبد مناف۔ ان ناموں سے سخت منع فرمایا اور فرمایا کہ بہترین نام عبداللہ اور عبد الرحمٰن ہیں[2]۔ اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ نام اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے[3]۔

شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں سالانہ مجمع کرتے ہیں۔ دور دور سے سفر کرتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، رسول اللہؐ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا[4]۔ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود اور نصٰریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔

یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھی جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا، لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب و روح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے کوئی طلب کے لئے کام کرتا ہے کوئی دنیاوی معاوضہ کے لئے کرتا ہے ان تمام کاموں کا محرک در حقیقت غیر اللہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی جگہ لے لی ہے "اسی لیے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

{اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ}[5]

---

[1] سنن نسائی، کتاب: الایمان والنذور، باب: الحلف بالکعبۃ (۹)، حدیث: ۳۸۰۴، یہ حدیث صحیح ہے۔

[2] الادب المفرد، امام بخاری، باب: احب الاسماء الی اللہ عز و جل (۳۵۶)، حدیث: ۸۱۴

[3] صحیح بخاری، کتاب: الادب (۷۸)، باب: ابغض الاسماء الی اللہ (۱۱۴)، حدیث: ۶۲۰۲

[4] صحیح بخاری، کتاب: الجنائز (۲۳)، باب: مایکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور (۶۱)، حدیث: ۱۳۳۰

[5] سورۃ الفرقان ۲۵ : ۴۳

ترجمہ: کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا خدا اپنی خواہشات نفسانی کو بنا رکھا ہے۔

"قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الشِّرْكُ الْخَفِيُّ أَنْ يَعْمَلَ الرَّجُلُ لِمَكَانِ الرَّجُلِ"[1]

ترجمہ: نبی ﷺ نے فرمایا: چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب کرے۔

نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے دکھاوے کی نماز پڑھ لی اس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا[2]۔ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ "مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے" صحابہؓ نے عرض کی "یارسول اللہ! شرک اصغر کیا ہے؟" فرمایا "ریا" قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا اللہ تعالیٰ ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے ہاں کچھ نہیں تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے[3]۔

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے۔

ان تعلیمات کے نتائج:

قرآن میں پیغمبر اسلامؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ یہ کتاب ہم نے تمہارے اوپر اس لیے اتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاؤ۔

{كِتَابٌ اَنزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ}[4]

انسانوں کو تاریکی سے نکال کر کر روشنی میں لانے کا یہی کام تمام پیغمبروں کے سپرد ہوا تھا تاہم پیغمبر اسلام کی ایک خاصیت یہ ہے کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ آپ صرف پیغام پہنچا کر انسانیت کو اس کے حال پر نہ چھوڑ دیں بلکہ اقدام کر کے ان کی حالت کو عملاً بدل ڈالیں۔ اس عملی اقدام کو کامیاب بنانے کے لیے جو ضروری اسباب درکار تھے، وہ سب اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مہیا فرمائے۔ نیز ضمانت بھی دے دی کہ دنیوی اسباب کی ہر کمی فرشتوں کی خصوصی مدد سے پوری کی جائے گی۔

یہ بات حدیث میں مختلف انداز سے بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللَّهُ بِي الكُفْرَ"[5]

ترجمہ: میں مٹانے والا ہوں جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا۔

---

[1] ابو عبداللہ حاکم، مستدرک علی الصحیحین، کتاب: الرقاق، ۴: ۳۶۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰ء، حدیث: ۷۹۳۶

[2] مستدرک علی الصحیحین، کتاب: الرقاق، ۴: ۳۶۵، حدیث: ۷۹۳۸

[3] مسند احمد، ۶: ۴۳۳، حدیث: ۶۹۸۶، اس کے اسناد صحیح اور شیخین کے شرط پر ہیں

[4] سورۃ ابراہیم ۱۴: ۱

[5] صحیح بخاری، کتاب: المناقب (۶۱)، باب: ماجاء فی اسماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱۷)، حدیث: ۳۵۳۲

گویا پیغمبر اسلامؐ صرف داعی نہ تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ماحی (شرک وکفر مٹانے والے) بھی تھے۔ وہ پکارنے والے بھی تھے اور عملاً لوگوں کو پکار کو ماننے پر مجبور کرنے والے بھی۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کے مشن کی تکمیل کے لیے صالح انسانوں کے علاوہ اللہ اور فرشتے تک اس کے مددگار ہیں۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ کو جو دنیا دور ظہور میں لانا تھا۔ اس کا ظہور ممکن ہو سکے[1]۔

اب حضور ﷺ کی رسالت پائہ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ جاہلیت و بربریت میں ڈوبی ہوئی ایک قوم میں ایک نبی مبعوث ہوا تھا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا تھا، انھیں بری باتوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے، ان لوگوں کو جو اس وقت تاریکی میں تھے، اس نے انہیں ذلت، خونخواری اور وہم پرستی میں غرق پایا اور ان کے دلوں میں ایک سچے اور محبت کرنے والے والے خدائے واحد پر ایمان پیدا کیا۔ اس نے انہیں متفرق ومنتشر اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل میں مصروف پایا، اور انہیں اخوت کے رشتے میں بدل دیا۔ قدیم الایام سے جزیرہ نمائے عرب پر مکمل اخلاقی ظلمت طاری تھی، روحانیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا، نہ یہودیت اور نہ عیسائیت عربوں کے دل ودماغ پر کوئی دیرپا نقوش ثبت کر سکی تھی۔ عرب توہم پرستی، جفا پیشگی اور بدکاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محرمات سے نکاح اور بیٹیوں کو قتل کرنے کا شیطانی دستور عام تھا۔ سب سے بڑا بیٹا باپ کی دوسری جائیداد کے ساتھ اس کی بیواؤں کو بھی ورثہ میں پاتا تھا انسانیت سے گرے ہوئے باپ اپنی نوزائیدہ بچیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے، اور یہ جرم، جو قبائل قریش کے سمجھا جاتا تھا۔ حیات بعد الممات اور نیکی وبدی کی جزا و سزا کا تصور انسانی عمل کے محرکات کی حیثیت سے مفقود تھا۔ یہ تھی عرب کی حالت چند سال پیشتر۔ ان چند سالوں میں کیسی زبردست تبدیلی ہوئی تھی، یقیناً فرشتہ سماوی اس زمین کے اوپر سے گزر گیا تھا اور ان لوگوں کے دلوں میں جو نیم بربریت کی کراہت انگیز رسموں میں مبتلا تھے، ہم آہنگی اور محبت کی روح پھونک گیا تھا۔ وہی سرزمین جو کسی زمانہ میں اخلاقی نقطہ نگاہ سے ایک لق ودق بیابان تھی، جہاں خدا اور انسان کے تمام قوانین کی خلاف ورزی کی جاتی تھی، اب تمدن وشائستگی کا گلستان بن گئی تھی۔ بت پرستی اب اپنی بے شمار قباحتوں کے ساتھ نیست ونابود ہو چکی تھی۔ نبی ﷺ اس نئی بیداری کا مصدر ومنبع تھے، یعنی ان لوگوں کی حیات ابدی کی امیدوں کا سرچشمہ اور وہ اس سرچشمے سے سیراب ہونے کے متمنی تھے۔ اب ان کی صرف ایک ہی آرزو تھی وہ یہ کہ خلوص اور پاکیزگی سے اللہ کی بندگی کریں اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کے احکام بجالائیں۔ وہ حقائق، وہ نکات حکمت وہ نصائح واحکام جن کے ذریعے گزشتہ بیس سالوں میں رسول اللہ ﷺ وقتاً فوقتاً اپنے پیروؤں کو ہدایت کرتے رہے تھے، سب ان کے دلوں پر نقش ہو چکے تھے اور ان کا لائحہ عمل بن چکے تھے۔ قانون اور اخلاق متحد ہو چکے تھے، اس زمانے سے لے کر جب ابتدائی عیسائیت نے سوئی ہوئی دنیا کو یکدم بیدار کر دیا اور کفر کے خلاف ایک ہلاکت آفریں لڑائی لڑی گئی، روحانی زندگی کی ایسی

---

1 مولانا وحید الدین خان، اسلام دور جدید کا خالق، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، ۲۰۲۰، ص ۱۲۔۱۴

بیداری دیکھنے میں نہ آئی تھی، یعنی ایسا ایمان جو اف کئے بغیر قربانیاں برداشت کرتا تھا اور ضمیر کی خاطر دنیوی مال کی بربادی قبول کرتا تھا۔

اب نبی ﷺ کا فریضہ رسالت تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ یہ امر کہ آپؐ کا تمام کام آپؐ کی زندگی ہی میں مکمل ہو گیا، آپؐ کو دوسرے زمانوں اور ملکوں کے پیغمبروں، حکیموں اور فلسفیوں پر ایک امتیازی فوقیت بخشتا ہے۔ نبی ﷺ کے لیے خاص طور پر مقدر تھا کہ آپؐ نہ صرف اپنی رسالت اپنے ساتھ بیشتر نبیوں کی رسالت کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچائیں۔ یہ صرف آپؐ ہی کی قسمت میں تھا کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کا کام ختم کر کے جائیں۔

وہ مبلغ جو ابھی اگلے دن اپنے مولد سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور جسے اس جگہ سے جہاں وہ خدا کا پیغام سنانے گیا تھا پتھر مار کر نکال دیا گیا تھا، نو سال کی قلیل مدت میں اپنی قوم کو اخلاقی اور روحانی ذلت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر پاکیزگی اور انصاف کی بلندیوں پر پہنچا گیا۔

آپؐ کی زندگی ایک گراں قدر کام کے بعنوان احسن انجام دینے کی بہترین سرگزشت ہے۔ آپؐ نے ایک مردہ اور افسردہ قوم میں زندگی کی روح پھونک دی۔ آپؐ نے قبیلوں کے مجموعہ متفرقات کو وحدت بخش کر ایک ایسی قوم بنا دیا جو ایک دوسرے کے لیے جان دینے تک تیار تھے۔ یہ تھا آپؐ کا کارنامہ اور آپؐ نے اسے ایک ایسے ذوق و شوق اور جوش و خروش سے انجام دیا جو مخالف قوتوں سے کسی قسم کی مصالحت قبول نہیں کرتا تھا اور جس کے لیے کسی ایک مقام پر پہنچ کر ساکن ہو جانا بعید از قصور تھا۔ ایک ایسی ہمت مردانہ سے انجام دیا جو کسی قسم کی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خوف نتائج سے بالکل بری تھی، ایک ایسی وحدت مقصد سے انجام دیا جس میں اپنی ذات کے خیال کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

فصل دوم: عصر حاضر میں عقیدہ کے اصلاح طلب پہلو

قرآن مجید میں جگہ جگہ انتہائی تاکید کے ساتھ بنی نوع انسان کو عقیدہ توحید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور شرک اور بت پرستی سے منع کیا گیا ہے اور جھوٹے خداؤں کو خدائے لاشریک کے ساتھ شریک قرار دینے کی سختی سے مذمت ہوئی ہے بلکہ ایسا کرنے والوں کے لیے شدید ترین عذاب کی وعید بھی دی گئی ہے، لہذ بنی نوع انسان پر لازم وملزوم ہے کہ وہ اللہ تعالی کی وحدانیت کا اقرار کرے تاکہ وہ اپنی دنیوی اور اخروی زندگی میں اس عقیدے کے صحیح مثبت اثرات سے مستفید ہو سکے اور انکارِ توحید کے منفی اور برے اثرات سے دنیا و آخرت میں محفوظ رہ سکے۔

عقیدہ توحید کے مختلف پہلو ہیں جن میں سے ہر پہلو پر ایمان اور یقین سے انسانی طرزِ زندگی پر مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں، لہٰذا انسانی زندگی کو قرآنی سانچے میں ڈھالنے اور قرآنی طرزِ زندگی پر مشتمل انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ عقیدہ توحید کے انسانی زندگی پر اثرات کو اجاگر کیا جائے۔

عقیدہ کا سب سے پہلا پہلو عقیدہ توحید ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیا جائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دوٹوک فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا ہے:

{وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ}[1]

ترجمہ: اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

{ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ }[2]

ترجمہ: میں ہی اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، پس صرف میری بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

ان ہر دو آیات میں توحید فی العبادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ہر قسم عبادت و تذلل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے بجالانا فطرت اور شریعت کے عین مطابق ہے۔

تیسری جگہ ارشاد فرمایا:

{ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ }[3]

ترجمہ: اور تیرا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، اس رحمن و رحیم کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں۔

---

1 سورة الاسراء ١٧: ٢٣

2 سورة طٰہٰ ٢٠: ١٤

3 سورة البقرہ ٢: ١٦٣

چوتھی جگہ ارشاد فرمایا:

{اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ}[1]

ترجمہ: کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، میں اللہ کی طرف سے تمہیں تنبیہ کرنے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔

پانچویں جگہ ارشاد فرمایا:

{ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ}[2]

ترجمہ: کہہ دیجیے: میرے پاس وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم تسلیم کرتے ہو؟

یعنی عبادت ہو گی تو صرف اللہ ہی کی ہو گی، اس کے ساتھ کسی کو حتی ملائکہ، انبیائے کرام، اولیائے الٰہی، ائمہ طاہرین وغیرہ کو بھی اس کی عبادت میں شریک قرار نہیں دیا جا سکتا، ایسا کرنا شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کلمہ طیبہ میں بھی اسی حقیقت کی گواہی دیتے ہیں جیسے: لا الہ الا اللہ، یعنی کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ اور اکثر یہی شہادت دیتے ہیں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللہ کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

عبادت اور پرستش انسان کی طبیعت میں شامل ہے یہی سبب ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے افراد بھی گزرے ہیں، جو اسی فطری جذبے کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی کے سامنے جھکتے اور اس کی پرستش کرتے رہے ہیں۔ انسانی وجود کے اندر پوشیدہ اسی فطری جذبے ہی کی وجہ سے انسان چاند، ستارے، سورج، آگ، پتھر، درخت، حتی اپنے جیسے انسانوں اور دیگر مختلف اشیاء کی پرستش اور عبادت کرتے آئے ہیں۔ اور اس طرح اپنے وجود کے اندر پوشیدہ پرستش اور عبادت کی تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں البتہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے حقیقی معبود یعنی اللہ تعالی کے سامنے جھکنے کے بجائے متعدد جھوٹے خداؤں کے سامنے جھکتے رہے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے فرضی اور جھوٹے معبود ہیں۔ حقیقی معبود اور لائقِ پرستش ذات تو صرف اللہ تعالی کی ہی ہے، اسی لیے انبیائے کرامؑ لوگوں کو جھوٹے معبودوں کی پرستش سے روک کر حقیقی معبود یعنی اللہ تعالی کی پرستش کی دعوت دیتے تھے، اور قرآن کریم میں بھی جا بجا اللہ تعالی کے حقیقی معبود ہونے کو مختلف آیتوں میں بیان کر دیا گیا ہے، اور یہی انسانی عظمت کا تقاضا بھی ہے کہ وہ صرف معبودِ برحق کے سامنے جھکے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو کرامت عطا فرمایا ہے جیسے اللہ کا ارشاد ہے:

{وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا}[3]

ترجمہ: "اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور خشکی اور دریا میں اسے سوار کیا اور ہم نے انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا

---

1 سورۃ ہود ۱۱: ۲

2 سورۃ الانبیاء ۲۱: ۱۰۸

3 سورۃ الاسراء ۱۷: ۷۰

اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت عطا کی۔''

یہاں اللہ تعالی نے انسان کے صاحبِ کرامت ہونے اور باقی مخلوقات پر اس کی برتری اور فضیلت کا تذکرہ فرمایا ہے، لہذا انسان کی عظمت اور فضیلت کا تحفظ اسی میں ہے کہ وہ اپنے سے پست تر چیزوں کے سامنے نہ جھکے۔ دوسری جگہ اللہ نے فرمایا:

{لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ}[1]

ترجمہ: یقیناً ہم نے انسان کو بہتر صورت میں پیدا کیا۔

لہذا بنی نوع انسان کے لیے یہ باعثِ شرم ہے، کہ وہ افضل خلق کیے جانے کے باوجود اللہ کو چھوڑ کر اپنے سے پست تر اور حقیر چیزوں کے سامنے جھکے اور پھر انہیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک قرار دے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ نے بھی اپنی قوم بنی اسرائیل کی جانب سے عبادت کے لئے بت نما معبود بنائے جانے کے غیر منصفانہ، جاہلانہ اور عظمت انسانی کی بے توقیری پر مشتمل ناحق مطالبے کے جواب میں انہیں اپنی عظمت اور فضیلت یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

{قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰـهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ}[2]

ترجمہ: موسی نے کہا! کیا میں تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود تلاش کروں؟ حالانکہ اس نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی ہے۔

یعنی اللہ تعالی کے سوا کسی دوسرے مخلوق کو الٰہ بنانا نری جہالت اور حماقت ہے۔ جب اس نے انسان کو فضیلت کا مرتبہ دیا تو انسان کیوں نا اپنے رب کا شکریہ ادا کرے بہ جائے اس کے کہ وہ ناشکری کر کے شریک کا ارتکاب کر بیٹھے۔

اسی طرح جب اللہ تعالی نے ملائکوں کو حکم دیا، کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کریں تو اس سے بھی انسان کی عظمت اور فضیلت واضح ہو جاتی ہے چونکہ یہاں اللہ نے انسان کو مسجود ملائکہ بنادیا۔ جیسے قرآن میں ہے:

{وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ}[3]

ترجمہ: '' اور اس وقت جب ہم نے ملائکوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ تمام ملائکوں نے سجدہ کیا، اس نے تکبر اور انکار کیا اور وہ انکار کرنے والوں میں سے ہو گیا۔''

لہذا قرآنی آیات کے مطابق جب انسان کی عظمت اور کرامت مسلم ہے تو اسے اپنی عظمت اور کرامت کا لحاظ رکھتے ہوئے جھوٹے معبودوں کے سامنے جھکنے سے بچتے ہوئے صرف معبود حقیقی کے سامنے جھکنا چاہیے۔

---

1 سورۃالتین ۹۵ : ۴

2 سورۃالاعراف ۷: ۱۴۰

3 سورۃالبقرۃ۲: ۳۴

اللہ تعالی کو لائقِ عبادت سمجھ کر صرف اسی کے سامنے جھکنے کے اخروی فوائد تو اپنی جگہ مسلم ہیں ہی، اس عقیدے کے آثار اور فوائد اس دنیا میں بھی بے شمار ہیں۔ اس سے اللہ تعالی نے انسان کو جو مقام اور مرتبہ عطا فرمایا ہے اس کا تحفظ ہوتا ہے، چونکہ جو اللہ کے سامنے جھکے اسے ہر ایک کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ لوگ جو اللہ کے سامنے نہیں جھکتے انہیں ہر کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت پیش آتی ہے، کبھی وہ کسی کے سامنے جھک رہے ہوتے ہیں تو کبھی کسی اور کے سامنے جھک رہے ہوتے ہیں حتی کہ کبھی کبھی تو اپنے سے پست تر اور حقیر تر چیزوں کے سامنے بھی انہیں جھکنا پڑتا ہے، لیکن جو خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے جھک جائے تو وہ باقی لوگوں اور چیزوں کے سامنے جھکنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

عقیدہ رسالت:

عقیدہ رسالت اسلام کا دوسرا بہت اہم اور بنیادی عقیدہ ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے ہر قوم اور ہر زمانے میں اپنی جانب سے پیغمبر بھیجے ہیں جو انسانوں کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامات لے کر آتے رہے ہیں۔ نبوت کی یہ کڑی حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور حضرت محمدؐ پر اس کا اختتام ہوا۔ آپؐ نے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دیا اور اپنی امت کو بہتر انداز میں نصیحت کی۔ تمام پیغمبران اسی وجہ سے اس دنیا میں آئے کہ اللہ کے دین کو غالب کردے اور لوگوں پر حجت نہ رہے کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری کس طریقے سے کرنی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

{رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا}[1]

ترجمہ: (ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ ان لوگوں کا اللہ پر پیغمبروں کے بعد الزام نہ رہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

جن لوگوں کو رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی، ان کو اللہ کی جانب سے بہت زیادہ علم، مثبت سوچ، فیصلہ کرنے کی طاقت اور گہری بصیرت عطا کی گئی، اس لیے ایک نبی اور فلسفی میں یہ فرق ہے کہ فلسفی اپنی عقل اور سوچ کی بنیاد پر بات کرتا ہے جبکہ انبیاء کرام اللہ کی جانب وحی کی بنیاد پر بات کرتے ہیں۔ انہوں نے دلیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے دعوت پیش کی۔ تمام انبیاء کرامؑ انسان تھے، مگر تمام مخلوقات اور تمام انسانوں میں سب سے افضل تھے۔ جب تک تمام انبیاء کرامؑ پر یقین نہ رکھا جائے کوئی بھی بندہ کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا۔ انبیاء کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے جس کی وجہ سے ہمیں اللہ کے احکامات پہنچتے ہیں۔ کوئی اطاعت اللہ اور رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے۔ نبی ﷺ کی پیروی سے منہ موڑنا، اللہ کی اطاعت سے بغاوت ہے۔

---

1 سورۃ النساء ۴ : ۱۶۵

انبیاء کرامؑ اس دنیا کے تمام قوموں میں آئے اور تمام انبیاء کرامؑ نے لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی، اور اسی تعلیم کی نصیحت کرنے کے لیے سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اس حوالے سے سب پیغمبر ایک جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے: {وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ}[1]

ترجمہ : ''اور یقیناً ہم نے ہر رسول کو یہ پیغام دے کرامت کی طرف بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور شیطان سے بچو''۔

ایک مسلمان اور مومن کے لیے اپنی ذات کی معرفت اتنی ضروری نہیں جتنی کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کی معرفت ضروری ہے، کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اللہ پر ایمان کے ساتھ رسالت پر ایمان کو تکمیل ایمان کی شرط کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِه وَالنُّوْرِ الَّذِی اَنْزَلْنَا}[2]

ترجمہ: ''تو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اس قرآن پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔''

نبی ﷺ کی اطاعت تمام انسانوں پر بالعموم اور ایمان والوں پر بالخصوص فرض ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ}[3]

ترجمہ: اے لوگو! تمہارے پاس رسول آچکا تمہارے رب کی طرف سے ٹھیک بات لے کر پس مان لو تا کہ تمہارا بھلا ہو۔

خود آپؐ نے ارشاد فرمایا ''ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے اور میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں''

ان آیات اور احادیث سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آپ صرف اپنے ملک، اپنے زمانے اور اپنی قوم کے لیے ہی نہیں بلکہ آپ قیامت تک پوری نوع انسانی کے لیے رسول مبعوث فرمائے گئے۔

لہذا رسالت پر ایمان لانے میں یہ داخل ہے کہ آپ کو انسانیت کی طرف اللہ کا آخری رسول مانا جائے، اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ رسول جو کچھ بتائے وہ حق ہے جو کچھ کہے وہ سچ اور جو عمل کرے وہ قابل اتباع ہے۔ ان کی بتائی ہوئی تمام باتوں پر عمل کرنا فرض ہے، خواہ ان باتوں کا تعلق عبادت و معاملات، تہذیب و معاشرت، اخلاق و کردار یا زندگی کے کسی بھی شعبہ سے ہو، اس لیے کہ یہی اسوہ کامل ہے۔ آپ کا ارشاد ہے ''میری ساری کی ساری امت جنت میں داخل ہو گی، سوائے اس شخص کے، جس نے انکار کیا۔ پوچھا گیا: انکار کا کیا مطلب ہے، آپ نے فرمایا: جو میری اطاعت کرے گا۔ وہ جنت میں داخل ہو گا۔ جو نافرمانی کرے گا، وہ انکار کرے گا[4]۔''

---

1 سورۃ النحل ۱۶ : ۳۶

2 سورۃ التغابن ۶۴ : ۸

3 سورۃ النساء ۴ : ۱۷۰

4 صحیح البخاری، حدیث: ۷۲۸۰

اطاعت کا مطلب اتباع ہے، ہر وہ عمل جو آپ کے قول و فعل اور تقریر سے صحیح طور ثابت ہو، وہ سنت ہے جس کی اتباع ضروری ہے۔اسی اتباع کا نام اطاعت ہے۔اللہ کا ارشاد ہے:

{وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ،وَمَانَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا}[1]

ترجمہ: اور جو کچھ بھی تم کو پیغمبر ﷺ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اسی سے باز رہو۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

{وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَه وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ }[2]

ترجمہ: " اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں نہ لڑو ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور آپ کا رعب و دبدبہ جاتا رہے گا، اور صبر رکھو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی میں ہمارا امن اور ہماری وحدت ہے۔ جو کوئی اس اطاعت سے منحرف ہوا، گویا وہ غیر فطری راہوں پر چل نکلا۔ جس کے لیے نہ دنیا میں کوئی کامیابی ہے اور نہ آخرت میں کوئی کامیابی ہے۔

منصب رسالت سے متعلق بعض بنیادی غلط فہمیاں:

رسول اللہ ﷺ کے منصب رسالت کی حیثیت اور آپ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کے بارے میں بعض لوگوں میں جو بعض غلط تصورات پیدا ہو چکے ہیں، چند غلط فہمیوں کی تفصیل درج ذیل ہیں:

منصب رسالت کی تنقیص کرنے والا گروہ:

بعض اہل باطل لوگوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا کام بس یہ تھا، کہ اللہ تعالی نے جو کتاب اپنے بندوں پر نازل فرمانی چاہی وہ آپ نے ان کو پہنچادی، اس کے بعد آپ کا کام ختم ہو گیا۔ وہ اپنے اسی تصور کے لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت متعین کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ منصب رسالت کا اس قدر حقیر تصور رکھتے ہوں، ان کے لئے معرفت الہی کے نقطہ نظر سے رسول اللہ ﷺ کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی اور جب آپ کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی تو آپؐ کی ذات کے ساتھ کسی غیر معمولی وابستگی کے لئے بھی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جب اصلی کام آپ کا صرف خط کا پہنچادینا تھا اور آپ خط پہنچا چکے تو اس کے بعد اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ اصل خط کی ہے یا زیادہ سے زیادہ کاتب کی، نہ کہ خط کے لانے والے قاصد کی ہے، اس کے بعد تو اگر قاصد سرے سے درمیان سے غائب بھی ہو جائے، جب بھی ان حضرات کے نقطہ نظر سے کوئی خلا نہیں واقع ہونا چاہیے۔

---

1 سورۃ الحشر ۵۹ : ۷

2 سورہ انفال ۸ : ۴۶

رسالت کا یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ نبی، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان صرف ایک قاصد ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک معلم بھی ہوتا ہے، ایک مزکی (تزکیہ و تربیت کرنے والا) بھی ہوتا ہے، ایک مرشد بھی ہوتا ہے، ایک مبین (وضاحت کرنے والا) بھی ہوتا ہے اور ایک مبشر بشارت دینے والا بھی ہوتا ہے، ایک منذر (خبردار کرنے والا) بھی ہوتا ہے، ایک سراج منیر (ہدایت کا چراغ) بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک واجب الاطاعت ہادی بھی ہوتا ہے اور پھر اپنی ان تمام خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ارشاد و ہدایت کے فرائض کے سلسلہ میں براہ راست خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ جس کے سبب سے وہ غلطی اور گمراہی کے تمام خطروں سے بالکل محفوظ و مامون ہوتا ہے۔

اس کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خدا کی کتاب بندوں کو پہنچا دے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اس کتاب کے تمام اسرار و رموز لوگوں کو سمجھا دے، اس کتاب پر عمل کر کے دکھاوے، اس کتاب پر عمل کرنے والوں کا ایک گروہ اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کر دے اور اس کتاب کے مضمرات، ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں نمایاں کر دے۔ ان سارے کاموں میں اس کی اپنی ذات ایک عامل کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور ایک راہنما کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور اپنی اس دوسری حیثیت میں جو کچھ وہ کہتا ہے یا کرتا ہے یا جس چیز کو وہ منظور کر لیتا ہے، اس کو اس کتاب کے اور اس کے منصب رسالت کے تحت ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کو قبول کیا جاتا ہے۔

رسالت کے اس تصور کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نبی ﷺ کے ساتھ ہم جتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات رکھتے ہیں، اتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات نہ دنیا میں ہمارے کسی کے ساتھ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ سے آپ یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان گوناگوں تعلقات کی نوعیت سے اچھی طرح واقف نہ ہو یا ان میں سے بعض کا یا کل کا منکر ہو، تو وہ ہرگز آپ کی ذات بابرکات سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی ہے۔[1]

جدت پسند افراد کا گروہ :

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نبی ﷺ کو ماضی کی ایک قابل احترام شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، ساری قوم چونکہ آپ کو رسول کہتی ہے، اس وجہ سے یہ لوگ بھی آپ کو رسول ہی کہتے ہیں اور قومی روایات کے زیر اثر آپ کے لئے حمیت اور عصبیت کا جذبہ بھی ایک حد تک رکھتے ہیں، لیکن یہ بات ان لوگوں کے دل میں کسی طرح بھی نہیں دھنستی کہ آپ جس معاملے میں جو کچھ فرما گئے ہیں، وہی حرف آخر ہے اور انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کا انحصار بس اس کو بے چون و چرا مان لینے ہی پر ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک آپ نے جو کچھ بتایا اور سکھایا، وہ ایک مخصوص زمانہ اور ایک مخصوص ماحول کے لئے تو بے شک ٹھیک تھا لیکن علم و روشنی کے اس زمانہ میں انہیں چیزوں پر اصرار کئے چلے جانا، ان کے خیال میں جہالت اور حماقت ہے۔ اب

---

1 Urduweb.org/mehfil/threads/62384./2018

آپ کی بتائی ہوئی باتوں میں سے اگر کچھ چیزیں مانے جانے کے قابل ہیں، تو یا تو وہ ہیں جو خود ان کی اپنی خواہشات کے مطابق ہیں، یا وہ ہیں جن کو خوش قسمتی سے موجودہ زمانے میں بھی قدر و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو یہ لوگ دل سے گوارا کرنے کے لئے تیار ہوں اگرچہ اپنی کمزوری اور بزدلی کے سبب سے اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ رکھتے ہوں۔

جاہل عقیدت مند:

عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہے، جن کے نزدیک نبی ﷺ کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا مرجع ہے، وہ مختلف اوقات میں اپنی اس عقیدت کا اظہار کر کے اپنے خیال میں آپ کے نبوت و رسالت کے تمام حقوق و واجبات سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لیتے ہیں۔ انہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ نبی ﷺ کس مقصد کے لئے دنیا میں تشریف لائے تھے، آپ نے دنیا کو کیا تعلیم دی، اپنے بعد امت پر کیا ذمہ داریاں چھوڑ گئے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔ ان سوالوں پر غور کرنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے وہ اپنے تصورات کے مطابق آپ کی ذات کے ساتھ اظہار عقیدت کر لینے کو کافی سمجھتے ہیں، اگرچہ اس اظہار عقیدت کا طریقہ صریحاً آپ کی تعلیمات اور ہدایات کے خلاف ہی ہو۔ جاہل پیروں اور مولویوں کی ایک جماعت نے نبی ﷺ کے ساتھ عوام کے اس جذبہ عقیدت سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے محفوظ رہتے ہوئے عوام میں مقبول بننے کا یہ راستہ بہت آسان ہے کہ عوام کی اس جاہلانہ عقیدت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ نبی ﷺ کے ساتھ اظہار عقیدت اور محبت کے ایسے طریقے ایجاد کئے جن سے ان کو اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لئے شریعت کی تمام پابندیوں سے پوری آزادی مل جائے[1]۔

ایمان بالرسالت کے تصور کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی ﷺ پر ایمان لانے اور اس ایمان کے کامل ہونے کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ بنیادی طور پر ایمان بالرسالت کے دو بنیادی مدارج ہیں:

اصل ایمان:

یہ وہ اساسی ایمان ہے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت کا زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے نیز اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنے سے متحقق ہو جاتا ہے۔

کمال ایمان:

یہ ایمان کامل جو بعض شرائط اور تقاضے صحیح طور پر پورے کیے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ایمان بالرسالت اقرار و تصدیق کی شرط پوری کرنے کے علاوہ درج ذیل چار تقاضوں سے مرکب ہے۔

---

1 Urduweb.org/mehfil/threads/62384/2018

[۱] تعظیم رسول [۲] محبت رسول [۳] نصرت رسول [۴] اطاعت رسول

ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے تحقیق و ثبوت میں ایک قدر مشترک ہے اور ایک مختلف ہے، جہاں تک اصل اور کمال کے مدارج کا تعلق ہے دونوں ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِ يْمَانَ''[1]

ترجمہ: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے محبت وعداوت رکھی، اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے دیا اور اس کی خاطر روکا (نہ دیا)، اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی۔

حالانکہ ان شرائط پر پورا نہ اترنے کے باوجود اس کا اللہ پر ایمان رکھنا اصلاً ثابت ہو جاتا ہے مگر ناقص رہ جاتا ہے۔ جہاں تک ایمان بالرسالت میں اصل ایمان اور کمال ایمان کے تعین اور ان کے ثبوت کے حدود کا تعلق ہے اس میں اس کی حیثیت مختلف ہے۔ مذکورہ بالا چار شرائط اور تقاضوں میں سے پہلے دو (محبت اور تعظیم) اصل ایمان کا حصہ ہے۔ جبکہ بقیہ دو (اطاعت اور نصرت) کمال ایمان کا حصہ ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ سرے سے محبت ہی نہ ہو، بلکہ قلبی اور باطنی سطح پر ایک طرح کی لاتعلقی یا عدم رغبت کی کیفیت ہو نہ ہی دل میں آپ کی تعظیم کا کوئی داعیہ موجود ہو تو ان خصائص کا فقدان مطلقا ایمان ہی کی نفی کو مستلزم ہوگا۔ اس کے برعکس اگر محبت رسول اور تعظیم رسول کے عناصر انسان کی طبیعت میں پائے جائیں، مگر بدقسمتی سے اطاعت اور نصرت کی توفیق نہ ہو تو پھر ایمان اصلاً تو ثابت ہوگا مگر ناقص رہ جائے گا۔ اس کا کمال بلکہ خود داعیات محبت و تعظیم کا کمال اطاعت اور نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔

عقیدہ آخرت:

اسلام جن حقیقتوں کو ماننے کی ہمیں دعوت دے رہا ہے، ان میں سے ایک اہم ترین حقیقت آخرت کا تصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے، جہاں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، موجودہ دنیا انسان کی امتحان گاہ ہے، یہاں ایک خاص عرصہ کے لیے انسان کو رکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب اس کا مالک اسے توڑ کر دوسری دنیا دوسرے ڈھنگ پر بنائے گا، وہاں تمام انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، ہر ایک نے موجودہ دنیا میں جو اچھے یا برے عمل کئے ہیں، وہ تمام وہاں خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے، اور ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا دی جائے گی۔

کائنات کے موجودہ نظام میں کیا اس طرح کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن نظر آتا ہے، کیا یہاں کچھ ایسے واقعات اور اشارے پائے جاتے ہیں، جو اس دعوے کی تصدیق کر رہے ہوں۔

---

1 سنن ابی داود، کتاب: السنۃ، باب: الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ، حدیث: ۴۶۸۱، صحیح۔

یہ نظریہ سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ انسان اور کائنات اپنی موجودہ شکل میں ابدی نہ ہوں، اور یہ دونوں چیزیں ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق بالکل یقینی ہیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں انسان کے لیے بھی موت ہے اور کائنات کے لیے بھی موت ہے، دونوں میں سے کوئی بھی موت کے خطرے سے خالی نہیں ہے، جو لوگ دوسری دنیا کو نہیں مانتے وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اسی دنیا کو اپنی ابدی خوشیوں کی دنیا بنائیں، انہوں نے اس بات کی بہت تحقیق کی کہ موت کیوں آتی ہے تا کہ اس کے اسباب کو روک کر زندگی کو جاوداں بنایا جاسکے، مگر انہیں اس سلسلے میں قطعی ناکامی ہوئی۔ ہر مطالعہ نے بالآخر یہی بتایا کہ موت یقینی ہے اور اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔ اسی طرح موت کو غیر یقینی بنانے کے لیے اس کے اسباب کی جتنی چھان بین کی گئی ہے، وہ سب ناکامی پر ختم ہوئی ہے اور یہ امکان اب بھی بدستور باقی ہے کہ سارے انسانوں کو ایک مقررہ مدت پر مرنا ہے، اور ایسا کوئی امکان اب تک ثابت نہ ہوسکا کہ موت نہیں آئے گی، ڈاکٹر الکسس کیرل نے اسی مسلہ پر زمان داخلی کے عنوان سے لمبی بحث کی ہے اور اس سلسلے کی کوششوں کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہیں:

"انسان بقا کی تلاش اور جستجو سے کبھی نہیں اکتائے گا، مگر اس کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ جسمانی ساخت کے چند قوانین کا پابند ہے، وہ عضویاتی زمان کو روکنے اور غالباً ایک حد تک اس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوسکتا ہے، لیکن وہ موت پر کبھی فتح نہیں پاسکتا"[1]

اسی طرح نظام کائنات کی موجودہ شکل کا درہم برہم ہونا بھی ایک ایسی چیز ہے جو بالکل واقعاتی طور پر سمجھ میں آتی ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کائنات میں ہم جن چھوٹی چھوٹی قیامتوں سے واقف ہیں وہی آئندہ کسی وقت زیادہ بڑے پیمانے پر ظاہر ہونے والی ہے، یہ صرف موجودہ مقامی قیامتوں کے عالمی پیمانے پر واقع ہونے کی پیشن گوئی ہے۔

سب سے پہلا تجربہ جو ہم کو قیامت کے امکان سے باخبر کرتا ہے، وہ زلزلہ ہے، زمین کا اندرونی حصہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوا کی شکل میں ہوتا ہے، یہ مادہ مختلف شکلوں میں زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز محسوس ہوتی ہے، اور کش مکش کی وجہ سے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں، اسی کا نام زلزلہ ہے۔ یہ زلزلہ آج بھی انسان کے لیے سب سے زیادہ خوفناک لفظ ہے، یہ انسان کے اوپر قدرت کا ایسا حملہ ہے جس میں فیصلے کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، زلزلہ کے مقابلے میں انسان بالکل بے بس ہے، یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادے کے اوپر آباد ہیں، جس سے صرف پچاس کلومیٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہہ ہم کو الگ کرتی ہے، جو زمین کے مقابلے میں ویسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا، ایک

---

1 Alexis Carrel,Man the Unknow,France 1935, P: 175

جغرافیہ داں کے الفاظ میں ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنم دہل رہا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ ہم ایک عظیم ڈائنامیٹ کے اوپر کھڑے ہیں، جو کسی بھی وقت پھٹ کر سارے نظام ارضی کو درہم برہم کر سکتا ہے۔[1]

زلزلہ دراصل چھوٹے پیمانے کی قیامت ہے، جب دہشت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے، جب پختہ مکانات تاش کے پتوں کے گھروندے کی طرح گرنے لگتے ہیں، جب زمین کا اوپری حصہ دھنس جاتا ہے، اور اندرونی حصہ اوپر آجاتا ہے، جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں، جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں، یہ زلزلے کا وقت ہوتا ہے، اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلے میں کس قدر بے بس ہے، یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں، درحقیقت زلزلے کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا، یہ زلزلے گویا اچانک آنے والی قیامت کی پیشگی اطلاع ہیں، یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا مالک کس طرح زمین کے موجودہ نظام کو توڑنے پر پوری طرح قادر ہے۔

یہی حال بیرونی کائنات کا ہے، کائنات نام ہے، ایک ایسے لامحدود خلا کا جس میں بے انتہا بڑے بڑے آگ کے الاؤ ستارے بے شمار تعداد میں اندھا دھند گردش کر رہے ہیں، جیسے بے شمار لٹو کسی فرش پر ہماری تمام سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں، یہ گردش کسی بھی وقت زبردست ٹکراؤ کی صورت اختیار کر سکتی ہے، اس وقت کائنات کی حالت بہت بڑے پیمانے پر ایسی ہی ہوگی جیسے کروڑوں بمبار ہوائی جہازوں سے لدے ہوئے فضا میں اڑ رہے ہوں اور یکایک سب کے سب باہم ٹکرا جائیں، اجرام سماوی کا اس قسم کا ٹکراؤ کسی بھی درجہ میں حیرت انگیز نہیں ہے، بلکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکرا کیوں نہیں جاتے، علم الافلاک کا مطالعہ بھی ہمیں بتاتا ہے کہ ستاروں کا باہم ٹکرا جانا ممکن ہے، چنانچہ شمسی نظام کے وجود میں آنے کی ایک توجیہہ اسی قسم کے ٹکراؤ پر کی گئی ہے، اس ٹکراؤ کو اگر ہم بڑے پیمانے پر قیاس کر سکیں تو ہم نہایت آسانی سے زیر بحث امکان کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ دراصل اسی واقعہ کا دوسرا نام قیامت ہے، نظریہ آخرت کا یہ دعویٰ کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہو جائیگا، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ جو واقعہ کائنات کے اندر ابتدائی شکل میں موجود ہے، وہی ایک روز انتہائی شکل میں پیش آنے والا ہے۔ قیامت کا آنا ہمارے لیے ایک معلوم حقیقت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے امکان کی حد تک جانتے ہیں اور کل اسے واقعہ کی صورت میں دیکھیں گے۔

اب اس مقصد کے اعتبار سے غور کیجئے جس کے لیے مذہب دوسری زندگی کے اوپر عقیدہ رکھتا ہے، مذہبی تصور کے مطابق زندگی کا بقا نتیجہ کی آمد و رفت کا نام نہیں ہے جو شیشہ ساعت کی طرح بس خالی اور پر ہوتی رہے، اس سے آگے اس کا اور کوئی مقصد نہ ہو بلکہ دوسری زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے، اور وہ یہ کہ موجودہ دنیا کی اچھائیوں اور برائیوں کا بدلہ دیا جائے۔

---

1 George Gamow, The Biography of the Earth, Newyork The Viking Press 1941, P: 85

عقیدہ آخرت کا یہ جزو بھی اس وقت بالکل ممکن نظر آنے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں حیرت انگیز طور پر شخص کا نامہ اعمال رات دن ایک لمحہ کے وقفہ کے بغیر ریکارڈ کیا جارہا ہے، آدمی تین شکلوں میں اپنی ہستی کو ظاہر کرتا ہے۔ نیت قول اور عمل، یہ تینوں چیزیں مکمل طور پر محفوظ کی جارہی ہیں، ہمارا ہر خیال، ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور ہماری تمام کاروائیاں کائنات کے پردہ پر اس طرح نقش ہورہی ہیں کہ کسی بھی وقت ان کو نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جاسکے، اور یہ معلوم ہوسکے کہ دنیا میں کس کی زندگی خیر کی اور کس کی زندگی شر کی زندگی تھی، جو خیالات ہمارے دل میں گزرتے ہیں، ہم بہت جلد انہیں بھول جاتے ہیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئے، مگر جب ہم مدتوں کی ایک بھولی ہوئی بات کو خواب میں دیکھتے ہیں یا ذہنی اختلال کے بعد ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو اس کے فراموش شدہ ماضی سے متعلق ہیں، تو یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کا حافظہ اتنا ہی نہیں ہے، جتنا شعوری طور پر وہ محسوس کرتا ہے، حافظہ کے کچھ خانے ایسے بھی ہیں، جو بظاہر شعور کی گرفت میں نہیں رہتے، مگر وہ موجود ہوتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے تمام خیالات مستقل طور پر اپنی شکل میں محفوظ رہتے ہیں، حتیٰ کہ ہم چاہے بھی انہیں محو نہیں کر سکتے، یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی شخصیت صرف وہی نہیں ہے جسے ہم شعور کہتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس نفس انسانی کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے، یہ حصہ جسے فرائڈ تحت شعور یا لاشعور کا نام دیتا ہے، یہ ہماری شخصیت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ [1]

تحت شعور کا یہ نظریہ اب نفسیات میں تسلیم کیا جاچکا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر بات جو آدمی سوچتا ہے اور ہر اچھا یا برا خیال جو اس کے دل میں گزرتا ہے، وہ سب کا سب نفس انسانی میں اس طرح نقش ہو جاتا ہے کہ پھر کبھی نہیں بٹتا، وقت کا گزرنا یا حالات کا بدلنا اس کے اندر ذرہ برابر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، یہ واقعہ انسانی ارادہ کے بغیر ہوتا ہے، خواہ انسان اسے چاہے یا نہ چاہے۔ یہ واقعہ اس امکان کو ظاہر کرتا ہے کہ جب دوسری زندگی شروع ہوگی تو ہر شخص اپنے پورے نامہ اعمال کے ساتھ وہاں موجود ہوگا، آدمی کا خود اپنا وجود دے رہا ہوگا کہ کن نیتوں اور کن خیالات کے ساتھ اس نے دنیا میں زندگی بسر کی تھی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

{وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد }[2]

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو بنایا اور جو باتیں اس کے دل میں آتی ہیں وہ سب ہمیں معلوم ہے، اور ہم اس کے شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔

---

1 مولانا وحید الدین خاں، مذہب اور جدید چیلنج، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، ۱۹۹۷، ص: ۹۵

2 سورۃ ق ۵۰ : ۱۶

اب قول کے مسئلہ کو لیجیے، نظریہ آخرت یہ کہتاہے کہ آدمی اپنے اقوال کے لیے جواب دہ ہے، آپ خواہ بھلی بات کہیں یا کسی کو گالی دیں، آدمی اپنی زبان کو سچائی کا پیغام پہنچانے کے لیے استعمال کرے یا وہ شیطان کا مبلغ بن جائے، ہر حال میں کائناتی انتظام کے تحت اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جارہاہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتاہے:

{مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْد}[1]

ترجمہ: وہ منہ سے کوئی بات نہیں نکالتا مگر اس کے پاس ایک ہوشیار محافظ ہوتاہے۔

اور یہ ریکارڈ آخرت کی عدالت میں حساب کے لیے پیش ہوگا۔

یہ بھی ایسی چیز ہے جس کا ممکن الوقوع ہونا ہماری معلوم دنیا کے عین مطابق ہے، ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص بولنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت دیتاہے تو اس حرکت سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں جس طرح ساکن پانی میں پتھر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں، اگر آپ ایک برقی گھنٹی کو شیشہ کے اندر مکمل طور پر بند کردیں اور بجلی کے ذریعہ سے اسے بجائیں تو آنکھوں کو وہ گھنٹی بجتی ہوئی نظر آئے گی، مگر آواز سنائی نہیں دے گی، کیونکہ شیشہ بند ہونے کی وجہ سے اس کی لہریں ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہیں، یہی لہریں ہیں، جو آواز کی صورت میں ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں، اور کان کے آلات انہیں اخذ کرکے ان کو ہمارے دماغ تک پہنچادیتے ہیں، اور اس طرح ہم بولے ہوئے الفاظ کو سمجھنے لگتے ہیں جس کو سننا کہا جاتاہے۔ ان لہروں کے سلسلے میں ثابت ہوچکاہے کہ وہ ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد مستقل طور پر فضا میں باقی رہتی ہیں، اور یہ ممکن ہے کہ کسی بھی وقت انہیں دہرایا جاسکے، اگرچہ سائنس ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ ان آوازوں یا صحیح تر الفاظ میں ان لہروں کو گرفت کرسکے جو قدیم ترین زمانے سے فضا میں حرکت کررہی ہیں، اور نہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی خاص کوشش ہوئی ہے، تاہم نظری طور پر یہ تسلیم کرلیا گیاہے کہ ایسا آلہ بنایا جاسکتاہے جس سے زمانہ قدیم کی آوازیں فضا سے لے کر اسی طرح سنی جاسکیں جس طرح ہم ریڈیو سٹ کے ذریعہ ان لہروں کو فضا سے وصول کرکے سنتے ہیں، جو کسی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے بھیجی گئی ہوں۔

اس طرح غیر مصنوعی آوازوں کو الگ کرنے کا کوئی طریقہ ابھی دریافت نہیں ہواہے، ورنہ آج بھی ہم ہر زمانے کی تاریخ کو اس کی اپنی آواز میں سن سکتے تھے، تاہم اس سے یہ امکان یقینی طور پر ثابت ہوجاتاہے، کہ آئندہ کبھی ایسا ہوسکتاہے، اس تجربہ کی روشنی میں نظریہ آخرت کا یہ جزو ہمارے لیے بعید از قیاس نہیں رہتا کہ انسان جو کچھ بولتاہے، وہ سب ریکارڈ ہورہاہے، اور اس کے مطابق ایک روز ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ ہمارا مطالعہ ہمیں بتاتاہے کہ اسی طرح ہر شخص کے ساتھ خدا کے دو فرشتے ہیں جو ہمارے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو نہایت درجہ صحت کے ساتھ کائنات کی پلیٹ پر نقش کررہے ہیں۔

---

1 سورۃ ق ۵۰ : ۱۸

اب عمل کے مسئلہ کو لیجئے، اس سلسلے میں بھی ہماری معلومات حیرت انگیز طور پر اس کا ممکن الوقوع ہونا ثابت کرتی ہیں سائنس بتاتی ہے کہ ہمارے تمام اعمال، خواہ وہ اندھیرے میں کئے گئے ہوں یا اجالے میں تنہائی میں ان کا ارتکاب ہوا ہو یا مجمع کے اندر، سب کے سب فضا میں تصویری حالت میں موجود ہیں، اور کسی بھی وقت ان کو یکجا کر کے ہر شخص کا پورا کارنامہ حیات معلوم کیا جا سکتا ہے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ہر وہ چیز چاہے وہ اندھیرے میں ہو، یا اجالے میں ٹھہری ہوئی ہو یا حرکت کر رہی ہو، وہ جہاں یا جس حالت میں ہو، اپنے اندر سے مسلسل حرارت خارج کرتی رہتی ہے، یہ حرارت چیزوں کے ابعاد و اشکال کے اعتبار سے اس طرح نکلتی ہے کہ وہ بعینہ اسی چیز کا عکس ہوتی ہے جس سے وہ نکلی ہے، جس طرح آواز کی لہریں اس مخصوص تھر تھراہٹ کا عکس ہوتی ہیں، جو کسی زبان پر جاری ہوئی تھی، اسی لیے ایسے کیمرے ایجاد کیے گئے جو کسی چیز سے نکلی ہوئی حرارتی لہروں کو اخذ کر کے اس کی اس مخصوص حالت کا فوٹو تیار کر دیتے ہیں جبکہ وہ لہریں اس سے خارج ہوئی تھی، مثلاً میں اس وقت ایک کمرے میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مگر یہاں اپنی موجودگی کے دوران میں نے جو لہریں خارج کی ہیں، وہ بدستور موجود رہیں گی، اور حرارت دیکھنے والی مشین کی مدد سے خالی شدہ مقام سے میرا مکمل فوٹو حاصل کیا جا سکتا ہے، البتہ اس وقت جو کیمرے بنے ہیں وہ چند گھنٹے بعد ہی تک کسی لہر کا فوٹو لے سکتے ہیں، اس کے بعد کی لہروں کا عکس اتارنے کی طاقت ان میں نہیں ہے۔[1]

ان کیمروں میں انفرارڈ شعاعوں سے کام لیا جاتا ہے، اس لیے وہ اندھیرے اور اجالے میں یکساں فوٹو لے سکتی ہیں، امریکہ اور انگلینڈ میں اس دریافت سے کام لینا شروع ہو گیا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز دریافت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح فلم سٹوڈیو میں نہایت تیز رفتار کیمرے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تمام حرکات و سکنات کی تصویر لیتے رہتے ہیں، اسی طرح عالمی پیمانے پر ہر شخص کی زندگی فلمائی جا رہی ہے، آپ خواہ کسی کو تھپڑ ماریں یا کسی غریب کا بوجھ اٹھا دیں، اچھے کام میں مصروف ہوں یا برے کام کے لیے دوڑ رہے ہوں، اندھیرے میں ہوں یا اجالے میں، جہاں اور جس حال میں ہوں، ہر وقت آپ کا تمام عمل کائنات کے پردہ نقش ہو رہا ہے، آپ اسے روک نہیں سکتے، اور جس طرح فلم اسٹوڈیو میں دہرائی ہوئی کہانی کو اس کے بہت بعد اور اس سے بہت دور رہ کر ایک شخص اسکرین پر اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ عین موقع واردات پر موجود ہو، ٹھیک اسی طرح ہر شخص نے جو کچھ کیا ہے اور جن واقعات کے درمیان اس نے زندگی گزاری ہے، اس کی پوری تصویر ایک روز اس کے سامنے اس طرح آسکتی ہے کہ اس کو دیکھ کر وہ پکار اٹھے:

---

[1] مذہب اور جدید چیلنج، ص:۹۹

{مَا لِهٰذَا الْكِتٰبُ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا} [1]

ترجمہ: یہ کیسا دفتر ہے جس نے میرا چھوٹا بڑا کوئی کام بھی درج کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے پتہ چلا کہ دنیا میں ہر فرد کا مکمل اعمال نامہ تیار کیا جارہا ہے، جو خیال بھی آدمی کے دل میں گزرتا ہے ، وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے ،اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ ہو رہا ہے ، ہر آدمی کے ارد گرد ایسے کیمرے لگے ہوئے ہیں جو اندھیرے اور اجالے کی تمیز کیے بغیر شب و روز اس کا فلم تیار کر رہے ہیں ، گویا انسان کا قلبی عمل ہو یا لسانی عمل یا عضوی عمل ، ہر ایک نہایت باقاعدگی کے ساتھ درج کیا جارہا ہے ،اس حیرت انگیز صورت حال کی توجیہہ اس کے سوااور کچھ نہیں ہو سکتی کہ خدا کی عدالت میں ہر انسان کا جو مقدمہ پیش ہونے والا ہے ، یہ سب اس کی شہادت فراہم کرنے کے انتظامات ہیں جو خود عدالت کی طرف سے کئے گئے ہیں ، کوئی بھی شخص ان واقعات کی اس سے زیادہ معقول توجیہہ پیش نہیں کر سکتا،اب اگر یہ صریح واقعہ بھی آدمی کو آخرت میں ہونے والی باز پرس کا یقین نہیں دلاتا، تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا واقعہ ہو گا جو اس کی آنکھ کھولے گا۔ [2]

آخرت کا تقاضا:

درج بالا بحث سے موجودہ کائنات میں اس قسم کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن نہیں ہے جس کا مذہب میں دعویٰ کیا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ آخرت قطعی طور پر ممکن الوقوع ہے ، کائنات اپنے موجودہ ڈھانچے کے اعتبار سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ آخرت لازماً وقوع میں آئے۔

سب سے پہلے ہم نفسیاتی پہلو کو لیتے ہیں۔ کننگھم نے اپنی کتاب میں زندگی بعد موت کے عقیدے کو خوش کن لا ادریت کہا ہے [3]، یہی موجودہ زمانے میں تمام بے خدا مفکرین کا نظریہ ہے ،ان کا خیال ہے کہ دوسری زندگی کا عقیدہ انسان کی اس ذہنیت نے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک ایسی دنیا تلاش کرنا چاہتا ہے جہاں وہ موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور مشکلات سے آزاد ہو کر خوشی اور فراغت کی ایک دل پسند زندگی حاصل کر سکے ، یہ عقیدہ انسان کی محض ایک مفروضہ خوش فہمی ہے ، جس کے ذریعہ وہ اس خیالی تسکین میں مبتلا رہنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنی محبوب زندگی کو پالے گا، ورنہ جہاں تک حقیقت واقعہ کا تعلق ہے ، ایسی کوئی دنیا واقعہ میں موجود نہیں ہے مگر انسان کی یہ طلب بذات خود آخرت کا ایک نفسیاتی ثبوت ہے ، جس طرح پیاس کا لگنا پانی کی موجودگی اور پانی انسان کے درمیان ربط کا ایک داخلی ثبوت ہے ،اسی طرح ایک بہتر دنیا کی طلب اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی

---

1 سورۃ الکہف ۱۸: ۴۹

2 مذہب اور جدید چیلنج ، ص:۱۰۰

3 Micheal cunningham, states of apology, Manchester University press, P:43

ایک دنیافی الواقع موجود ہے، اور ہم سے اس کا براہ راست تعلق ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے عالمگیر پیمانے پر یہ طلب انسان کے اندر موجود رہی ہے، اب یہ ناقابل قیاس کہ ایک بے حقیقت چیز اتنے بڑے پیمانے پر اس قدر ابدی شکل میں انسان کو متاثر کر دے، ایک ایسا واقعہ جو ہمارے لیے اس امکان کا قرینہ پیدا کرتا ہے کہ دوسری دنیا موجود ہونی چاہیے، خود اسی واقعہ کو فرضی قرار دینا صریح ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

انسان کی بہت سی تمنائیں ہیں، جو اس دنیا میں پوری نہیں ہوتی، انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں صرف زندگی ہو، مگر اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے، جہاں زندگی کے ساتھ موت کا قانون بھی نافذ ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے علم، تجربہ اور جدوجہد کے نتیجہ میں جب اپنی کامیاب ترین زندگی کے آغاز کے قابل ہوتا ہے، اسی وقت اس کے لیے موت کا بیغام آجاتا ہے، لندن کے کامیاب تاجروں کے متعلق اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ 45 سے 65 سال کی عمر کے درمیان جب وہ اپنا کاروبار خوب جما لیتے ہیں، اور پانچ ہزار تا دس ہزار پونڈ سالانہ کمار ہے ہوتے ہیں، اس وقت اچانک ایک روز ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ جب یہ حقیقت ہے کہ اس کائنات کا بھی ایک خدا ہے، اور اس کے سامنے حساب کتاب کے لیے ہمیں حاضر ہونا ہے تو پھر ہر شخص کو خدا کا وفادار بن کر زندگی گزارنی چاہیے، ہماری کامیابی حقیقت سے موافقت کرنے میں ہے نہ کہ اس کے خلاف چلنے میں ہے۔[1]

ساری معلوم دنیا کے اندر صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل کا تصور رکھتا ہے، یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کا سوچتا ہے اور اپنے آئندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے جانور بھی کل کے لیے عمل کرتے ہیں، مثلاً چونٹیاں گرمی کے موسم میں سردی کے لیے خوراک جمع کرتی ہیں وغیرہ مگر جانوروں کا اس قسم کا عمل محض جبلت کے تحت غیر شعوری طور پر ہوتا ہے، وہ کل کی ضرورتوں کو سوچ کر بالقصد ایسا نہیں کرتے، بلکہ بلا ارادہ طبعی طور پر انجام دیتے ہیں، اور بطور نتیجہ وہ ان کے مستقبل میں انہیں کام آتا ہے، کل کو ذہن میں رکھ کر اس کی خاطر سوچنے کے لیے تصوری فکر کی ضرورت ہے، اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کسی دوسرے جاندار کو تصوری فکر کی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ مواقع ملنے چاہیے، جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے مگر انسان کا مطالعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس کے لیے ایک کل ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا نظام فطرت کے خلاف ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ زندگی میں ہماری ناکامیاں، عام طور پر ہم کو اس سے بہتر ایک زندگی کی توقع کی طرف لے جاتی ہیں، ایک خوش حال فضا میں ایسا عقیدہ باقی نہں رہ سکتا۔ جو لوگ اتنے بڑے نفسیاتی تقاضے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ غیر حقیقی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پھر اس زمین پر وہ کون سا واقعہ ہے جس کو

---

1 مذہب اور جدید چیلنج، ص: ۱۰۴

وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اور اگر سمجھتے ہیں تو اس کے لیے ان کے پاس کیسا دلیل ہے، یہ خیالات اگر صرف ماحول کا نتیجہ ہیں تو وہ انسانی جذبات کے ساتھ اتنی مطابقت کیوں رکھتے ہیں کیا دوسری زندگی کسی ایسی چیز کی مثال دی جا سکتی ہے، جو ہزاروں سال کے دوران میں اس قدر تسلسل کے ساتھ انسانی جذبات کے ساتھ اپنی مطابقت باقی رکھ سکی ہو۔

اب اخلاقی تقاضے کو لیتے ہیں، اس حیثیت سے جب ہم دیکھتے ہیں تو دنیا کے حالات شدید طور پر اس چیز کا تقاضہ کرتے ہیں کہ اس کی ایک آخرت ہو، اس کے بغیر ساری تاریخ بالکل بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ہمارا ایک فطری احساس ہے کہ ہم خیر اور شر ظلم اور انصاف میں تمیز کرتے ہیں، انسان کے سوا کسی بھی مخلوق کے اندر یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی، مگر انسان ہی کی دنیا وہ دنیا ہے، جہاں اس احساس کو سب سے زیادہ پامال کیا جا رہا ہے، انسان اپنے ابنائے نوع پر ظلم کرتا ہے، وہ اس کو لوٹتا ہے، اس کو قتل کرتا ہے اور طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتا ہے، حالانکہ جانوروں تک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی نوع کے ساتھ سفاکی نہیں کرتے، بھیڑئے اور شیر اپنی نوع کے لیے بھیڑیئے اور شیر نہیں ہے، مگر انسان خود انسان کے لیے بھیڑیا بنا ہوا ہے، بے شک انسانی تاریخ میں حق شناسی کی چنگاریاں بھی ملتی ہیں، اور وہ بہت قابل قدر ہیں، مگر اس کا بڑا حصہ حق تلفی کی روداد سے بھرا ہوا ہے، مورخ کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ انسان کا ضمیر جو کچھ چاہتا ہے، دنیا کے واقعی حالات اس کے خلاف ہیں۔ یہاں میں چند اقوال نقل کرونگا:

والٹیر: ''انسانی تاریخ محض جرائم اور مصائب کی ایک تصویر ہے''[1]

ہربرٹ اسپنسر: '' تاریخ محض بے فائدہ گپ ہے''

نپولین: ''تاریخ تمام کی تمام لایعنی قصے کا نام ہے''

اڈورڈ گبن: ''انسانیت کی تاریخ جرائم، حماقت اور بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے''

ہیگل: '' پبلک اور حکومت نے تاریخ کے مطالعہ سے جو واحد چیز سیکھی ہے، وہ صرف یہ کہ انہوں نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا''[2]

کیا انسانیت کا یہ عظیم الشان ڈرامہ اسی لیے کھیلا گیا تھا کہ وہ اس طرح کی ایک ہولناک کہانی وجود میں لاکر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، ہماری فطرت جواب دیتی ہے کہ نہیں، انسان کے اندر عدل وانصاف کا احساس تقاضا کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اور نہ ایسا ہونا چاہیے، ایک دن ایسا آنا ضروری ہے، جب حق اور ناحق الگ ہو، ظالم انسان کو اس کے ظلم کا اور مظلوم انسان کو اس کی مظلومیت کا بدلہ ملے، یہ ایک ایسی طلب ہے جس کو اسی طرح تاریخ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جس طرح اسے انسان سے علیحدہ

---

1 Will Durant, Story of Philosophy, Newyork, 1926, P. 220

2 Edward mcnall Burns, Western Civilisation, Norton, Newyork, 1973, , P. 871

نہیں کیا جا سکتا فطرت اور واقعہ کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اس خلا کو لازماً پر ہونا چاہیے، جو کچھ ہو رہا ہے، اور جو کچھ ہونا چاہیے، دونوں کا فرق ثابت کرتا ہے کہ ابھی زندگی کے ظہور کا کوئی اسٹیج باقی ہے، یہ خلا پکار رہا ہے کہ ایک وقت ایسا ہونا چاہیے جب دنیا کی تکمیل ہو، یہ دنیا اسی لیے بنائی گئی تھی کہ مکاری، درندگی اور ڈاکہ زنی کے ان ہولناک ڈراموں کا بس ایک اسٹیج بن کر رہ جائے اور اس کے بعد نہ ظالم کے لیے کچھ ہو اور نہ مظلوم کے لیے کچھ ہو، حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی دنیا خود اپنے سارے وجود کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ نامکمل ہے اور اس کا نامکمل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک وقت آنا چاہیے جب وہ مکمل کی جائے۔[1]

اس بات کو ایک اور پہلو سے دیکھئے، قدیم ترین زمانے سے انسان کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ لوگوں کو حق و صداقت کی راہ پر کیسے قائم رکھا جائے، اگر اس مقصد کے لیے تمام افراد کے مقابلے میں کچھ لوگوں کو سیاسی اختیار دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے ماتحت ان کی گرفت کے خوف سے زیادتیاں نہ کریں مگر اس تدبیر میں خود ان صاحب اختیار افراد کو عدل پر قائم رکھنے کا کوئی محرک موجود نہیں ہے، اگر اس مقصد کے لیے قانون بنایا جائے اور پولیس کا محکمہ قائم ہو تو ان مقامات اور مواقع پر آدمی کو کون کنٹرول کرے جہاں پولیس اور قانون نہیں پہنچ سکتے، اگر اپیل اور پروپیگنڈے کی مہم چلائی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض کسی کی اپیل کی بنا پر کوئی شخص اپنے ملتے ہوئے فائدے کو کیوں چھوڑ دے گا، دنیا کی سزا کا خوف بدعنوانیوں کی ہر گز روک نہیں سکتا، کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ جھوٹ، رشوت، سفارش، اثرات کا ناجائز استعمال اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے ذرائع موجود ہیں جو سزا کے ہر امکان کو یقینی طور پر ختم کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے، کہ کوئی ایسا محرک ہی بدعنوانیوں کو روکنے میں کارگر ہو سکتا ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہو، جو انسان کے اپنے ارادے میں شامل ہو جائے خارجی محرک کبھی اس معاملے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اور یہ بات صرف آخرت کے تصور میں ممکن ہے، آخرت کے نظریے میں ایک ایسا محرک موجود ہے جو بدعنوانیوں سے بچنے کے ہر مسئلے کو ہر شخص کا اپنا مسئلہ بنا دیتا ہے، وہ ہر شخص کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے، خواہ وہ ماتحت ہو یا افسر، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے خدا کے یہاں جانا ہے، اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اس سے لازماً بازپرس کرے گا۔

جو لوگ آخرت کو ایک فرضی تصور کہتے ہیں، ان کو سوچنا چاہیے کہ آخرت اگر فرضی ہے تو ہمارے لیے اس قدر ضروری کیوں ہے، کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم صحیح معنوں میں کوئی سماجی نظام بنا ہی نہیں سکتے، انسانی ذہن سے اس تصور کو نکالنے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہو جاتی ہے، کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لیے اس قدر ناگزیر ہو سکتی ہے، کیا اس کائنات میں ایسی مثال پائی جاتی ہے کہ ایک چیز حقیقت میں موجود نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ اس قدر حقیقی بن جائے، زندگی سے

1 مذہب اور جدید چیلنج، ص:۱۰۹

اس کا کوئی سروکار نہ ہونے کے باوجود وہ زندگی سے اتنی متعلق نظر آئے، زندگی کی صحیح معنوں اور منصفانہ تنظیم کے لیے آخرت کے تصور کا اس قدر ضروری ہونا خود یہ وضاحت کرتا ہے کہ آخرت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے [1] ۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے، کہ عین علمی اور عقلی مطالعہ ہی کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کائنات کا ایک خدا مانیں، اب اگر اس دنیا کا کوئی خدا ہے تو یقیناً بندوں کے ساتھ اس کے تعلق کو ظاہر ہونا چاہیے، یہ کب ظاہر ہوگا، جہاں تک موجودہ دنیا کا معاملہ ہے، یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ آج یہ تعلق ظاہر نہیں ہو رہا ہے، آج جو شخص خدا کا منکر ہے، اور کھلے عام یہ اعلان کرتا ہے کہ "میں خدا سے نہیں ڈرتا" اس کو لیڈری اور حکومت حاصل ہوتی ہے، اس کے برعکس جو خدا کے بندے خدا کا کام کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، ان کی سر گرمیوں کو وقت کا اقتدار غیر قانونی قرار دے دیتا ہے، جو لوگ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا اور راستہ میں اس کو کہیں خدا نہیں ملا، ان کے نظریات کو پھیلانے کے لیے بے شمار ادارے کام کر رہے ہیں، اور پورے ملکوں کے ذرائع و وسائل ان کی خدمت کے لیے وقف ہیں، اور جو لوگ خدا اور مذہب کی بات پیش کر رہے ہیں، ان کو تمام ماہرین اور علمائے وقت رجعت پسند اور ماضی کے اندھیرے میں بھٹکنے والا کہہ کر رد کر دیتے ہیں، لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، انقلابات آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، سورج نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے مگر خدا کی خدائی کا کہیں ظہور نہیں ہوتا، ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں یا نہیں اگر ہم خدا کو مانتے ہیں تو ہمیں آخرت کو بھی ماننا پڑے گا کیونکہ خدا اور بندوں کا تعلق ظاہر ہونے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے، کہ اگر معقولیت کے ساتھ غور کیا جائے گا تو دل پکار اٹھے گا کہ بے شک آخرت آنے والی ہے، بلکہ وہ آپ کو بالکل آتی ہوئی نظر آئے گی، آپ دیکھیں گے کہ حاملہ کے پیٹ میں جس طرح اس کا حمل باہر آنے کے لیے بیتاب ہو، اسی طرح وہ کائنات کے اندر بوجھل ہو رہی ہے اور قریب ہے کہ کسی بھی صبح و شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے۔

{يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ، قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَاعِنْدَ رَبِّیْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً}[2]

ترجمہ: یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت کہو اس کا علم تو صرف خدا کو ہے وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرلے گا، وہ زمین و آسمان میں بوجھل ہو رہی ہے وہ بالکل اچانک تم پر آپڑے گی [3] ۔

---

1 مذہب اور جدید چیلنج، ص: ۱۱۲

2 سورۃ الاعراف ۷ : ۱۸۷

3 مذہب اور جدید چیلنج، ص: ۱۱۳

فصل سوم: عقائد اسلامیہ کی تجدید کے اصول وطریقہ کار

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات اور حقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، اس ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

تورات میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے خالی ہے، انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارق عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے ہے۔ عیسائیوں زردشتیوں اور برہموں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور انکی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے، جن سے انسانوں کے قوائے عملی سرد ہو گئے اور انکی تصوریت ان کی عملیت پر غالب آ گئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

نبی ﷺ نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین واقرار ضروری قرار دیا، جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اور اخلاق وعبادات کی اساس قرار پا سکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات اور نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف اصول تلقین کیے، اللہ پر یقین، فرشتوں پر یقین، رسولوں پر یقین، کتابوں پر یقین اور آخرت پر یقین، یہ تمام وہ حقیقتیں ہیں جن پر دلی طور پر ایمان لانا اور زبان سے ان کا اعتراف کرنا لازمی ہے۔ چند عقائد کا صحیح تصور اور اسکی وضاحت درج ذیل ہیں:

عقیدہ توحید کی تجدید:

عقائد اسلامیہ میں عقیدہ توحید بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے اور ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لیے اللہ نے جنات اور انسانوں کی تخلیق فرمائی، اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ} [1]

ترجمہ: ” اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے بنایا ہے۔“

---

1 سورۃالذاریات ۵۱ : ۵۶

لہٰذا جنات اور انسانوں کو پیدا کرنے کا مقصد اعلیٰ اور مقصود حقیقی توحید کا معاملہ ہی ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور شرک سے اجتناب کیا جائے، اور اسی اہم کام کے لیے اللہ نے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ} [1]

ترجمہ: ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا طاغوت (جھوٹے خداؤں سے) بچو۔

ایک اور جگہ اللہ فرماتا ہے:

{وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ } [2]

ترجمہ: آپ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔

لہٰذا پہلی بات جس کی دعوت تمام انبیاء کرام نے اپنی امتوں کو دی:

{يٰقَوْمِ اعْبُدُوااللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُه} [3]

ترجمہ: اے میرے قوم اللہ کی عبادت اور بندگی کرو اور اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لیے اللہ تعالی نے رسولوں کو بھیجا، اور کتابوں کو نازل فرمایا۔ اسی کے لیے قیامت کھڑی ہوئی جسے الحاقۃ اور الواقعۃ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ یہ سب کچھ (لاالٰہ الااللہ) کے لیے، تاکہ اللہ کی وحدانیت کو قبول کیا جائے اور اس کے ساتھ کسی کو ہمسر نہ بنایا جائے، اور اس لیے اللہ کے احکامات کی پابندی کی جائے اور اس کی نافرمانی سے بچا جائے، اور اللہ کا شکر بجالایا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔ یہی وہ معاملہ ہے جو اللہ کا اپنے بندوں پر حق ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے معاذؓ سے ارشاد فرمایا:

''يَامُعَاذُ أَتَدْرِي مَا حَقُّ اللَّهِ عَلَى الْعِبَادِ؟، قَالَ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا أَتَدْرِي مَا حَقُّهُمْ عَلَيْهِ'' [4]

ترجمہ: کیا تم جانتے ہو اللہ کا کیا حق ہے بندوں پر؟ معاذؓ نے فرمایا: اللہ اور اس کے پیغمبرؐ بہتر جانتے ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا: انسانوں پر اللہ کا حق یہ ہے، کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو عبادت کے لائق نہ سمجھا جائیں۔

---

1 سورۃ النحل ١٦ : ٣٦

2 سورۃ الأنبیاء ٢١: ٢٥

3 الأعراف ٧ : ٥٩، ھود ١١ : ٥٠، المؤمنون ٢٣: ٢٣

4 صحیح بخاری، کتاب: التوحید، باب: ماجاء فی الدعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم امتہ الی توحید اللہ تبارک وتعالیٰ، حدیث: ٧٣٧٣۔۔۔ صحیح مسلم: ٣٠

{وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ،ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ}[1]

ترجمہ:"اور اگر تم منہ پھیرو گے تو اللہ تمہارے بدلے اور لوگوں کو لے آئے گا جو پھر تمہارے جیسے نہیں ہونگے۔"

مسلمان نسل در نسل توحید کا جھنڈا منتقل کرتے رہے یہاں تک کہ عقیدہ کی گمراہی سروں پر آ کھڑی ہوئی، جس نے تمام تصورات کی صورت بگاڑ ڈالی، مسلمہ اور ثابت مفاہیم کی صورت بدل ڈالی، اور اس میں شک وشبہہ میں مبتلا کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان علاقوں میں سوچ حیرت میں پڑ گئی اور بالآخر گمراہ ہو گئی، اور بہت سی جماعتیں راہ راست سے بھٹک گئیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل سنت وتوحید پر باہر سے کفار ومشرکین نے حملہ کیا، اور اندر سے اہل بدعت وجہالت نے، اور مسلمانوں میں توحید کی حقیقت سے لاعلمی اور عدم واقفیت پھیل گئی، اور یقین کمزور پڑ گیا، گمراہی اور بدعت کا جو بیج بویا گیا تھا وہ پروان چڑھنے لگا، اور شرک کے جھنڈے اس امت کے طول وعرض میں بلند ہونے لگے، قبروں پر چراغاں ہونے لگا، اور بہت سے معاملات میں تساہل سے کام لیا جانے لگا، مزاروں کو سجایا جانے لگا، مصیبت عام ہو گئی اور فساد برپا ہو گیا، جادوگروں کا بازار گرم ہو گیا، اور مسلمانوں پر ناکارہ لوگ مسلط ہو گئے لیکن نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

" لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ، لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ وَهُمْ كَذَلِكَ"[2]

ترجمہ: اس امت کی ایک جماعت ایسی ہے جو حق پر قائم رہے گی، اسے کسی کی دشمنی، مخالفت یا ساتھ چھوڑنا نقصان نہیں پہنچائے گا یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے، اور وہ اسی حال پر ہوں گے۔

آج اس امت کی حالت پر غور کرنے والا خاص طور پر توحید کے معاملہ میں معاملات بڑے عجیب ہے، تصورات اور مفاہیم میں بڑا بگاڑ ہے، توحید کی حقیقت سے انتہائی عدم واقفیت ہے، توکل میں انتہائی کمزوری ہے، اللہ کے لئے دوستی ودشمنی میں نرمیاں برتی جانے لگی ہیں، اولیاء اور انبیاء سے مدد مانگی جارہی ہے۔ اور ان تاریکیوں میں سے جس میں امت مبتلا ہو گئی ہے، بہت سے مسلمانوں کو توحید کی حقیقت کا علم ہی نہیں، اس لیے کہ بعض ایسے علماء سوء جو اس امت کی طرف تو اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں لیکن وہ لوگوں کو یہ بتاتے ہیں، کہ توحید در حقیقت وہ توحید نہیں جو نبی ﷺ لے کر آئے ہیں، بلکہ ان کی اپنی خود ساختہ توحید ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ بہت سی قوموں نے ان کی باتوں پر یقین کر لیا کہ یہ جو توحید کا مفہوم پیش کر رہے ہیں وہی اصل توحید ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہم سے مطالبہ کیا ہے۔

کچھ لوگ اپنی کتابوں میں جس توحید کو مانتے ہیں وہ ان کے نزدیک تین قسم کی ہیں وہ کہتے ہیں، کہ وہ ایک ہے اپنی ذات کے اعتبار سے اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا، ایک ہے صفات کے اعتبار سے کوئی اسکا شبیہ نہیں، ایک ہے افعال کے اعتبار سے کوئی

---

1 سورۃ محمد ۴۷ : ۳۸

2 صحیح مسلم، کتاب: الامارۃ، باب: قولہ صلی اللہ علیہ وسلم، لاتزال من امتی ظاہرین علی الحق، حدیث: ۱۹۲۰(۱۷۰)

اس کا شریک نہیں، ان تینوں اقسام میں سب سے مشہور قسم ان کے نزدیک تیسری قسم ہے، اور وہ ہے توحید الافعال، توحید ربوبیہ، اور وہ یہ کہ، اس جہاں کو پیدا کرنے والا ایک ہے، اور وہ اس بات کو منوانے کے لیے دلیل التمانع اور اس کے علاوہ دوسرے دلائل پیش کرتے ہیں، اور ان کا گمان ہے کہ یہی مطلوبہ توحید ہے، اور یہی لا الٰہ الا اللہ کا مطلب ہے، یہاں تک کہ الٰہیت (معبودیت) کا مفہوم صرف پیدا کرنے پر اور قدرت رکھنے تک محدود ہو گیا، لیکن یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ مشرکین نے اس قسم کی توحید کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ وہ اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اللہ ہی ہر چیز کا بنانے والا ہے۔

یہ لوگ توحید العبادۃ سے غافل ہو گئے، اور اس کا ان کے نزدیک کوئی اعتبار نہیں، بس یہی بات ان کے مذہب کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ ان لوگوں نے توحید میں ایسی باتیں داخل کر دیں جو اس میں نہیں ہے، یہاں تک کہ صفات کی نفی بھی توحید میں داخل کر دی گئی، ظاہر ہے کہ یہ وہ توحید نہیں جو جبریلؑ لے کر آئے تھے۔

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ توحید عبادت ہی توحید ربوبیت ہے، اور (لا الٰہ الا اللہ) کے معنیٰ یہ ہیں کہ کوئی پیدا کرنے والا اور رزق دینے والا نہیں سوائے اللہ کے، اور یہ درست نہیں، اسی لیے شرک ان کے درمیان پھیل گیا، کیونکہ وہ توحید عبادت سے غافل ہو گئے، اور یہ توحید بہت سے اسلامی ممالک میں اور اسی وجہ سے مصیبت عام ہو گئی، بلکہ آج کل بعض مسلمان مصنفین تو اپنا وقت اور محنت ایسی کتاب کی تصنیف میں برباد کرتے ہیں جس میں یہ ثابت کریں کہ اللہ ہی خالق اور رازق ہیں، تمام معاملات کی تدبیر زندگی اور موت دینے پر قادر ہیں، اور ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ یہی توحید ہے اور یہی مطلب ہے لاالٰہ الااللہ کا۔

ان لوگوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ انہوں نے خود کو اس بات میں تھکا دیا ہے جس بات کا اقرار قریش، ابولہب اور ابوجہل کر چکے ہیں اور اس بات کا انکار تو انہوں نے بھی نہیں کیا تھا، اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

{وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ }[1]

ترجمہ: ''اگر تم پوچھو ان سے کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو یقیناً وہ یہ جواب دیں گے، اللہ نے''۔

اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس قسم کی توحید سے وہ محفوظ نہ ہوئے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے قتال کیا۔

شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''آج کے دور میں اکثر مسلمان جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ وہ در حقیقت اس کا مطلب اچھی طرح سے سمجھتے ہی نہیں بلکہ بعض تو اس کا مطلب بالکل ہی الٹ سمجھتے ہیں۔ آج کے دور میں اکثر مسلمانوں کی حالت اس کلمہ طیبہ کو سمجھنے کے اعتبار سے زمانہ جاہلیت کے عرب سے بھی بدتر ہے، اس لیے کہ مشرکین عرب اس کو سمجھتے تھے، لیکن ایمان نہیں رکھتے

---

1 سورۃ لقمان 31: 25۔ سورۃ الزمر ۳۹ : ۳۸

تھے،اور آج کے دور کے اکثر مسلمان زبان سے اقرار تو کرتے ہیں لیکن اعتقاد اس کے منافی ہوتا ہے، کہتے ہیں لاالٰہ الااللہ لیکن حقیقتاًاُس کے معنی پر ایمان نہیں رکھتے ۔"[1]

اسی طرح غیب کا معاملہ ہے، غیب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خاصیت ہے:

{قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ}[2]

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ آسمانوں والوں میں سے زمین والوں میں سے سوائے اللہ کے کوئی غیب نہیں جانتا، انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کب اٹھا کھڑے کیے جائیں گے۔

لیکن جب عصر حاضر میں یہ قاعدہ مسلمانوں کے دلوں میں مستحکم نہیں رہا، تو جادو گروں نے اور جھوٹے تعویذ گنڈا کرنے والوں نے ان پر اپنا کھیل کھیلا، اس میں کچھ تو قابل یقین ہے اور کچھ کا یقین کرنا ممکن نہیں، جب یہ باتیں لوگوں پر حاوی ہو گئیں تو انہوں نے اس قسم کی ہر چیز کو قبول کر لیا، اور ایسے باطل اور فاسد عقائد نے ان کے دلوں میں حقیقت کی جگہ لے لی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف بے چینی اور تردد کا شکار ہو گئے، لہذا اب اسی بنیاد پر انہوں نے اپنی تدبیریں اور جوابات اور افعال مرتب کیے جس کی بنیاد علم الغیب کا فاسد تصور ہے، لہذا جادو گروں نے اپنا جھوٹ لوگوں کے درمیان پھیلانا شروع کیا، اور آج کے دور کے بہت سے ضعیف الایمان مسلمانوں نے ان کی باتوں پر یقین کر لیا۔ ان جادو گروں کے بازار گرم ہو گئے، ان کا سامان بڑھ گیا اور ان کے گاہکوں میں بھی اضافہ ہو گیا، لوگ صبح شام، دن رات ان کے پاس وہمی اور نفسیاتی بیماریوں کا علاج تلاش کرنے آنے لگے، اور ان سے کچھ تعویذات اور ایسے اعمال سیکھتے ہیں جس میں انہوں نے اپنی قرات سے پہلے ہی اپنا زہر پھونک دیا ہوتا ہے، بہت سے مسلمانوں نے اس پر یقین کر لیا، اور جادو گروں کی چال کامیاب ہو گئی، اور ان ضعیف الاعتقاد لوگوں پر نبی ﷺ کی وعید ثابت ہو گئی۔ صحیح مسلم میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ :

"مَنْ أَتَى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ، لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ يَوْمًا"[3]

ترجمہ: جو کسی نجومی یا کاہن کے پاس گیا اور اس سے کوئی بات دریافت کی تو چالیس دن تک اس شخص کی نماز قبول نہیں ہو گی۔

مسند الامام احمد میں ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ أَتَى عَرَّافًا أَوْ كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ فِيمَا يَقُولُ، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ"[4]

---

1 شیخ محمد ناصر الدین البانی، التوحید أولا یا دعاۃ الاسلام، ص:۵۲

2 سورۃ النمل ۲۷ : ۶۵

3 صحیح مسلم، کتاب: السلام، باب: تحریم الکھانۃ واتیان الکھان، حدیث: ۲۲۳۰۔

4 مسند احمد، مسند المدنیین، جلد:۲۷، صفحہ:۱۹۷، حدیث: بعض ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث:۱۶۶۳۸، اس کی اسناد صحیح اور مسلم کی شرط پر ہے۔

ترجمہ: جو کسی نجومی یا کاہن کے پاس گیا اور اس سے کوئی بات دریافت کی پھر اس کی بات پر یقین کیا، تو اس نے محمد ﷺ پر نازل کردہ شریعت کا انکار (کفر) کیا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں اپنے ولی الأمر (حکمرانوں) کو اور دوسرے اداروں کو مثلاً پولیس اور دینی اداروں کو اطلاع دیں، تاکہ وہ اس قسم کے لوگوں کو پکڑ سکیں، اور ان کی جڑوں کو کمزور کر سکیں، ان کی رگوں کو کاٹ سکیں تاکہ جو بیج انہوں نے بویا ہے وہ اگ نہ سکے، اور یہ امت ایک متحدہ امت بن جائے، جس میں اس قسم کے خرافات کی کوئی گنجائش نہ ہو، ایسے لوگوں کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا در حقیقت ان کے بازار کو گرم کرنے کے مترادف ہے، اور لوگوں کو اپنے خالق کی بندگی سے دور رکھنا ہے، اور اپنے خالق پر توکل سے ہٹانا ہے۔

اس طرح قبر پرستی کا معاملہ ہے اور اس میں سے وہ قبریں بھی ہیں جو آج بعض مسلمانوں کی نگاہوں میں بیت اللہ سے بھی زیادہ عظیم ہو گئی ہیں، اور ان کی زیارت کرنے ہر سال اتنے لوگ آتے ہیں جتنے بیت اللہ کی زیارت کو نہیں آتے، یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ قبروں کے معاملہ میں غلو ایک ایسی مصیبت ہے جو اپنی مختلف صورتوں میں بیشتر اسلامی ممالک میں پھیل گئی ہے، اور اس میں جو شرکی امور ہیں وہ لوگوں پر ملتبس ہو گئے ہیں، قبریں اور مزارات ایسی چیزیں ہو گئی ہیں کہ لوگ دور دور سے سامان سفر تیار کر کے ان کا قصد کرتے ہیں، اور ان قبروں کے مجاور، سجادہ نشین اور علماء سوء لوگوں کے لیے یہ شرکی معاملات مزین کر کے دکھاتے ہیں، اور اس کے جواز پر مختلف قسم کی تاویلات اور باطل دلائل پیش کرتے ہیں، اور لوگوں کا مال ناحق طور پر کھاتے ہیں، اور اللہ تعالی کی راہ سے دور کرتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ [1] فرماتے ہیں:

"نہ تو صحابہ کرام کے دور میں اور نہ ہی تابعین اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کے زمانے میں اس قسم کی کوئی چیز پائی جاتی تھی مسلمان ممالک میں، نہ تو حجاز [2]، نہ یمن [3]، نہ شام [4]، نہ عراق [5]، نہ مصر [1]، نہ خراسان [2] اور نہ مغرب میں کسی قسم کا مزار بنایا گیا، نہ

---

1 احمد بن عبد الحلیم المعروف بہ ابن تیمیہ، ۱۲۶۳ء کو حران میں پیدا ہوئے، تاتاریوں کے حملے کی وجہ سے مصر ہجرت کی، ۱۳۲۸ء کو علاقہ دمشق کے قلعہ میں حالت اسیری میں وفات پائی {البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، ۱۴: ۱۴۱ مؤسسۃ التاریخ العربی بیروت، س۔ن}

2 حجاز سے مراد وہ علاقہ ہے جو سعودی عرب کے موجودہ سلطنت کا مغربی حصہ ہے، {اردو دائرۃ معارف اسلامیہ ۷: ۹۰۰ دانش گاہ پنجاب ۱۹۷۲}

3 یمن کا علاقہ کعبہ کے رکن یمانی کی جانب واقع ہے اس لیے اسے یمن کہتے ہیں۔ {معجم البلدان، یاقوت بن عبد اللہ الحموی ۵: ۴۴۷، دار الفکر بیروت ۱۹۹۵ء}

4 شام فلسطین کا ایک علاقہ ہے اس کا پرانا نام سوریہ تھا، عرب یہاں سے غلہ خرید اکرتے تھے، {معجم البلدان ۳: ۳۱۲}

5 عراق کے نام پر دو علاقے ہیں، ایک عراق عجمی اور دوسرا عراق عربی، {معجم البلدان ۴: ۹۳}

نبیؐ کی قبر پر، نہ ہی ان کے صحابہ کی قبر پر، نہ اہل بیت کے کسی فرد کی قبر پر، نہ کسی نیک شخص کی قبر پر، بلکہ یہ تمام مزارات بعد میں آنے والے لوگوں کی ایجاد ہے، اور ان چیزوں کا ظہور اس وقت ہوا جب خلافت بنی عباس کمزور پڑ گئی، اور امت تفرقہ میں پڑ گئی، لادین زندیق اور ملحد لوگوں نے مسلمانوں کا عقیدہ کمزور کرنے کی سازشیں شروع کر دیں، اور ان کے درمیان اہل بدعت طاقتور ہو گئے، اور یہ المقتدر کے دور سے جو تین سو سال کا آخری حصہ ہے، اسی دور میں قرامطہ العبیدیہ القداحیہ کا ظہور مغربی عرب میں ہوا، اس کے بعد ان لوگوں نے مصر کا رخ کیا۔[3]

آج کے دور میں تو ان قبور کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اگر کسی امت کی ایسی حالت ہو اتنے مزارات اور ایسے اعمال ہوں تو اللہ کی نصرت کیسے شامل حال ہو سکتی ہے اور ایسی امت اللہ تعالیٰ سے کیسے فلاح اور کامیابی کی امید رکھ سکتی ہے جبکہ اس نے اس بات کا اقرار ہی نہ کیا ہو کہ عبادت خالصۃً اللہ کے لیے کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے[4]۔

امام ابن القیمؒ[5] نے قبروں کی عبادت کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

"اگر تم ان غلو کرنے والوں کو دیکھو جنہوں نے قبر کے گرد ایک میلہ بنا رکھا ہے، اور جب وہ ان قبروں کو دیکھتے ہیں تو اپنی سواریوں سے اتر جاتے ہیں، اپنے ماتھے ٹیک دیتے ہیں، زمین کو بوسہ دیتے ہیں، سر کو ننگا کرتے ہیں، ان کی آوازیں بلند ہو جاتی ہیں ، اور ایسا رونا روتے ہیں کہ ان کے رونے کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں ایسا کر کے حج کا ثواب کما لیا ہے، تو ایسے لوگوں سے مدد مانگتے ہیں جو نہ پیدا کرنے پر قادر ہیں اور نہ ہی موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہیں، پکارتے ہیں مگر بہت دور سے کہ جس کو پکارا جا رہا ہے اس تک ان کی آواز نہیں پہنچتی۔ یہاں تک کہ جب قریب آتے ہیں تو قبر کے پاس دو رکعت ادا کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ان لوگوں سے بھی زیادہ اجر حاصل کر لیا ہے جنہوں نے قبلتین المسجد الحرام اور المسجد الاقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہو! تم دیکھو گے کہ ایسے لوگ قبر کے گرد رکوع اور سجود کی حالت میں پڑے ہوں گے اور مردے سے فضل اور مغفرت کی امید کر رہے ہوں گے، لیکن در حقیقت ایسے لوگ اپنے نامہ اعمال میں ناکامی اور رسوائی

---

1 براعظم افریقہ کے شمال مشرق ایک مستطیل نما شکل کا نام مصر ہے، جس کے مغرب میں لیبیا، جنوب میں سوڈان، شمال مشرق میں اسرائیل اور شمال میں بحیرہ روم ہے، {معجم البلدان ۵: ۱۳۷ }

2 خراسان کا آج کل صدر مقام مشہد ہے، جبکہ مشرقی خراسان مع ہرات شہر افغانستان کی حدود میں شامل ہے، مشرق میں افغانسان، شمال میں روس ، جنوب میں کرمان اور سیستان اور مغرب میں اصفہان اور جرجان شامل ہیں۔ {wikipedia }

3 http://www.urdumajlis.net

4 http://www.urdumajlis.net

5 ابو عبداللہ شمس الدین محمد بن ابو بکر المعروف بہ ابن القیم، ۱۲۹۲ء دمشق میں پیدا ہوئے، امام ابن تیمیہ کے شاگرد تھے، ۱۳۵۰ء کو وفات پائی {البدایۃ والنہایۃ ۱۴: ۲۲۱ }

جمع کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے کہ غیر اللہ سے مراد پوری ہونے کی توقع کیے ہوتے ہیں، غیر اللہ سے حاجتیں پوری کرنے کی امید کرتے ہیں، مصیبتیں دور کرنے کی توقع کرتے ہیں، فقر وفاقہ اور تنگدستی دور ہونے کی امید رکھتے ہیں، بیماریوں سے اور دیگر تکالیف سے نجات اور شفا کی امید رکھتے ہیں، پھر قبر کے گرد ایسے طواف کرتے ہیں جیسے بیت اللہ کے گرد کیا جاتا ہے، پھر بوسہ دیتے ہیں اور استلام کرتے ہیں جیسے حجر اسود کا بوسہ اور استلام کیا جاتا ہے. پھر اپنے چہرے اور ماتھے ایسے ٹیک دیتے ہیں جیسے اللہ تعالی کے حضور سجدے میں بھی نہیں ٹیکتے، اس کے بعد قبر کے حج کے مناسک پورے کرتے ہیں، بال کٹواتے یا منڈواتے ہیں، اور اس قبر سے اپنا حصہ وفائدہ اپنے گمان میں حاصل کر چکے کیونکہ ظاہر سی بات ہے، اللہ تعالی کے پاس ایسے لوگوں کے لئے اجر وثواب میں سے کوئی حصہ نہیں ہے، پھر اس قبر کے لیے قربانیاں دیتے ہیں، اور ان کی یہ تمام نمازیں دعائیں قربانیاں اور دیگر مناسک غیر اللہ کے لیے ادا کیے گئے. پھر تم دیکھو گے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہونگے یہ کہتے ہوئے: اللہ ہمیں بھی اور تم کو بھی اس کا عظیم اجر وثواب دے!! ۔اور جب یہ واپس لوٹتے ہیں تو ان سے غلو کرنے والے احمق پوچھتے ہیں اگر یہ قبر کے حج کا ایصال ثواب کر دیں اور اس کے بدلے بیت اللہ کے حج کا ثواب حاصل کر لیں، تو وہ منع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ: نہیں بیت اللہ الحرام کے دس حج کے ثواب کے بدلے بھی اس ایک حج کا ثواب نہیں دونگا۔"

ایسے بگڑے ہوئے قبر پرستوں کا علاج در حقیقت تین طریقوں سے کیا جا سکتا ہے:

1۔ **علمی طریقہ** : علماء کرام اور طالب علموں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ان قبر پرستوں کے جھوٹ کا پردہ فاش کریں اور ان کی حقیقت عوام الناس کے سامنے رکھیں، اور ان خوابوں، موضوع ومن گھڑت احادیث اور قصے کہانیوں پر اعتماد کرنے کے فساد کو ظاہر کریں، ساتھ ہی ساتھ دلائل کو پرکھنے اور قبول کرنے کا جو صحیح معیار ہے وہ بھی ان کے سامنے پیش کریں یعنی قرآن اور سنت سے ہی استدلال کیا جائے اور ان کے فہم کے سلسلے میں فہم سلف صالحین پر ہی اعتماد کیا جائے، اس لیے کہ قبر پرست اپنے مذموم مقاصد کو صحیح ثابت کرنے کے لیے خوابوں یا پھر جھوٹی موضوع احادیث اور قصہ کہانیوں کا سہارا لیا کرتے ہیں۔

2۔ **تبلیغ اور دعوت کا طریقہ** :اس سے مراد یہ ہے کہ علماء اور داعیان حضرات ان علاقوں میں جہاں قبر پرستی یعنی ان کی تعظیم اور غلو کیا جاتا ہے، لوگوں میں توحید کی اہمیت کو اجاگر کریں، اور لوگوں کو توحید کے صحیح مفہوم سے اور محض اللہ تعالی سے لو لگانے کی اہمیت سے روشناس کرائیں ، عمومی طور پر امت کی کتاب وسنت کے دلائل کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی اہمیت پر تربیت کی جائے، یہی نہیں بلکہ مکمل تسلیم اور دلی رضا مندی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات قبول کی جائے اللہ کا ارشاد ہے:

{فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا}[1]

---

1 سورۃ النساء 4 : 65

ترجمہ: قسم ہے تمہارے رب کی! یہ مسلمان نہیں ہو سکتے، جب تک کہ سب اپنے آپس کے اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مانے، پھر اس کے بعد جو فیصلہ آپ ان میں کرے اسی فیصلے کو اطاعت اور فرمانبرداری کے اتھ قبول کر لے اور دل میں کسی قسم کی کوئی تنگی اور افسردگی نہ پائیں۔

3۔دعوت غور و فکر کا طریقہ :اس سے مراد یہ ہے کہ قبروں اور مزاروں میں غلو ایسی قوموں میں ہی ہوتا ہے جنہوں نے عقل کو معطل کر دیا ہو اور غور و تفکر سے کام نہ لیتے ہوں۔

اس کے علاوہ ایک احتسابی (قوت استعمال کرنے کا) طریقہ بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس قسم کی قبروں پر تعمیر گنبد اور مزارات کو توڑ دیا جائے اور اسے گرا دیا جائے، جیسا کہ جناب أبي الهياج الأسدي کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، جس کی روایت صحیح مسلم میں ہے، یہ سیدنا علیؓ ابن ابی طالب سے روایت ہے جب انہوں نے اسی صحابی سے فرمایا:

''أَلَا أَبْعَثُكَ عَلَى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ أَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ، وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ''[1]

ترجمہ: کیا میں تمہیں ایسے کام پر متعین نہ کروں جس کام پر نبی ﷺ نے مجھے متعین کیا تھا؟ اور وہ کام یہ ہے کہ کسی بھی قبر کو اونچا دیکھو تو اسے زمین بوس (بلڈوز) کر ڈالو، اور کوئی بھی تصویر دیکھو تو اسے مٹا ڈالو۔

یقیناً یہ بات استطاعت کے ساتھ مشروط ہے جبکہ کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو، جس طرح عظیم داعی امام محمد بن عبدالوہابؒ نے عثمان بن معمرؒ کے ساتھ مل کر کیا، جب انہوں نے قبروں پر تعمیر گنبد مسمار کئے اور ایسے درخت جن کے بارے میں لوگ مختلف قسم کے اعتقادات رکھتے تھے انہیں اکھاڑ پھینکا، امام صاحب نے بذات خود اپنے ہاتھوں سے اس گنبد کو مسمار کیا جو زید بن الخطابؓ کی قبر پر تعمیر کیا گیا تھا، اسی طرح اس درخت کو بھی کاٹ اکھاڑ پھینکا جو شجرۃ الذئب کے نام سے مشہور تھا۔

اسی طرح شیخ حافظ الحکمیؒ نے صامطہ نامی شہر میں ساحل کے علاقے میں ایک گنبد توڑ ڈالا، اور ایک گنبد جو شریف حمود المکرمی کی قبر پر تعمیر کیا گیا تھا اسے بھی توڑ ڈالا۔

سال ۱۳۴۳ھ میں سلفی دعوت کے متبعین نے مکہ مکرمہ میں موجود قبروں پر کی گئی تعمیرات اور گنبدوں کا ازالہ کیا، مثال کے طور پر وہ گنبد جو ام المؤمنین سیدہ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی قبر پر اہل بدعت نے تعمیر کیا تھا۔اسی طرح اہل دعوت و تبلیغ کو چاہیے کہ ایسی قبروں پر بیٹھے پیروں، فقیروں، مجاوروں اور سجادہ نشینوں کا پردہ فاش کریں اور ان کا مکر و فریب ظاہر کریں، تاکہ لوگ ان کی حقیقت سے واقف ہوں اور جان جائیں کہ یہ لوگوں کو دھوکہ دیکر ان کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی دنیا میں اس قسم کی قبروں کا پھیلنا اور اسے فروغ ملنے کی بہت سی وجوہات ہیں۔

---

1 صحیح مسلم، کتاب: الجنائز، باب: الامر بتسویۃ القبر، حدیث: ۹۶۹۔

1۔دینی وجوہات : قبر پرستوں کے نفس میں توحید کی حقیقت کا فقدان پایا جاتا ہے،اور اس کے ساتھ ان قبر پرستوں کے علماء اور مشائخ لوگوں کو خود ساختہ دلائل پیش کرتے ہیں، کہ یہ سب درست ہے،اور دینی حقیقت ہے اور شریعت میں اس کی گنجائش ہے ،اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قبر والے نفع نقصان کے مالک ہیں۔

2۔نفسیاتی وجوہات : یعنی ایسی نفسیاتی وجوہات بھی ہیں جو اس قسم کی قبروں اور مزارات کی تعظیم اور ان اصحاب قبور سے ڈرنے کا سبق دیتی ہیں، جس کے نتیجہ میں نفس میں ایک ایسا اعتقاد جنم لیتا ہے جس میں ان اصحاب قبور سے اور ان کے غضب سے خوف کی کیفیت پیدا ہوتی ہے،اسی طرح مختلف قسم کے پروپگینڈا نے بھی ایسے اعتقادات کو فروغ دیا ہے، مثال کے طور پر صوفی ہمیشہ لوگوں کو اولیاء کے غضب سے ڈراتے ہیں[1]۔

3۔معاشرتی وجوہات : جس میں خوشامد، چاپلوسی اور بناوٹ نے ایک اہم کردار ادا کیا، اس کے ساتھ ساتھ قبر کے خدام نے لوگوں کے دلوں میں اپنی ہیبت قائم کرنے کے لیے ایک مخصوص قسم کی شخصیت اختیار کرلی ہے، اسی طرح مختلف بستیوں اور شہروں کے باشندوں کا ان قبروں اور مزاروں کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کرنا خصوصاًاگر اس مزار اور مزار والے کی بہت شہرت ومنزلت ہو،اور حالت یہاں تک جاپہنچی کہ بعض بستی والے اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے درمیان فلاں کی قبر ہے، جیسے کہ یہ کوئی ایسے بڑے فخر اور عزت کی بات ہے کہ جس سے بڑھ کر کوئی شرف وفضیلت نہیں ہے۔

4۔مالی واقتصادی وجوہات : جو کہ مادی منافع پر مشتمل ہے، یہ بات واضح ہے کہ ابتدا سے ہی کچھ لوگوں نے قبروں اور مزاروں کو کمائی کا ذریعہ بنار کھا ہے،ان مزاروں کی دیکھ بھال کرنے والے ان پیسوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں،اور ان کے ساتھ ساتھ اس کے ارد گرد رہنے والے ہزاروں لوگ خود ساختہ عرس اور میلاد وغیرہ سے حاصل آمدنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

5۔سیاسی وجوہات : اور وہ اس طرح کہ ان حکومتوں کو اس قبر پرستی میلوں ٹھیلوں اور عرس کے پس منظر میں بہت سے سیاسی مفادات حاصل ہوتے ہیں،مزید یہ کہ ان دینی نقطہ نظر کو دبایا جاسکے جو ان کے مخالف ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ استعماری قوتیں

---

1 شروع سے مشرکین کا یہ طریقہ رہاہے جیسا کہ قوم عاد نے سیدنا ھود؈ کو یہ کہتے ہوئے ڈرایا کہ :اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْءٍ(ھود:۵۴) (بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ تو ہمارے کسی الٰہ کے بڑے جھپٹے میں آگیا ہے) یا جیسا کہ سیدنا ابراہیم؈ کو بھی ڈرانا چاہا :وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ وَكَيْفَ اَخَافُ مَا اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَم يُنَزِّل بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا، فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانعام:۸۰-۸۱)(اور ان سے ان کی قوم نے حجت کرنا شروع کردی، آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کے معاملے میں مجھ سے حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دی ہے اور میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بناتے ہو نہیں ڈرتاہاں اگر میرا رب ہی کچھ چاہے تو وہی ہوتا ہے۔اور وہ ہر چیز کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے، کیا تم پھر بھی خیال نہیں کرتے،اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے شریک بنایا ہے حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن پر اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، سوان دو گروہوں میں سے امن کا زیادہ حقدار کون ہے، اگر تم خبر رکھتے ہو۔

بھی ایسے قبر پرستی اور شرکیہ امور کو فروغ دیتی ہیں، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح امت کو کمزور کر کے تفرقہ بازی میں ڈالا جا سکتا ہے۔[1]

اس کے علاوہ مسلمانوں میں شبہات پیدا کرنے کی کوششوں میں سے ایک کوشش یہ کہنا بھی ہے کہ توحید لوگوں میں تفرقہ اور انتشار پیدا کرتی ہے، یہ ہم اکثر سنا کرتے ہیں اور اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ بات ایسے لوگ کیا کرتے ہیں جن کا ظاہر تقویٰ اور خیر کی دلالت کرتا ہے، اس قسم کی باتیں کوئی اور کرتا، تو معاملہ آسان ہوتا، لیکن جب ایسی باتیں ان لوگوں کی طرف سے آئیں جو بظاہر خیر اور تقویٰ کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں تو مصیبت اور پریشانی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور معاملہ مزید گھمبیر ہو جاتا ہے۔ آج کے دور میں بعض نوجوان یہ کہتے ہیں: توحید کا معاملہ لوگوں میں تفریق پیدا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہی ایسی توحید لیکر آئے ہیں جس کے بارے میں تم ایسی باتیں کرتے ہو۔

میں اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ توحید کا معاملہ لوگوں میں تفریق پیدا کرتا ہے، بلکہ یہ تو لوگوں کو یکجا کرتا ہے اور دینی اخوت کی بنیاد پر انہیں ایک دوسرے سے قریب کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا}[2]

ترجمہ: ور اللہ تعالیٰ کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے ۔

امت توحید کی وجہ سے بھائی بھائی ہوئی، مال و دولت یا زمین و جائیداد کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اللہ نے تو محمد ﷺ سے فرمایا:

{لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ}[3]

ترجمہ: ”اگر جو کچھ زمین میں ہیں سارے کا سارا خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دل آپس میں نہیں ملا سکتے تھے۔“

ایسے لوگوں کو دلائل اور حکمت کے ساتھ سمجھانا چاہیے اور ان کے دلوں میں توحید کے صحیح تصور کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔[4]

---

1 جیسا کہ اب کفار بھی اس بات کی ترویج دیتے ہیں کہ سب سے اچھا اسلام صوفی ورژن ہے، اسے اپنایا جائے نا کہ خالص توحید و سلفی منہج کو۔

2 سورۃ آل عمران ۳: ۱۰۳

3 سورۃ الانفال ۸: ۶۳

4 http://www.urdumajlis.net

عقیدہ رسالت کی تجدید:

اسلام میں داخل ہونے کے لیے عقیدہ توحید کی طرح اللہ کے آخری نبی حضرت محمدؐ کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھنا بھی شرط ہے، جسے اس حال میں موت آگئی کہ وہ محمدؐ کی نبوت پر صحیح ایمان نہیں رکھتا تھا وہ دوزخ کا ایندھن ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اس رب کی قسم جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے اس امت میں سے جو بھی میری نبوت کے متعلق سنتا ہے، خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی اور وہ میرے لائے ہوئے دین اسلام پر ایمان نہیں لاتا پھر وہ فوت ہو جاتا ہے تو وہ جہنم کی آگ میں جلنے والوں میں سے ہے۔'' [1]

جسے اس حال میں موت آگئی کہ وہ محمد ﷺ کو اللہ کے ساتھ عبادت کے لائق سمجھتا تھا، اس پر جنت حرام ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

{اِنَّہ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ}[2]

''یقیناً جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو عبادت کے لائق سمجھا، سو اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا اور اس کی جگہ آگ ہے''۔

عصر حاضر میں مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والوں میں سے کئی لوگ نبی ﷺ کی آخری نبی کے انکاری ہیں، کئی شک میں مبتلا ہیں اور اکثر انہیں اللہ کی ذات اور صفات میں شریک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْكُمْ مِنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ }[3]

ترجمہ: محمدؐ آپ کے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں تھے لیکن اللہ کے رسول اور انبیاء پر مہر تھے۔

کچھ لوگوں کو شک میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ آخری نبی تو تھے لیکن آخری رسول نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

{قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا}[4]

ترجمہ: ''اے محمدؐ کہہ دے اے لوگو یقیناً میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

{وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ}[5]

---

1 صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: وجوب الایمان برسالۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ح: ۲۴۰، مسلسل نمبر: ۱۵۳

2 سورۃ المائدۃ ۵: ۷۲

3 سورۃ الاحزاب ۳۳ : ۴۰

4 سورۃ الاعراف ۷ : ۱۵۸

5 سورۃ سبا ۳۴: ۲۸

ترجمہ: ”اور ہم نے آپؐ کو لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثریت لوگ نہیں جانتے۔“

رسول اللہؐ نے فرمایا:

” میری اور دیگر انبیاء کی مثال اس محل کی مانند ہے، جس کی عمارت بہت شاندار تھی، اس میں ایک اینٹ کے برابر جگہ چھوڑ دی گئی، سو دیکھنے والوں نے اسے گھوم پھر دیکھا، وہ ایک اینٹ کے برابر خالی جگہ کے علاوہ عمارت کی خوبصورتی پر متعجب تھے، سو میں نے اس اینٹ کی جگہ کو پر کر دیا، یہ عمارت مجھ سے مکمل ہوئی(وَخَتَمَ بِی الرُّسُل) اور مجھ پر رسولوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔“[1]

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

” بے شک میرے کئی نام ہیں، میں محمد ﷺ ہوں اور میں احمد ﷺ اور میں ماحی ﷺ ہوں کہ میرے سبب اللہ کافروں کو مٹائے گا اور میں حاشر ﷺ ہوں کہ تمام لوگوں کا حشر میرے نقش قدم پر ہوگا اور میں عاقب ﷺ ہوں(وَ عَاقِبَ الَّذِیْ لَیْسَ بَعْدَہٗ نَبِیٌ) اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔“[2]

ان تمام احادیث سے ختم رسالت ظاہر ہوتا ہے کہ محمد ﷺ آخری رسول بھی تھے۔

اسی طرح مسلمان ہونے کے لیے محمد ﷺ کی عبدیت کا ماننا لازمی ہے۔ کلمہ طیبہ کا آدھا حصہ ہے ”وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً عَبْدُہ وَرَسُوْلُہ“ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اسلام کا دعوٰی کرنے والے کچھ لوگ کلمہ طیبہ کے اس حصے کا سر عام انکار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ انسان نہیں بلکہ اللہ کے نور سے تخلیق شدہ (نور من نور اللہ) ہیں۔ ان کی ایک نعت کا شعر ہے: "وہ خدا نہیں بخدا نہیں، لیکن خدا سے جدا نہیں"۔ عیسائی کہتے ہیں عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ یقیناً بیٹا اپنے باپ کے جسم کا حصہ ہوتا ہے، یعنی عیسائیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ عیسیٰؑ اللہ کے نور کا حصہ ہیں۔ یہ شرک فی الذات ہے کہ مخلوق کو اللہ کی ذات کا حصہ کہا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ} [3]

ترجمہ: اور انہوں نے اس (اللہ) کے لیے اس کے بندوں میں سے جزو مقرر کر دیا، بے شک انسان صریح ناشکرا ہے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ فاروق [1] سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

---

1 صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ختم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث:3535--- صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین، حدیث:۲۲۸۶

2 صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی اسمائہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: ۲۳۵۴

3 سورۃ الزخرف ۴۳: ۱۵

"میری تعریف کرتے ہوئے اس طرح حد سے نہ بڑھو جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریمؑ کی تعریف کی کیونکہ میں صرف اللہ کا بندہ ہوں، سو تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو" [2]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ }[3]

ترجمہ: اور یقیناً ہم نے آدمؑ کی اولاد کو عزت دی۔"

اللہ نے بنی آدم کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی اور سب مخلوقات پر فضیلت دی۔ یہی سبب ہے کہ نوری مخلوق کو بھی آدمؑ کو تعظیمی سجدہ کرنے کا حکم ہوا تھا۔ اسی طرح جگہ جگہ اللہ نے قرآن میں محمدؐ کے لیے بندے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے :

{اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَا اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ}[4]

ترجمہ: کیا لوگوں کے لیے یہ بات موجب حیرت ہے کہ ہم نے ان میں سے ہی ایک بندے پر وحی نازل کی۔

{قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ}[5]

ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ کہہ دیجئے! بے شک میں ایک انسان ہوں، تمہارے جیسا، مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔

{قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَسُوْلًا} [6]

ترجمہ: اے نبیؐ کہہ دیجئے! میرا رب پاک ہے، میں کیا ہوں، مگر ایک انسان ایک رسول۔

کفار مکہ کا ماننا تھا کہ رسول ہرگز انسان نہیں ہو سکتا، انہیں پختہ یقین تھا کہ محمدؐ ہماری طرح انسان ہیں، اور جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نور من نور اللہ ہے ان کا عقیدہ کفار سے بھی بدتر ہے۔

{وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ}[7]

ترجمہ: اور ظالم پوشیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ تمہاری طرح ایک انسان ہی تو ہے۔

---

1 عمر بن خطاب بن نفیل، جلیل القدر صحابی اور دوسرے خلفہ راشد ۵۸۴ء کو مکہ میں پیدا ہوئے، ۱۳ھ کو خلیفہ چنے گئے، ۶۴۴ء کو وفات پائی {الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابن عبد البر، ۳: ۱۱۴۴، دار الجیل بیروت، ۱۹۹۲ء}

2 صحیح بخاری: ح: ۶۵۴

3 سورۃ اسراء ۱۷: ۷۰

4 سورۃ یونس ۱۰ : ۲

5 سورۃ الکہف ۱۸ : ۱۱۰

6 سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۹۳

7 سورۃ الانبیاء ۲۱ : ۳

{وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا}[1]

ترجمہ: اور لوگوں کو ایمان لانے سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی صرف اسی چیز نے روکا ہے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

{وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، وَمَا جَعَلْنٰھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا کَانُوْا خٰلِدِیْنَ} [2]

ترجمہ: اور ہم نے تم سے پہلے بھی تو آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا ان کی طرف، ہم وحی بھیجا کرتے تھے اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لو۔ اور ہم نے ان کے ایسے بدن بھی نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔

بعض لوگوں یہ دعوی کرتے ہیں کہ محمدؐ عالم الغیب ہیں۔ ایسا کہنا اور سوچنا قرآن سے لاتعلقی کا نتیجہ ہے۔ پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔ کئی آیات سے ثابت ہے کہ تمام مخلوقات کے آئندہ حالات صرف اللہ ہی جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ }[3]

ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ کہہ دیجئے! اللہ کے علاوہ زمینوں اور آسمانوں میں کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔

{عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا ، اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ }[4]

ترجمہ: اللہ عالم الغیب ہے، سوا اپنے غیب کو کسی پر بھی ظاہر نہیں فرماتا مگر جس رسول کا انتخاب کر لے۔

''عالم الغیب'' اللہ کے اسماء الحسنیٰ میں سے ایک نام اور اللہ کی صفت ہے، لہٰذا اس نام سے محمد ﷺ کو پکارنا شرک فی الاسماء والصفات ہے۔ درج بالا آیات سے واضح ہے کہ اصل عالم الغیب صرف اللہ ہی ہے لیکن جن وانس کی رہنمائی کے لیے اللہ منتخب رسول پر غیب کی بعض خبریں مثلاً دوزخ کے عذاب، جنت کی نعمتیں وحی فرماتے ہیں۔ اللہ نے پیغمبر ﷺ سے اقرار کرایا کہ وہ عالم الغیب نہیں ہیں اور خود بھی اس کی نفی فرمائی۔ قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے:

{ مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ } [5]

ترجمہ: اے نبی ﷺ! آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب یعنی قرآن کیا ہے اور نہ ہی ایمان۔

---

1 سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۹۴

2 سورۃ الانبیاء ۲۱ : ۷،۸

3 سورۃ النمل ۲۷ : ۶۵

4 سورۃ الجن ۷۲ : ۲۶،۲۷

5 سورۃ الشوریٰ ۴۲: ۵۲

{قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ }[1]

ترجمہ: اے نبی ﷺ ! کہہ دیجیئے! میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب جانتا ہوں۔

{وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ }[2]

ترجمہ: اور اگر میں (محمد ﷺ) غیب جانتا ہوتا تو بہت سارے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔

{قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّىْٓ اَمَدًا}[3]

ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ! کہہ دیجیئے! میں نہیں جانتا کہ کیا قریب ہے جس چیز کا تم سے وعدہ ہوا ہے، یا کر دے میرا رب اس کو ایک مدت کے بعد۔

{قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًامِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِیْ مَا يُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ }[4]

ترجمہ: کہہ دیجئے اے پیغمبر ﷺ کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور نہ ہی تیرے ساتھ۔

کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی ﷺ کو کائنات کے تمام امور میں اللہ کی مشیت یعنی مرضی کو بدلنے پر مکمل اختیار ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

{اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ} [5]

ترجمہ: اس ہی کے لیے آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت ہے اور اس کا کوئی بیٹا نہیں اور اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں۔

اللہ فرماتا ہے:

{قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ} [6]

ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ کہہ دیجیے! انہیں پکارو جن کو تم اللہ کے علاوہ اللہ کی صفات کا مالک کا خیال کرتے ہو۔ وہ زمین اور آسمانوں میں ایک ذرہ بھر کے بھی ملکیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی ان دونوں میں اللہ کے ساتھ شراکت ہے اور ان میں سے نہ ہی کوئی اللہ کا مددگار ہے۔

---

1 سورۃ الانعام ۶ : ۵۰

2 سورۃ الاعراف ۷: ۱۸۸

3 سورۃ الجن ۷۲ : ۲۵

4 سورۃ الاحقاف ۴۶: ۹

5 سورۃ الفرقان ۲۵ : ۲

6 سورۃ سبا ۳۴ : ۲۲

ان آیات سے ثابت ہو گیا کہ کائنات کا مالک صرف اللہ ہے اور اللہ کی خدائی میں کوئی شریک نہیں، لہٰذا محمد ﷺ کو اللہ کی خدائی میں شریک ماننا شرک فی الصفات ہے۔اسی طرح محمدؐ کو اللہ کی مشیت اور مرضی پر کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے، اللہ فرماتا ہے:

{قُلْ لَّا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَاءَ اللہ }[1]

ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ ! کہہ دیجئے! میں اپنی ذات کے لیے اختیار نہیں رکھتا، نہ نقصان کا اور نہ ہی نفع کا مگر جو اللہ چاہے۔

{اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ} [2]

ترجمہ: اے نبی ﷺ آپؐ ہدایت نہیں دے سکتے جس سے آپؐ محبت کریں لیکن اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جسے چاہے۔

{وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُھُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَاءِ فَتَاْتِیَھُمْ بِاٰیَۃٍ}[3]

ترجمہ: اور اگر آپؐ پر گراں گزرتا ہے ان کفار اور مشرکین کا اعراض کرنا، سو اگر آپؐ کی استطاعت ہے کہ ڈھونڈ نکالو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں، سو ان کے پاس ایک معجزہ لے آؤ۔

{قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَمِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا}[4]

ترجمہ: کہہ دو میں نہ تمہارے کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ کہہ دو مجھے اللہ سے کوئی نہیں بچا سکے گا اور نہ مجھے اس کے سوا پناہ ملے گی۔

درج بالا آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مختار کل محض اللہ ہی کی ذات ہے، اور محمدؐ کو مختار کل کہنا اور سمجھنا شرک فی الصفات ہے۔اسی طرح کچھ لوگوں کا ماننا اور عقیدہ ہے کہ محمد ﷺ فوت نہیں ہوئے بلکہ دنیا سے پردہ فرما گئے ہیں، اور وہ دنیا میں اپنے عاشقوں میں حاضر اور امت کے حالات واعمال کے ناضر ہیں۔قرآن میں جگہ جگہ اللہ فرماتا ہے:

{وَھُوَمَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ وَاللہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْر} [5]

ترجمہ: "اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے"۔

{مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلَاثَۃٍ،اِلَّاھُوَ رَابِعُھُمْ، وَلَاخَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَسَادِسُھُمْ، وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ ،اَیْنَ مَا کَانُوْا ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ}[6]

---

1 سورۃ یونس ۱۰ : ۴۹

2 سورۃ القصص ۲۸ : ۵۶

3 سورۃ الانعام ۶: ۳۵

4 سورۃ الجن ۷۲ : ۲۲

5 سورۃ الحدید ۵۷ : ۴

6 سورۃ المجادلۃ 58 : 7

ترجمہ: جو کوئی مشورہ تین بندوں میں ہوتا ہے تو چوتھا وہ ہوتا ہے اور جو پانچ بندوں میں ہوتا ہے تو چھٹا وہ ہوتا ہے اور خواہ اس سے کم لوگوں کا مشورہ ہو یا ذیادہ کی تو اللہ ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتا ہے پھر انہیں قیامت کے دن بتلادے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر قائم ہیں لیکن اللہ کے علم نے تمام کائنات کا احاطہ کرر کھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے لحاظ سے ہر جگہ حاضر ہیں اور تمام کائنات کے ناظر ہیں ان آیات سے ثابت ہوا، کہ حاضر و ناظر صرف اللہ کی ذات ہے، لہٰذا اللہ کی اس صفت میں محمدؐ کو شریک کرنا شرک فی الصفات ہے۔ صحیح حدیثوں سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ محمد ﷺ فوت ہو کر جنت میں اپنے مقام پر جا چکے ہیں اور جو فوت ہو جائے وہ حاضر و ناضر نہیں ہو سکتا۔ محمدؐ کی وصال کے اثبات میں قرآن کی یہ آیات واضح ثبوت ہیں ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ}[1]

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے نہیں دیا، پھر کیا اگر تو مر گیا تو وہ رہ جائیں گے۔

{اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْن} [2]

ترجمہ: یقیناً آپؐ نے بھی مرنا ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے۔

{وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ ، اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ، فَاِنَّمَاعَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَاالْحِسَابُ}[3]

اور اگر ہم تجھے کوئی وعدہ دکھادیں جو ہم نے ان سے کیا ہے یا تجھے اٹھالیں، سو تمہاری ذمہ داری پہنچانا ہے اور ہماری ذمہ داری حساب لینا ہے۔

{وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا}[4]

ترجمہ: اور محمدؐ تو ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت رسول گزر چکے، پھر کیا اگر وہ فوت ہو جائے یا قتل کیا جائے تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی بھی الٹے پاؤں پھر جائے گا تو اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔

{اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىٓ اٰيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَااَفَمَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِىٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ}[5]

---

1 سورۃ الانبیاء ۲۱ : ۳۴

2 سورۃ الزمر ۳۹ : ۳۰

3 سورۃ الرعد ۱۳ : ۴۰

4 سورۃ آل عمران ۳: ۱۴۴

5 سورۃ حٰم سجدہ ۴۱ : ۴۰

ترجمہ: ''جو لوگ ہماری آیتوں میں کج راہی کرتے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بھلا جو شخص دوزخ میں ڈالا جائے وہ بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن وامان سے آئے، جو چاہو سو کرلو۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔''

درج بالا تمام آیات کو مد نظر رکھ کر جن لوگوں کی محمد ﷺ کے بارے میں غلط عقائد ہے، ان کی قرآن اور صحیح احادیث کی روشنی میں اصلاح کرنی چاہیے۔

تصور آخرت کی تجدید:

آخرت: لغت میں لفظ آخرت کا معنی ہے بعد میں آنے والی چیز۔ شریعت کی اصطلاح میں آخرت سے مراد یہ ہے کہ یہ دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی اور مرنے کے بعد ایک دن ہر جاندار کو دوبارہ اٹھایا جائے گا، اور ان کے دنیاوی اعمال کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جائے گا نیکوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں اور بدکاروں کو اپنے عدل سے جہنم میں داخل فرمائے گا اس بات پر کسی شک وشبہ کے بغیر یقین رکھنے کو عقیدہ آخرت کہتے ہیں۔

آخرت اور دوبارہ زندہ ہونے کے عقیدے کے سلسلہ میں دنیا میں بہت سے اختلافات ہے، کچھ لوگ اس کو مانتے ہی نہیں اور کچھ اس کو مانتے ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت چوں کہ اپنی اصل میں الہامی مذہب تھے اگرچہ بعد میں ان دونوں مذاہب میں مشرکین کے عقائد آئے، اس لیے ان کے یہاں آخرت کا تصور ہے، مگر بعد میں اس مذہب کے ماننے والوں نے اپنے ایمان کے ارکان سے اس کو خارج کردیا۔

حق یہ کہ آخرت کے عقیدہ کی تفصیل جو قرآن اور حدیث میں وارد ہے وہی صحیح اور حق ہے۔ اسی لیے ایمان بالآخرۃ اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک اسلامی عقیدہ کو اختیار نہ کیا جائے۔

توحید ورسالت کے بعد آخرت اسلام کا تیسرا اہم اور بنیادی عقیدہ ہے آخرت کے تعلق سے تمام انبیاء کرام کی تعلیمات ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ دنیا ایک جائے آزمائش ہے اور اللہ نے ہمیں اس میں آزمائش کے لیے بھیجا ہے کہ کون ایمان لا کر اچھے اعمال کرتا ہے اور کون کفر و شرک اختیار کرکے عذاب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے جس طرح اللہ نے ہمیں اس دنیا میں پیدا کیا اسی طرح وہ ہمیں مرنے کے بعد روز آخرت میں دوبارہ زندہ کرے گا اور ہم سب اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہوں گے تو جس نے انبیاء کرام کی تعلیمات پر ایمان کو اپنایا، ان کی اطاعت و فرمابرداری کی اور دنیا کی زندگی میں نیک اعمال کیے وہ آخرت میں کامیاب ہوگا جس نے نافرمانی کی وہ ناکام و نامراد ہوگا، پس مطیع و فرماں بردار جنت اور کافر و نافرمان جہنم میں جائیں گے۔ قرآن مجید میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:

{قُلِ اللہُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ}[1]

---

1 سورۃ جاثیۃ ۴۵: ۲۶

ترجمہ: تم فرماؤ اللہ تمہیں جِلاتا ہے پھر تم کو مارے گا پھر تم سب کو اکٹھا کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں لیکن بہت آدمی نہیں جانتے۔

دراصل یہ آیت ان لوگوں کے رد میں نازل کی گئی جو آخرت اور بعث بعد الموت کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں بعض مرتے اور بعض پیدا ہوتے ہیں، ہمیں ہلاک نہیں کرتا ہے مگر زمانہ یعنی روز و شب کا دورہ اسی کو مؤثر اعتقاد کرتے تھے اور ملک الموت کا اور بحکمِ الٰہی روحیں قبض کیے جانے کا انکار کرتے تھے اور ہر ایک حادثہ کو دہر اور زمانہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

انسان کی تخلیق اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں اللہ ارشاد فرماتا ہے ہے:

{مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرَىٰ} [1]

ترجمہ: ہم نے زمین ہی سے تمہیں بنایا اور اسی میں تمہیں پھر لے جائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔

اب ذیل میں ہم ان دلائل کا تذکرہ کریں گے جو قرآن میں وقوع آخرت کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے

{كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُودُونَ} [2]

ترجمہ: جیسے اس نے تمہارا آغاز کیا ویسے ہی پلٹو گے۔

یعنی جیسے اس نے تمہیں نیست سے ہست کیا ایسے ہی موت کے بعد بھی زندہ فرمائے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

{وَ يَقُولُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا} [3]

ترجمہ: اور بندہ کہتا ہے کہ جب مجھے موت آجائیگی تو عنقریب میں قبر سے دوبارہ نکالا جاؤں گا، اور اس کو یہ یاد نہیں کہ پہلی دفعہ جب یہ نہیں تھا تو میں نے اس کو بنایا تھا؟

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جب اس دنیا میں انسان کا کوئی وجود نہ تھا وہ کچھ بھی نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے وجود بخشا، دنیا میں انسان کا موجود ہونا اس بات کا بین دلیل ہے۔ اللہ نے جس طرح سے انسان کو پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ پیدا فرمائے گا۔ کوئی آدمی کسی انسان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب اس نے کوئی کام ایک مرتبہ کر لیا ہے تو دوبارہ اسے انجام نہیں دے سکتا۔ آج دنیا اتنی زیادہ ترقی کر چکی ہے کہ انسان بہت سارے کام ٹیکنالوجی کے ذریعہ کر رہا ہے، آج دنیا میں جو کمپیوٹر استعمال کیے جا رہے ہیں اس کے بارے میں کوئی یہ کہہ نہیں سکتا کہ اس کے بنانے والے اسے دوبارہ نہیں بنا سکتے ۔ اللہ نے جسے

---

1 سورۃ طٰہٰ ۲۰ : ۵۵

2 سورۃ الاعراف ۷: ۲۹

3 سورۃ مریم ۱۹ : ۶۶،۶۷

جس حال میں جہاں چاہا پیدا کیا، اسے کوئی روکنے والا نہیں، جب چاہتا ہے موت دیتا ہے اور جب چاہے گا دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا کوئی اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

{اَوَلَمْ یَرَ الْاِنسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہ مِن نُّطْفَةٍ فَاِذَا ھُوَ خَصِیمٌ مُّبِینٌ وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَه قَالَ مَنْ یُّحْیِي الْعِظَامَ وَ ھِیَ رَمِیمٌ قُلْ یُحْیِیھَا الَّذِیَ اَنشَاَھَااَوَّلَ مَرَّةٍ وَ ھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیم}[1]

ترجمہ: اور کیا بندے نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفے سے بنایا جبھی وہ صریح جھگڑالو ہے۔ اور ہمارے لئے کہاوت کہتا ہے اور اپنی پیدائش بھول گیا، بولا ایسا کون ہے کہ ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں۔ تم فرماؤ انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں بنایا اور اسے ہر پیدائش کا علم ہے۔

یہ آیت اُبی بن خلف کے حق میں نازل ہوئی جو انکارِ بعث یعنی مرنے کے بعد اٹھنے کے انکار میں رسول اللہ ﷺ سے بحث و تکرار کرنے آیا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک گلی ہوئی ہڈی تھی اس کو توڑتا جاتا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے کہتا جاتا تھا کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ اس ہڈی کو گل جانے اور ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ زندہ کرے گا؟ رسول اللہؐ نے فرمایا، ہاں اور تجھے بھی مرنے کے بعد اٹھائے گا اور جہنّم میں داخل فرمائے گا اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور اس کے جہل کا اظہار فرمایا گیا کہ گلی ہوئی ہڈی کا بکھرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت سے زندگی قبول کرنا اپنی نادانی سے ناممکن سمجھتا ہے، کتنا احمق ہے اپنے آپ کو نہیں دیکھتا کہ ابتدا میں ایک گندہ نطفہ تھا گلی ہوئی ہڈی سے بھی حقیر تر، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ نے اس میں جان ڈالی، انسان بنایا ، تو ایسا مغرور و متکبّر انسان ہوا کہ اس کی قدرت ہی کا منکر ہو کر جھگڑنے آگیا، اتنا نہیں دیکھتا کہ جو قادرِ برحق پانی کی بوند کو قوی اور توانا انسان بنا دیتا ہے اس کی قدرت سے گلی ہوئی ہڈی کو دوبارہ زندگی بخش دینا کیا بعید ہے اور اس کو ناممکن سمجھنا کتنی کھلی ہوئی جہالت ہے۔

{اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدی اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ یُّمْنٰی ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَینِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی اَلَیسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰی اَن یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی}[2]

ترجمہ: یا آدمی اس گھمنڈ میں ہے کہ آزاد چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ ایک بوند نہ تھا اس منی کا کہ گرائی جائے۔ پھر خون کی پھٹک ہوا تو اس نے پیدا فرمایا، پھر ٹھیک بنایا، تو اس سے دو جوڑ بنائے مرد اور عورت ، کیا جس نے یہ کچھ کیا وہ مردے نہ جِلا سکے گا۔

مذکورہ بالا آیات کے اندر انسان کو اس کی تخلیق یاد دلا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ جس خالق کائنات نے تمہیں پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیا اور زندگی عطا کی، وہی ہے جو تمہاری ہڈیوں کو جب اس کی مرضی ہوگی دوبارہ زندہ فرمائے گا اور میدان محشر

---

1 سورۃ یٰسٓ ۳۶: ۷۷،۷۸،۷۹

2 سورۃ القیامۃ ۷۵: ۳۶،۳۷،۳۸،۳۹،۴۰

میں جمع فرمائے گا۔ انسان کو اس بات پر تدبر کرنا چاہیے کہ آنے والی نسلوں کے جسموں کے ذرات زمین ہی میں ہے، تو پھر ایک ذات ہے جو ان ذرات کو جمع کر کے ہمہ وقت تخلیق کا کام انجام دے رہی ہے۔ دنیا میں جتنی بھی مخلوق پائی جاتی ہے ان کی اولادوں کو آنِ واحد میں پیدا کرنے والی ایک ذات ہے۔ جو مخلوق دنیا سے گذر گئی، اللہ ان سب کے جسموں کے ذرات کو ایک ہی وقت میں جمع کرنے پر قادر ہے۔ وہ تو آج کے ترقی یافتہ انسان کو قرآن میں یہ فرما رہا ہے کہ جن finger prints کو آج کے جدید دور میں تم اپنی شناخت کے لیے استعمال کر رہے ہو، میں ان کو بھی ویسا ہی بناؤں گا اور ہر ایک کو اس کی پوری شناخت کے ساتھ اٹھاؤں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

{اَیَحْسَبُ الْاِنسَانُ اَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَه بَلٰی قٰدِرِینَ عَلٰی اَن نُّسَوِّیَ بَنَانَه}[1]

ترجمہ: کیا آدمی سمجھتا ہے کہ ہم ہر گز اس کی ہڈیاں اکٹھی نہ کر پائیں گے، کیوں نہیں ہم قادر ہیں کہ اس کے پور ٹھیک بنا دیں۔

یعنی اس کی انگلیاں جیسی تھیں بغیر فرق کے ویسی ہی کر دیں اور ان کی ہڈیاں ان کے موقع پر پہنچا دیں، جب چھوٹی چھوٹی ہڈیاں اس طرح ترتیب دے دی جائیں تو بڑی کا کیا کہنا۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ تمہاری طرح کچھ ارب انسانوں کو پیدا کرنا پھر قیامت میں دوبارہ زندہ کرنا اس کے لیے ایسے ہی ہے جیسے کسی ایک کو زندہ کرنا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

{مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ}[2]

ترجمہ: تم سب کا پیدا کرنا اور قیامت میں اٹھانا ایسا ہی ہے جیسا ایک جان کا۔

اللہ پر کچھ دشوار نہیں اس کی قدرت یہ ہے کہ ایک کُن سے سب کو پیدا کر دے۔

چناں چہ ارشاد ربانی ہے۔

{وَ قَالُوٓاءَاِذَاكُنَّاعِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّالَمَبْعُوثُونَ خَلْقًاجَدِیدًا قُل كُونُواحِجَارَةً اَوْ حَدِیدًا اَوْخَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِی صُدُورِكُمْ فَسَیَقُولُونَ مَن یُّعِیدُنَا قُلِ الَّذِی فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَیُنْغِضُونَ اِلَیكَ رُءُوسَهُمْ وَ یَقُولُونَ مَتٰی هُوَ قُلْ عَسٰی اَن یَّكُونَ قَرِیبًا یَوْمَ یَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِیبُونَ بِحَمْدِه وَ تَظُنُّونَ اِن لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیلًا}[3]

ترجمہ: ''اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے پھر نئے بن کر اٹھیں گے کہہ دو تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ، یا کوئی اور چیز جسے تم اپنے دلوں میں مشکل سمجھتے ہو، پھر وہ کہیں گے ہمیں دوبارہ کون لوٹائے گا، کہہ دو وہی جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے، پھر تمہارے سامنے سروں کو ہلا کر کہیں گے کہ وہ کب ہو گا، کہہ دو شاید وہ وقت بھی قریب آ گیا ہو، جس دن تمہیں پکارے گا پھر اس کی تعریف کرتے ہوئے چلے آؤ گے اور خیال کرو گے کہ بہت ہی کم ٹھہرے تھے''۔

---

1 سورۃ القیامۃ ۷۵: ۳،۲

2 سورۃ لقمان ۳۱ : ۲۸

3 سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۵۲،۵۱،۴۹،۵۰

آخرت کا انکار کرنے والوں نے بہت تعجب کے ساتھ یہ بات کہی تھی اور مر کر خاک میں مل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو بعید سمجھ لیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات میں ان کا رد فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

{اَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ} [1]

ترجمہ: ''کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے میں تھک گئے ہیں، (نہیں) بلکہ وہ از سرِ نو پیدا کرنے کے متعلق شک میں ہیں''۔

قرآن کریم اس سلسلے میں انسان کی سمجھ کے لیے ایک اور دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ دوسری دفعہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ کرنے کے بنسبت زیادہ آسان ہے کیوں کہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب کوئی کام پہلی دفعہ کیا جائے تو وہ مشکل ہوتا ہے لیکن جب ایک دفعہ کوئی کام سیکھ لیا جائے یا اسے کر لیا جائے تو وہ کام دوسری بار یا تیسری بار کرنا زیادہ آسان ہے بنسبت پہلی بار کے۔ اسی مفہوم کو قرآن کریم میں یوں بیان فرمایا ہے۔

{اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُه اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ} [2]

ترجمہ: ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو بناتا ہے پھر اس کو لوٹا دے گا، بے شک یہ اللہ پر بہت آسان ہے''

{وَ هُوَ الَّذِى يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُه وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيه} [3]

ترجمہ: اور وہی ہے کہ اوّل بناتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا اور یہ تمہاری سمجھ میں اس پر زیادہ آسان ہونا چاہیے۔

قرآن کریم اس تعلق سے ایک اور دلیل بیان کرتا ہے جس کے اندر ان لوگوں کو خطاب کیا گیا بطور عتاب جو بعث بعد الموت کے منکر تھے اور ان سے کہا گیا کہ تمہاری پیدائش زیادہ مشکل ہے یا آسمان وزمین اور وہ تمام چیزیں جو اللہ نے پیدا کر رکھی ہے۔ چناں چہ اللہ فرماتا ہے۔

{ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا وَ اَغْطَشَ لَيلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا} [4]

ترجمہ: ''کیا تم کو پیدا کرنا بڑی بات ہے یا آسمان کو جس کو ہم نے بنایا ہے، اس کی چھت بلند کی اور پھر اس کو سنوارا اور اس کی رات اندھیری کی اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔''

یقیناً آسمان اور اس میں جو کچھ ہے ان سب کا بنانا، زمین میں جو کچھ ہے ان سب چیزوں کا بنانا زیادہ مشکل ہے بنسبت انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ اسے بنانے کے، کیوں کہ اللہ نے آسمان کو بنایا پھر بغیر ستون کے اس کی چھت اونچی رکھی اس طرح کہ کہیں کوئی خلل نہیں۔

---

1 سورۃ ق ۵۰ : ۱۵

2 سورۃ العنکبوت ۲۹: ۱۹

3 سورۃ الروم ۳۰ : ۲۷

4 سورۃ النازعات ۷۹: ۲۸،۲۷،۲۹

{فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَم مَّنْ خَلَقْنَا اِنَّا خَلَقْنٰهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ}[1]

ترجمہ: تو ان سے پوچھو کیا ان کی پیدائش زیادہ مضبوط ہے یا ہماری اور مخلوق آسمانوں اور فرشتوں وغیرہ کی بیشک ہم نے ان کو چپکتی مٹی سے بنایا۔

تو جس قادرِ برحق کو آسمان و زمین جیسی عظیم مخلوق کا پیدا کرنا کچھ بھی مشکل اور دشوار نہیں تو انسانوں کا پیدا کرنا اس پر کیا مشکل ہو سکتا ہے۔ یہ ان کے ضعف کی ایک اور شہادت ہے کہ ان کی پیدائش کا اصل مادّہ مٹی ہے جو کوئی شدّت و قوّت نہیں رکھتی اور اس میں ان پر ایک اور برہان قائم فرمائی گئی ہے کہ چپکتی مٹی ان کا مادّۂ پیدائش ہے تو اب پھر جسم کے گل جانے اور غایت یہ ہے کہ مٹی ہو جانے کہ بعد اس مٹی سے پھر دوبارہ پیدائش کو وہ کیوں ناممکن جانتے ہیں مادّہ موجود اور صانع موجود پھر دوبارہ پیدائش کیسے محال ہو سکتی۔اس کے بعد خود قرآن کریم میں اس کا جواب دیا گیا کہ زمین و آسمان کی تخلیق انسان کی پیدائش سے کہیں زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

{لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ} [2]

ترجمہ: بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش آدمیوں کی پیدائش سے بہت بڑی لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ آیت منکرینِ بعث کے رد میں نازل ہوئی ان پر حجّت قائم کی گئی کہ جب تم آسمان و زمین کی پیدائش پر باوجود ان کی اس عظمت اور بڑائی کے اللہ تعالیٰ کو قادر مانتے ہو تو پھر انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا اس کی قدرت سے کیوں بعید سمجھتے ہو۔ بہت لوگوں سے مراد یہاں کفّار ہیں اور ان کے انکارِ بعث کا سبب ان کی بے علمی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی پیدائش پر قادر ہونے سے بعث پر استدلال نہیں کرتے تو وہ مثل اندھے کے ہیں اور جو مخلوقات کے وجود سے خالق کی قدرت پر استدلال کرتے ہیں وہ مثل بینا کے ہیں۔

ایمان بالآخرۃ اور اس کے اجزاء بعث بعد الموت: مرنے کے بعد انسان کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے پھر وقت آنے پر تمام انسانوں کو ان کی قبروں سے نئی زندگی کے ساتھ اٹھایا جائے گا، ان کی حواس، فہم و فراست اور بصیرت سب کچھ ٹھیک ہو گی ان کا جسم پہلے کی طرح صحیح و سالم ہو گا، الغرض ایک بار پھر زندگی کے تقاضوں کو پورا کیا جائے گا اور اس حالت میں ہر شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو گا۔[3]

---

1 سورۃالصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۱

2 سورۃالمومن ۴۰: ۵۷

3 http://www.urdumajlis.net

بعث بعد الموت اور قرآنی استدلال:

ایمان بالآخرۃ کا پہلا جز بعث بعد الموت ہے بطور آخرت کے اسی اہم جز کا قرآن مجید میں مختلف مقامات پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ چناں چہ اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔

{يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيعًافَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا}[1]

ترجمہ: ''جس دن اللہ ان تمام لوگوں کو قبروں سے باہر نکالے گا پھر ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔''

اس طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

{اِن كُلُّ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا}[2]

ترجمہ: ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان میں سے ایسا کوئی نہیں جو رحمان کا بندہ بن کر نہ آئے''۔

قیامت کے دن اٹھنے کے بعد ہر شخص کو اس بات کا پورا شعور اور احساس ہو گا کہ وہ وہی شخص ہے جو دینا میں فلاں اچھائی یا نیکی کرتا تھا اس طرح سے اس کو اپنی گذشتہ اور موجودہ شخصیت کے ایک ہونے کا پوری طرح احساس ہو گا۔ ہر شخص کو اپنی اور اپنے نفس کی پوری پوری پہچان ہو گی، چناں چہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

{ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ}[3]

ترجمہ: پھر انہیں قیامت کے دن بتادے گا جو کچھ انہوں نے کیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام اولین وآخرین کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا پھر انہیں ان اعمال کے بارے میں بتادے گا جو دنیا میں انہوں نے کیا، کیوں کہ صرف زندہ کرنا بالذات کوئی مقصد نہیں، بلکہ انہیں بتایا جائے گا کہ انہوں نے دنیا میں رہ کر کیا عمل کیا اور کیا نفع ونقصان اٹھایا؟ اس طرح سے ہر شخص کو یہ بھی بتادیا جائے گا کہ اس نے فلاں نیکی کی ہے، تو اس کا بدلہ اچھا ہے اور برائی کی ہے تو اس کا بدلہ برا ہے۔ (سزا و جزا افراد کی زندگی میں بے حد ضروری ہے کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان دنیا کے اندر اپنے نفس کے تابع ہو کر بہت سارے اعمال، احکام الٰہی کے خلاف کرنے لگے گا اور مقصد تخلیق کو فوت کردے گا ،انسان کے اندر اس کی سابقہ زندگی میں ہونے والے تمام اعمال کا احساس پیدا کردیا جائے گا اور یہ تمام چیزیں اس لیے ہو گی کہ ہر انسان اس وقت خود کو پہچان رہا ہو گا۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

{هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ}[4]

---

1 سورۃ المجادلۃ ۵۸ : ۶

2 سورۃ مریم ۱۹: ۹۳

3 سورۃ المجادلۃ ۵۸ : ۷

4 سورۃ یونس ۱۰: ۳۰

ترجمہ: یہاں ہر جان جانچ لے گی جو آگے بھیجا۔

یعنی اس موقف میں سب کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں رہ کر جو اعمال کیے تھے وہ کیسے تھے اچھے یا برے مفید یا مضر، اس دن لوگوں کی عینیت کے شعور کا عالم یہ ہو گا کہ ان کے اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ چناں چہ ارشاد خداوندی ہے۔
{يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيدِيهِمْ وَ اَرْجُلُهُم بِمَا كَانُو يَعْمَلُونَ}[1]

ترجمہ: ''جس دن ان پر ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ وہ دنیا میں کیا کرتے تھے''۔

عقیدہ آخرت کے ضمن میں قرآن کریم نے ہمارے سامنے ایسے دلائل رکھے ہیں کہ اگر ان پر غیر جانب دارانہ انداز سے غور کیا جائے تو ہر انسان اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ آخرت کا وقوع پذیر ہونا لازمی ہے۔ یوں تو قرآن آخرت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے لیکن کچھ چیزوں کی میں یہاں وضاحت کرونگا:

اس کائنات میں اللہ نے ہر چیز زوجین یعنی جوڑوں کی شکل میں بنائی ہے، لیکن یہ ایک ہی حقیقت کے دو اجزاء ہوتے ہیں اور دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حصے میں جو کمزوری ہوتی ہے، دوسرا حصہ اسے پورا کرتا ہے۔ اگر ایک حصے میں کوئی خلا ہے تو وہ دوسرے حصے سے پر ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال خود انسان ہے۔ یہ معاملہ زندگی کے ان دو اجزاء کا بھی ہے یعنی دنیا اور آخرت۔ یہ دنیا پکار پکار کر ہمیں متوجہ کر رہی ہے کہ یہ نامکمل اور نا تمام ہے۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی پر غور کریں۔ یہاں اسے صرف ستر اسی سال کی زندگی ملی ہے لیکن اس ستر اسی سال کے مقابلے میں اس کے دل کی تمنائیں اتنی غیر معمولی ہیں کہ وہ ہزاروں لاکھوں سالوں میں بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ چاہتا ہے کہ لاکھوں میل کا فاصلہ چشم زدن میں طے کرے۔ اس کی آنکھوں کروڑوں میل دور دیکھ سکیں۔ اس کے کان، کائنات کی ہر آواز سن سکیں۔ پھر یہ کہ انسان مرنا نہیں چاہتا، وہ حیات جاودانی چاہتا ہے۔ ابدی زندگی اس کا سب سے بڑا خوف ہے۔ زندگی اس کے لیے سب سے بڑی خوشی اور موت اس کے لیے سب بری خبر ہے، اسی لیے اس کی پیدائش پر خوشی کے شادیانے بجتے ہیں اور اس کی موت پر ماتم ہوتا ہے۔ موت سے بڑھ کر انسان کسی چیز سے گریز نہیں کرتا، مگر یہ موت اس دنیا کی زندگی کی اٹل حقیقت ہے، گویا پیاس تو موجود ہے مگر پانی نہیں۔ دنیا کی زندگی اتنی نامکمل ہے کہ ایک انسان کافی مدت صرف کر کے کچھ علم و ہنر حاصل کر لیتا ہے، اپنے سامنے کام کے بے شمار منصوبے بنا لیتا ہے کہ ایک بیک فرشتہ اجل آکر اس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیتا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے رب کے حضور میں جا پہنچتا ہے۔

ایک اور پہلو سے غور کیجئے اس دنیا میں ہر انسان کی دلی تمنا یہ ہے کہ یہاں کامل عدل و انصاف ہو۔ یہ انسان کی ازلی اور لازوال تمنا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ فرد اور معاشرہ دونوں انصاف کریں۔ اسی انصاف کے لیے وہ ریاست قانون،

---

1 سورۃالنور ۲۴ : ۲۴

عدالت اور پولیس کے سارے ضابطے بھی تسلیم کرتا ہے لیکن ہم اس حقیقت سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں کہ اس ناتمام دنیا میں کامل انصاف ناممکن ہے۔اس دنیا میں انسان سب سے بڑھ کر ظلم سے نفرت کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ظالم کو اس کے کیے کی پوری سزا ملے۔ یہاں دولت و قوت کے نشے میں فرعون، ہامان، ہٹلر اور میسولینی جیسے حکمران ہزاروں، لاکھوں انسانوں پر ظلم کا باعث بنتے ہیں، مگر یہ بھی اس دنیا کا عجیب سلسلہ ہے کہ اول تو بڑے بڑے مجرم گرفت میں آتے ہی نہیں اور اگر آبھی جائیں تو ان کو جرم کی مناسب سے سزا ہی نہیں جا سکتی[1]۔

گویا اس دنیا کی زندگی کا ہر معاملہ پکار پکار کر یہ اعلان کر رہا ہے کہ یہ ناتمام اور ناقص ہے۔اس کا ایک ایسا جوڑا ہونا چاہیے، جہاں ابدی زندگی ہو، جہاں موت کو موت آجائے، جہاں انسان کی صلاحیتیں غیر معمولی ہو جائیں، جہاں کامل انصاف ہو، جہاں ظلم کا پورا پورا بدلہ دیا جا سکے۔ چنانچہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جس طرح ہر چیز جوڑا جوڑا ہے،اسی طرح اس دنیا کا جوڑا آخرت ہے، دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی مل کر ایک حقیقت بن جاتے ہیں۔ گویا زندگی کے دو رخ ہیں،ایک عارضی اور دوسرا ابدی۔ عارضی زندگی کی ساری ناتمامیاں ابدی زندگی میں جا کر پوری ہو جاتی ہیں۔

یہ وسیع و عریض کائنات، زمین کے علاوہ، بالکل زندگی کے بغیر ہے۔ زمین سے لاکھوں گنا بڑے کرے، محض مادے کے بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت میں پڑے ہوئے ہیں،اور بظاہر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک کرہ یعنی ہماری زمین آباد ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کائنات کا غرض و غایت صرف یہی ہے کہ جب رات ہو تو آسمان پر تارے چمکیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ اس کائنات سے کچھ اور مقصود ہو۔ قرآن سے ہمیں معلومات ملتی ہے کہ یہ مستقبل کے جنت اور جہنم کا تعمیری مواد ہے۔ قیامت کے بعد جنت اور جہنم دونوں کے لیے ایک وسیع کائنات کی ضرورت ہو گی ۔اس وقت اس تعمیری مواد سے نئے قوانین کے تحت نئے آسمان اور نئی زمینیں بنائی جائیں گی، گویا ان عظیم کروں کی آبادی کے لیے ایک دوسرا زمانہ منتظر ہے۔ اب جس کا جی چاہے،اس کائنات کو دیکھ کر اسکی مقصدیت کو سمجھ لے۔ آخرت نہ ہو تو پھر یہ ساری کائنات دفتر بے معنی ہے[2]۔

قرآن مجید ہم کو یہ دلیل دیتا ہے کہ دنیا میں ہر انسان نیکی و بدی کا واضح تصور رکھتا ہے۔ کچھ بنیادی سچائیاں ہیں، جنہیں عالمی سطح پر ہمیشہ سے تسلیم کیا گیا ہے،اور کچھ بنیادی برائیاں ہیں، جنہیں انسان کے اجتماعی ضمیر نے ہمیشہ رد کیا ہے۔ مثلاً انسان نے ہمیشہ امانت، انصاف صلہ رحمی، بھائی چارے، رشتہ داروں، دوستوں ہمسایوں اور عزیزوں کے حقوق، محنت، وعدے کی پابندی، امن، عفو و در گزر اور حسن سلوک کو نیکی اور اچھائی قرار دیا ہے۔اس طرح انسان نے قتل، چوری، ڈاکہ، غیبت، عیب

---

1 مذہب اور جدید چیلنج، ص ۱۲۱

2 مذہب اور جدید چیلنج، ص: ۱۲۳

جوئی، جھوٹ، مکر وفریب، ناپ تول میں کمی دھوکہ، ظلم، اسراف، بخل، حسد، بدامنی اور گالی گلوچ کو برائی قرار دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس دنیا میں انسان ہر وقت جزاو سزا کے معاملات طے کرتا ہے۔ ہر لمحے فیصلہ کرتا ہے، کہ یہ بات ٹھیک ہے، اور یہ غلط ہے۔ ہماری عدالتیں، قوانین ضابطے، پولیس اور حکومتیں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ تمام انسانیت ان تصورات کی حامل ہے اور اس لیے جزااور سزا برحق ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر حیران کرنے والی بات یہ کہ ہر انسان کے قلب میں ایک عجیب چیز موجود ہے۔ لہٰذا جب بھی انسان غلط کام کرتا ہے، تو اس کے قلب کے اندر یہ آواز سے ٹوکتی ہے کہ تم نے اچھا نہیں کیا اور انسان کو بہت ندامت محسوس ہوتی ہے۔ یہی آواز انسان سے کہتی ہے کہ تم آئندہ ایسا مت کرو۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہم ضمیر کے نام سے جانتے ہیں اور قرآن کریم، نفس لوامہ کہتا ہے۔ گویا ہر انسان کے دل میں خفیہ محتسب بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے اپنے اندر ایک داعی ہے جو اسے صحیح راستے کی طرف بلاتا ہے اور ہر غلطی پر ٹوکتا ہے۔ بے شک انسان پر اپنے جذبات اور خواہشات غالب ہو کر گناہ بھی کر بیٹھتا ہے، مگر وہ اس گناہ کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا، انسان کے اندر کا مخفی زاجر اسے ہر غلط کام کرنے پر ملامت کرتا ہے۔ اس ملامت گر کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اس دنیا میں شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑا گیا۔ انسان عالم اصغر ہے۔ اس کے اندر ضمیر کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ عالم اکبر اس کائنات میں نیکی و بدی پر جزاو سزا کا ایک وقت آنے والا ہے، اسی کو ہم قیامت کہتے ہیں۔ یہ ان تمام لوگوں کو ان کی بداعمالیوں پر سزا کا دن ہوگا۔ جنہوں نے اپنے اندر کی آواز کا کہا نہیں مانا تھا۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ نفس لوامہ انسان کو اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اچھے اور برے میں فرق کر سکے، گویا قیامت کی عدالت کا عکس ہر انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔ اگر قیامت نہ ہوتی تو پھر ضمیر کو وجود بے معنی تھا۔ یہی ضمیر انسان کو ہر وقت یہ احساس دلاتا ہے کہ نیکی و بدی برابر نہیں ہیں، اس لیے نتیجے کے اعتبار سے انہیں برابر ہونا بھی نہیں چاہیے۔ قرآن کریم کا ایک اور ثبوت یہ ہے، کہ اگر ہم خدا کو مانتے اور اس بات پر ایمان رکھتے ہوں کہ اس کی بنائی ہوئی کائنات میں بڑی حکمت اور قدرت پوشیدہ ہے اور اس بات سے بھی واقف ہوں کہ خدا بہت رحیم ہے، اس نے ہمیں زندگی اور بے بہا نعمتیں دیں، ہمیں عقل و شعور دیا، جس کے بے شمار نتائج بھی اس دنیا میں نکل رہے ہیں، تو پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ بالکل بے مقصد ہے اور خدا ہم سے اس کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں پوچھے گا۔ اگر دنیا کی زندگی کے اندر، انسانیت کی تعمیر کرنے والے اور زمین کو فتنہ و فساد سے بھر دینے والے یکساں ہوں اور ان دونوں گروہوں سے خدا کوئی سوال نہ کرے تو یہ بالکل ظلم ہوگا اور بے حکمت بات ہوگی۔

عقیدہ آخرت سے مراد بھی یہ ہے کہ انسان کو اس عارضی دنیا میں عقل و فہم اور ارادہ اختیار کی قوت اس لیے دی گئی ہے کہ اس کی آزمائش کی جائے۔ اسے دنیا کی زندگی میں اللہ نے عقل و شعور سے نوازا ہے۔ اس کے سامنے زندگی گزارنے کے دو راستے رکھے ہیں، جن میں سے ایک سچائی، دیانت اور شکر گزار بندہ بن کر رہنے کا راستہ ہے۔ دوسرا راستہ جھوٹ، بدیانتی، فساد اور

بغاوت کا راستہ ہے۔ اس دنیا میں یہ دونوں راستے اللہ نے انسان کے سامنے کھلے رکھے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے ان میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتا ہے۔

لیکن ایک دن آئے گا جب اس امتحان کا وقت ختم ہو جائے گا۔ اس دن زمین اور اس پوری کائنات کے قوانین بدل دئے جائیں گے۔ وہی دن، قیامت کا دن ہو گا۔ اس کے بعد ہر انسان سے حساب کتاب ہو گا۔ اگر وہ دنیا میں شکر گزار بندہ بن کر رہا ہو گا تو اسے جنت کی صورت میں ابدی انعامات ملیں گے اور اگر اس نے بغاوت کی زندگی بسر کی ہو گی تو اسے سزا دی جائے گی اور جہنم کی شکل میں برا انجام اس کا مظہر ہو گا۔[1]

یہی بات ذہن نشین کرانے کے لیے اس دنیا میں پیغمبر آئے۔ انہوں نے لوگوں کو اچھے رویے پر اچھے انجام کی بشارت دی، اس لیے وہ قرآن مجید کی اصطلاح میں بشر کہلائے، اسی طرح انہوں نے لوگوں کو برا رویہ اختیار کرنے پر برے انجام سے ڈرایا، اس لیے وہ نذیر کہلائے۔

خلاصہ بحث:

عقیدہ توحید کے قبول کرنے یعنی خدا کی صفات حسن کا اقرار کرنے سے انسان کے اندر جو حسن کا احساس پیدا ہوتا ہے اس کو علم یا ایمان یا حب اللہ یا معرفت حق کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر احساس کی طرح یہ احساس بھی عمل میں اپنا اظہار چاہتا ہے اور جوں جوں ہم اپنے عمل میں اس کا اظہار کرتے جاتے ہیں اس احساس میں ترقی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ یہ احساس اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے اور یہ ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی لیے قرآن میں جہاں ''آمَنُوْا'' کہا گیا ہے وہاں ''عَمِلُو الصّٰلِحٰتِ '' بھی ساتھ کہہ دیا گیا ہے کیونکہ عمل صالح یعنی خدا کی محبت کے ماتحت عمل کرنا، ایمان یا حب اللہ کی صرف ایک علامت ہے جس کے بغیر اندرونی وصف ایمان یا احساس حسن کی کوئی علامت ہمارے پاس موجود نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ اللہ پاکامل اور درست ایمان انسان کی نجات کا باعث ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی اور آپؐ کی طرف قدم بڑھائے جا سکتے ہیں۔ فرشتوں کی موجودگی کا یقین ہی عمل کی طرف رغبت پیدا کرتا ہے۔ تقدیر کے خیر اور شر کو مان لینے سے بندہ مومن سکون اور اطمینان کا پالیتا ہے۔ آخرت کے دن اٹھائے جانے، حساب کتاب کے پیش آنے اور جنت میں داخلے پر یقین کامل انسان کو دنیا کی زندگی میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے پر آمادہ رکھتا ہے۔

---

1 مذہب اور جدید چیلنج، ص: ۱۲۴

باب دوم: عبادات کا اسلامی تصور اور معاصر تفہیمات

فصل اول: عبادات کے متعلق معاصر تفہیمات

فصل دوم: عبادات کے ظاہری ڈھانچے اور مقاصد میں فرق

فصل سوم: اسلام کے وسیع تصور عبادت کے معمولات زندگی پر اثرات

فصل اول: عبادت کے متعلق معاصر تفہیمات

عبادت کا معنی و مفہوم:

عبادت عربی زبان کے لفظ ''عبد'' سے مشتق ہے اور اس کا معنی آخری درجے کی عاجزی وانکساری ہے۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

''العبادةُ أَبْلَغُ مِنْهَا لِأَنَّهَا غَايَةُ التَّذُلُّلِ''[1]

ترجمہ: ''عبادت عاجزی وفروتنی کی انتہا کا نام ہے''

عبادت تعظیم و عجز وانکساری کی انتہا کو کہتے ہیں، انتہا کی عجز وانکساری صرف ایسے ہستی کے لیے جائز ہے جو الٰہ حق ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''عبادت ایک جامع لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ و محبوب ظاہری و باطنی اقوال وافعال کو شامل ہے''[2]

چنانچہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سچائی، امانت کی ادائیگی، والدین سے حسن سلوک، رشتہ داروں سے نیکی، ایفائے عہد، نیکی کا حکم، برائی سے روکنا، کفار و منافقین سے جہاد، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور زیر دست انسانوں اور جانوروں کے ساتھ بھلائی نیز دعا، ذکر، قرآت وغیرہ سب عبادات ہیں اسی طرح اللہ اور نبی ﷺ سے محبت، اللہ کا ڈر، اس کی طرف رجوع، خالص اسی کی عبادت، اس کے حکم پر ڈٹ جانا، اس کی نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا، اور اس کی قضاء وقدر پر راضی ہونا، اس پر یقین رکھنا، اس کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف وغیرہ عبادات ہیں''

امام ابن تیمیہؒ نے عبادت کی جو تعریف بیان فرمائی ہے وہ نہایت جامع ہے۔ اس میں عبادت کی تمام صورتوں کو بیان فرمایا ہے۔ کتاب وسنت میں عبادت کو اس کے مختلف شکلوں سے بیان فرمایا ہے، ان میں ایک پہلو اللہ کے لیے شعائر بندگی اور توحید کے اظہار اور شرک سے برآت والے اعمال کو بجالانا ہے جیسے دعا، ذبیحہ، نذر وغیرہ۔ شعائر بندگی میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر شعائر آتے ہیں۔ انہیں اللہ کے سوا کسی اور کے لیے بجالانا شرک ہے۔ عبادت کا یہ پہلو انبیاءؑ کی دعوت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

عبادت کا دوسرا پہلو اطاعت وفرمانبرداری سے تعلق رکھتا ہے، کہ مسلمان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں، ہر معاملے میں، ہر حوالے سے اللہ اور اس کے نبیؐ کی اطاعت کریں۔ عبادت کا یہ تصور انسان کی پوری زندگی کو عبادت بناتا ہے یوں وہ اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرتا ہے اور دنیا اور آخرت کی بھلائیاں سمیٹتا ہے۔ عبادت کا یہ پہلو بھی دعوت انبیاءؑ کا بنیادی عنوان ہے۔

---

1 راغب اصبہانی، المفردات فی غریب القرآن، اسلامی اکیڈمی، س۔ن، ص: ۳۱۹

2 ابن تیمیہ، العبودیۃ، المکتب الاسلامی بیروت، ۲۰۰۵ء، ص: ۴۳

عبادت کی اقسام:

عبادت کی درج ذیل اقسام ہیں:

1۔ قلبی عبادت:

یہ سب سے اہم عبادات ہیں، باقی تمام عبادات کا دارو مدار اسی دل کی عبادت پر ہے جس کے دل کے اعمال جتنے بہتر ہوں گے اس کے ظاہری اعمال بھی اتنے بہتر ہوں گے اور جو یہاں جتنا کمزور ہو گا وہ اپنی ظاہری عبادات میں بھی اتنا ہی کمزور ہو گا۔ دل کی عبادت میں محبت، خوف، توکل، امید، خشیت انابت جیسے اعمال داخل ہیں۔ ان اعمال میں محبت کو بنیادی مقام حاصل ہے، یہ عبادت کی اساس ہے۔ یہ محبت جب تک خوف اور امید کے ساتھ جڑی نہ ہو تب تک یہ اللہ کے تقرب کا درست ذریعہ نہیں بنتی ۔اللہ صورتوں کو نہیں دلوں کو دیکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

"اِن اللہ لَا ینظُرُ اِلَی صُورِکُم وَ اَموَالِکُم وَلٰکِن ینظُرُ اِلَی قُلُوبِکُم وَاَعمَالِکُم"[1]

ترجمہ: "بے شک اللہ تمہارے مالوں اور صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اللہ تمہارے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے۔"

تقوی کا اصل مرکز دل ہے۔ نبی ﷺ نے تین مرتبہ دل کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا:

"اَلتقوٰی ھَاھُنَا "[2]

ترجمہ: تقوی اور پرہیز گاری یہاں ہے۔

انسانی اعمال کے درست یا غلط ہونے کا دارو مدار دل کے اعمال پر ہے۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں:

"اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مضْغۃ اِذَا صَلَحَت صَلَحَ الجَسَد کُلّہ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ "[3]

ترجمہ: بے شک بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ ٹکڑا سنور گیا تو سارا جسم سنور گیا اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا اور یاد رکھو وہ ٹکڑا دل ہے۔

جب دل کے اعمال درست ہوں تو ظاہری، مالی، بدنی اور دیگر تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں اور اگر دل کی نیت ہی خالص نہ ہو تو ظاہری اعمال کی درستگی بھی کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ یہ بات ایک مومن کو بے حد خوفزدہ کرنے والی ہے کہ کہیں اس کا دل ایمان سے کفر کی جانب نہ پھر جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"اَللّٰھُم مُصرِفَ القُلُوبِ صرف قُلوبنا عَلی طَا عَتِکَ"[4]

---

1 صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم، حدیث: ۲۵۶۴

2 صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم، حدیث: ۲۵۶۴

3 صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبراء لدینہ، حدیث: ۵۲، صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فی الکنازین للاموال حدیث: ۹۹۲

4 صحیح مسلم کتاب القدر، باب تصریفاللہ تعالیٰ القلوب کیف شاء، حدیث: ۲۶۵۴

ترجمہ: اے اللہ دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔

جس میں قتال کی طاقت نہ ہو تو اللہ اسے محض عزم کرنے پر اس عمل کا ثواب دے دیتا ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

" مَن سَألَ اللہ الشَھَادۃ بِصِدقٍ بَلَغَہُ اللہ مَنَازِلَ الشُھَدَاءِ وَاِن مَاتَ عَلیٰ فِرَاشِہ"[1]

ترجمہ: جو بندہ اللہ سے سچائی کے ساتھ شہادت مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کا درجہ دے گا اگرچہ اپنے بچھونے پر فوت ہو۔"

سچے دل سے سوال کرنا دل کا عمل ہے۔ دل کی نیت خراب ہو تو اللہ بڑے بڑے اعمال کے اجر سے محروم فرما دیتا ہے۔

2۔ قولی عبادت:

زبان کے ساتھ اللہ کی تسبیح، تمجید، تہلیل اور تکبیر بیان کرنا، مشکلات میں اکیلے اللہ کو پکارنا، ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا، زبان سے کسی مسلمان کا دفاع کرنا، "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر"، دوسروں کو اذیت پہنچانے سے اپنی زبان کو روکے رکھنا۔ یہ سب زبان کی عبادات ہیں۔

3۔ مالی عبادت:

اللہ کے نام پر نذر و نیاز، چڑھاوے اور سبیلیں لگانا۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا، دعوت و جہاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اسلام کے دفاع اور انسانیت کی بھلائی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر پیسہ لگانا۔ یہ سب صورتیں مال کی عبادات ہیں۔

4۔ بدنی عبادت:

اللہ کے سامنے جھکنا، قیام، رکوع، سجود اور طواف جیسی عبادات محض اللہ کے لیے بجا لانا۔ والدین کی خدمت پڑوسیوں کے کام، بیواؤں اور یتیموں کی نگہداشت اور تربیت، مہمانوں کے اکرام، علم کے حصول اور جہاد و قتال کی خاطر اپنے بدن کو تکلیف دینا۔ یہ سب بدنی عبادات ہیں۔

5۔ اطاعت:

اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کی تابعداری کرنا اور منع کردہ سے رکنا، اللہ کی عبادت ہے۔ یہ اطاعت کے ہر پہلو کو محیط ہے، اللہ کا حکم انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا خانگی امور سے، معاشرتی پہلو سے متعلق ہو یا ریاستی اور سیاسی حوالے سے، زندگی کے ہر پہلو میں رب کی مان لینا ہی دراصل اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنا ہے۔ جو کوئی زندگی کے کسی حصہ میں اللہ کی مانتا ہے اور کسی حصہ میں اللہ کے سوا کسی اور سے ہدایت لیتا ہے اور حصہ میں اللہ کے احکامات کو لائق اتباع نہیں جانتا وہ درحقیقت بیک وقت

1 صحیح مسلم، کتاب: الامارۃ، باب استحباب طلب الشہادۃ فی سبیل اللہ تعالیٰ، حدیث : ۱۹۰۹

دو خداؤں پر ایمان رکھتا ہے یعنی اللہ کے ساتھ شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر پہلو میں اللہ تعالیٰ ہی کو لائق اطاعت مانے اور اس کے علاوہ کسی کو ہدایت دینے کا مجاز نہ ٹھہرائے۔[1]

اسلام میں عبادت کا مفہوم:

اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے۔ عرب جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے انکا عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھی اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے، عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاح شریعت میں خدا کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا لانا ہے۔ اس بنا پر صحیفہ محمدی کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک کام وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکامات کی فرمانبرداری ہو۔ اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے۔ قرآن میں یہ نکتہ جابجا ادا ہوا ہے۔

{وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهُ يَتَزَكّٰى وَمَالِاَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى}[2]

ترجمہ: دوزخ سے وہ پرہیزگار بچالیا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے اس پر کسی کا احسان باقی نہیں جس کا بدلہ اس کو دینا ہو، بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا۔

قرآن کی ان آیتوں کی جامع تفسیر حضورؐ نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرمادی ہے:

{اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ}[3]

ترجمہ: اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔

---

1 علامہ محمد قطب، عبادات، اردو ترجمہ: ڈاکٹر سید شفیق الرحمٰن، منبر الوحید والسنۃ، ص:٦-٩

2 سورۃ الیل: ١٨،٩٢

3 صحیح بخاری' کتاب: بدء الوحی' باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ' حدیث:١

اس حدیث سے یہ ثابت ہوگا کہ حضورؐ نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے اس میں کسی خاص کام اور طریقہ تخصیص نہیں ہے بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے احکام کی اطاعت ہو وہ عبادت ہے۔ اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھوں دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں لیکن خدا کی رضا اور اس کے حکم کی بجاآوری کے لئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔ اسی طریقے سے اگر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کسی کو چند کوڑیاں بھی دے تو اس انسانی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس چند کوڑیوں کی وجہ سے آپ کے مال میں برکت ڈال دیگا۔ تعلیم محمدیؐ کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو در حقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض وغایت بنادیا ہے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے۔

عبادت کے متعلق معاصر تفہیمات:

{یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ} [1]

ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ عبادت کی غرض وغایت محض حصول تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ''تقویٰ کی جگہ یہ ہے'' [2] اور قرآن نے بھی ''تَقْوَی الْقُلُوْب'' [3] ''دلوں کا تقویٰ'' کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے۔ نماز، روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بناء پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال واعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو سب عبادت ہیں۔

عبادت کوئی ایسا امر نہیں ہے جو کتاب زندگی کا حاشیہ ہو۔ وہ تو زندگی کا اولین سبب ہے جس کے لیے اللہ نے کتابیں نازل فرمائیں لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینے کے لیے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا، جب لوگ اس کو بھلادیں یا اسے گم کر بیٹھیں تو وہ انھیں یاد دلائیں لہذا محمدﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

{وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنَ} [4]

ترجمہ: ''اور ہم نے تم سے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس کی جانب ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے علاوہ اور کوئی الٰہ نہیں تو میری

---

1 سورۃ البقرہ : ۲: ۲۱

2 صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم، حدیث: ۲۵۶۴

3 سورۃ الحج: ۳۲:۲۲

4 سورۃ الانبیاء: ۲۱: ۲۵

ہی بندگی کرو۔“

ہر رسالت کی ندائے اول یہی تھی: {اَنِ اعْبُدُوْا اللّٰہَ وَا جْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ}[1]

ترجمہ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے بچو۔

{اعْبُدُوْا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ}[2]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

جب اللہ نے اپنی کتابوں کا قرآن پر، اپنی رسالت کا اسلام پر اور انبیاء کا محمدؐ پر اختتام فرمایا، تو اس حقیقت کی تاکید فرمائی اور اپنی ابدی کتاب میں اعلان کیا کہ مکلفین کی پیدائش کا مقصد یہی ہے کہ اپنے رب، اللہ کو پہچانیں اور اس کی عبادت کریں۔ اس غور و فکر رکھنے والی جنس ناطق کی اس دنیا میں پیدائش سے مراد یہی ہے اور یہی اس کی تخلیق کا راز ہے۔

{ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ}[3]

ترجمہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے بنایا ہے۔

{مَا اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنَ}[4]

ترجمہ: میں نہ ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھلائیں۔

لیکن عبادت لوگوں نے حتیٰ کہ خود مسلمانوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رہی۔ انھوں نے فہم، اسلوب، نظر اور تطبیق کے پہلو سے عبادت کے رخ، حقیقت اور مقام سے اسے پھیر دیا۔ کچھ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جنھوں نے اللہ کی عبادت کو بذاتہ مقتضائے مقصود نہیں بنایا۔ ان کے ہاں وہ تہذیب نفس اور تربیت ضمیر کا ایک ذریعہ ہے اور پھر ان کے نزدیک اس مقصد کے لیے وہ واحد ذریعہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے مثالی ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ تمدن کے دیگر ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں جو دیگر قوموں اور ملکوں، حتیٰ کہ ملحدین کے ہاں اصلاح وطنی کے لیے مروج ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جنھوں نے عبادت کی قدر و منزلت کو تسلیم کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کا رخ دوسرے الٰہوں کی طرف پھیر دیا ہے جو اس کے مستحق نہیں ہے یا انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے خدا کو اپنا خدا بنا لیا حتیٰ کہ مسلمانوں میں سے متاخرین کو بھی ہم دیکھتے ہیں، جو اس میں ملوث ہیں۔ ان میں سے بعض غیر اللہ کی عظمت اور تقدیس کے قائل ہیں، یا غیر اللہ کے

---

1 سورۃ النحل: ۱۶: ۳۶

2 سورۃ الاعراف: ۵۹:۷

3 سورۃ الذاریات: ۵۱ : ۵۶

4 سورۃ الذاریات ۵۱ : ۵۷

لیے نذر مانتے ہیں، یا غیر اللہ کے لیے ذبح کرتے ہیں، یا غیر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جنھوں نے عبادت کے مقام اور مرتبے کو تسلیم کیا ہے اور انھوں نے اس کا رخ بھی اللہ سبحانہ و تعالٰی کی طرف کیا ہے جو اس کا حقدار ہے، لیکن وہ اللہ کی بندگی اس طرح نہیں کرتے جس طرح کرنے کا انھیں حکم دیا گیا ہے، عبادت کے مقرر کردہ طریقوں اور اصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔ انھوں نے عبادت کے ایسے طریقے بھی اپنا لیے ہیں جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی ہے اور ایسی راہیں بھی نکال لی ہیں جو رسولؐ کی سنت کے مطابق نہیں۔ انھوں نے اپنے ساتھ سختی کا رویہ اختیار کیا ہے اور صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں اور عبادت کو ان بدعات اور گمراہیوں سے گھیر ڈالا ہے جو انھوں نے سابقہ مذاہب کے گمراہ پیروؤں سے ورثے میں پائی ہیں اور وہ اس عظیم کام سے غافل ہو گئے جو جوان کا دین عبادت کے اسلوب میں لے کر آیا تھا اور اس نے عبادت میں پائی جانے والی کجی کو درست کر دیا تھا اور اس کے کھوٹ کو زائل کر دیا تھا حالانکہ اس نے ایسے اصول اور ضابطے وضع کر رکھے ہیں جو اسے غلو اور انحراف سے محفوظ رکھنے والی ہیں اور بعض لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں جنھوں نے اس عبادت کی اس حقیقت کو سمجھا ہے جس کو اللہ نے تخلیق کی غایت قرار دیا ہے مگر اس فہم کے ساتھ جو کوتاہ ہے اور جزوی ہے چنانچہ عبادت ان کے ہاں ذکر، تلاوت، دعا، اور معروف شعائر، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے زائد کچھ نہیں۔ اس کوتاہ فہمی کے ساتھ وہ اس سے بے نیاز ہیں کہ ان شعائر کے بعد انھوں نے اسلام کے اوامر و نواہی، اور اس کی ہدایات میں کمی کر ڈالی ہے، جب کہ عبادت، جیسا کہ قرآن و سنت کی ہدایت ہے اور جیسا کہ اس امت کے بہترین اصحاب نے اسے سمجھا ہے، پورے دین اور پوری زندگی پر محیط ہے۔

اس صورت میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ان غلط مفاہیم کو درست کریں جو خیر القرون کے بعد مسلمانوں کی کثیر تعداد کے درمیان عام ہو گئے ہیں، اور ہم ان گمراہ کن افکار کو نکال باہر کریں جنھیں بعض لوگ اسلام کی قدر و منزلت کے بارے میں مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں۔ ہم عبادت کے معنی، اس کی حقیقت اور اس کی جامعیت، اس کے مقصد اور اس کا مکلف ہونے کے راز کو واضح کریں۔ یہ بات بھی واضح کریں کہ اسلام نے عبادت کے ضمن میں جو اصلاح کی ہے اور اس بارے میں جو اسلام کی ہدایات ہیں وہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور اسی کی فرمانبرداری میں ساری زندگی گزاریں [1]۔

خضوع اور تذلل کے اسلوب سے اللہ کی ہر فرمانبرداری عبادت ہے اور عبادت خضوع کی ایک قسم ہے اور زندگی، فہم، سماعت اور بصارت جیسی بڑی بڑی نعمتوں کے عطا کرنے والے منعم کے سوا اس کا کوئی مستحق نہیں ہے۔

"تم میں سے کوئی اپنے مملوک کو یہ الفاظ نہ کہے: اے میرے بندے، اے میری بندی، بلکہ اے لڑکے اور اے لڑکی کہنا چاہیے۔ یہ ان پر کبریائی کی خواہش کی نفی ہو گی اور اس بات کی بھی نفی کہ اس سے ان کی بندگی منسوب ہو کیوں کہ بندگی کا مستحق تو صرف اللہ ہے جو اپنے بندوں کا رب ہے اور وہ سب اس کے بندے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر یوسف القرضاوی، اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم، مترجم: خدا بخش کلیار ایڈووکیٹ، الفیصل ناشران، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۷تا۲۹

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ع۔ب۔د کے مادہ کے لغوی استعمال کو بنیاد بنا کر فرمایا ہے:

''عبادت کا اساسی مفہوم کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کر کے اس کے مقابلے میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جانا، سرتابی و مزاحمت چھوڑ دینا اور اس کے لیے رام ہو جانا ہے۔ یہی حقیقت بندگی اور غلامی کی ہے[1]۔

لٰہذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ بندگی اور غلامی کا ہی تصور ہے۔ پھر چوں کہ غلام کا اصل کام اپنے آقا کی اطاعت و فرمانبرداری ہے، لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جب کہ ایک غلام اپنے آقا کی بندگی و اطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اس کی برتری کا قائل ہو اور اس کی بلندئ شان کا معترف بھی ہو اور اس کی مہربانیوں پر شکر و احسان مندی کے جذبے سے سرشار ہو تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے اعتراف نعمت کا اظہار کرتا ہے اور طرح طرح سے مراسم بندگی بجالاتا ہے۔ اسی کا نام پرستش ہے اور یہ تصور عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جب کہ غلام کا صرف سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔

شیخ محمد عبدہ[2] سورۃ الفاتحہ کی آیت: (اِيَّاكَ نَعبُدُ وَ اِيَّاكَ نَستَعِينُ) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عبادت انتہائی خضوع کے ساتھ اطاعت ہے۔ ہر عبادت جو پورے پورے معنی ظاہر کر دے اور مفہوم کو بالکل روشن کر دے تاویل کو قبول نہیں کرتی، اور اکثر مفسرین کسی شے کی تفسیر اس کے لوازم سے کرتے ہیں، اور اس کی حقیقت کا تعارف اس کی رسوم کے ساتھ کراتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو لفظی تعریف ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور کسی کلمہ کی وضاحت اس کے قریبی معانی سے کرتے ہیں، اور پھر اس سے اس عبارت کی وضاحت کرتے ہیں، جس سے وہ عبادت کے معنی بیان کرتے ہیں تو اس اسلوب میں اجمال اور تساہل ہے۔[3]

جب ہم قرآن کی آیات، لغات کے اسلوب اور عربوں کے ''عبد'' کے استعمال اور جو اس کے معنی سے مشابہت اور مقاربت کرتا ہو مثلاً خضع، خنع، اطاع اور دل میں غور و تدبر کرتے ہیں، تو ان الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے جو ''عبد'' سے مطابقت کرے اور اُسے اس کے مقام میں مخمول کیا جائے اور جو اس کے موقع پر ہو۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ لفظ ''العباد'' عبادت سے ماخوذ ہے اور اللہ کی طرف بکثرت اس کی نسبت کی جاتی ہے اور لفظ ''العبد'' کی نسبت بکثرت غیر اللہ کی طرف کی جاتی ہے،

---

1 سید ابوالاعلیٰ مودودی، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ص: ۸۲۔۸۳

2 شیخ محمد عبدہ ۱۸۴۹ء میں دریائے نیل کے ایک ساحلی گاؤں شبراخیت میں پیدا ہوئے، جمال الدین افغانی کے شاگرد رہے، مصر کے مفتی اعظم بھی رہے ہیں، ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو وفات پائی { ویکیپیڈیا }

3 محمد رشید بن رضا، تفسیر القرآن الحکیم، تفسیر المنار، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱/ص: ۴۷

اس لیے کہ وہ ''عبودیت'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''غلامی'' ہیں اور عبادت اور عبودیت کے مابین فرق ان معانی کے ساتھ ہے۔

اس لیے بعض علماء کہتے ہیں کہ لغت کی رو سے عبادت اللہ کے علاوہ کسی اور ہستی کے لیے نہیں ہوتی لیکن قرآن مجید کا استعمال اس کے بر خلاف ہے۔ پھر شیخ وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں" عاشق اپنے معشوق کی تعظیم میں بڑا مبالغہ کرتا ہے، اور اس کے لیے بچھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ اپنی خواہش کو اس کی خواہش میں فنا کر دیتا ہے، اور اپنے ارادے کو اس کے ارادے میں ضم کر دیتا ہے مگر اس کے باوجود اس کا یہ خضوع فی الحقیقت عبادت شمار نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہت سے لوگ امراء، رؤسا اور شاہوں کی تعظیم میں غلو سے کام لیتے ہیں کہ تم ان میں ان کے لیے خضوع مرضیات پر اس عمدگی سے عمل کرتے ہوئے دیکھو گے جو تمہیں جملہ عبادین تو کجا، تائب اور پاکباز عبادت گزاروں میں بھی نظر نہیں آئے گا مگر عرب اس اطاعت و فرمانبرداری کو کسی درجے میں بھی عبادت کا نام نہیں دیتے۔

صحیح اسلوب اور خالص عربی زبان کا استعمال رہنمائی کرتا ہے کہ عبادت انتہائی خضوع کی ایک قسم ہے جو معبود کی عظمت کے قلبی شعور اور اس کے غلبے کے اعتقاد جس کی حقیقت اور ماہیت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا، اور بندہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کچھ جانتا ہے، کہ وہ اس پر محیط ہے، لیکن وہ اس کے فہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔ جو شخص کسی بادشاہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں انتہا کو پہنچ جائے اور وہ بادشاہ کے پاؤں تلوے بھی چاٹتا ہو تو اس کو اس کا بندہ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کی فرمانبرداری اور غلامی کا سبب معروف معنوں میں باشاہ کا خوف اور اس کے انعامات کی امید ہو سوائے ان لوگوں کے جن کا اعتقاد یہ ہو کہ اقتدار اور باشاہت غیبی آسمانی قوت ہے جو بادشاہوں کو نوع انسانی میں سے اعلیٰ ترین نسل کے افراد ہونے اور اپنی اصلیت میں بہت برگزیدہ ہونے کے باعث اہل جہان پر تسلط کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو ان کا یہ اعتقاد کفر والحاد کی طرف لے جاتا ہے لہذا وہ بادشاہوں کو اپنے الٰہ اور رب بنا لیتے ہیں اور حقیقی معنوں میں ان کی عبادت کرتے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ کی رائے میں جو شخص خضوع، تذلل اور اطاعت کی نوعیت کے لحاظ سے عبادت کو غیر عبادت سے ممیز کرنا چاہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عبادت خضوع و اطاعت کا درجہ نہیں جیسا کہ اہل لغت کی رائے ہے کہ عبادت خضوع اور اطاعت کا آخری درجہ ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ اس اطاعت و خضوع کا منبع کیا ہے۔ اگر اس کے اسباب اقتدار، قوت اور اسی طرح کے دیگر ظاہری محرکات ہوں تو اسے عبادت کا نام نہیں دیا جا سکتا اور اگر اس کا سرچشمہ یہ اعتقاد ہو کہ معبود کے لیے حس و ادراک سے ورے عظمت و قدرت ہے تو وہ عبادت ہے۔ [1]

---

1 اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم، ص: ۵۵

ایک ایسا تصور عبادت جو حیات انسانی کے ہر دائرے اور شخصیت کے ہر وظیفے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہاں کاروبار، تجارت کے جھمیلے، آئین وریاست کی حدود، معاشی تگ وتاز اور معاشرتی زندگی کے عواطف اور عدل اجتماعی کے تمام شعبے اس دائرہ عبادت میں شریک دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عبادت کا وہ تصور ہے جو حیات وکائنات میں ایک تخلیقی وحدت سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کائنات کی خلقت میں کوئی دوسرا شریک نہیں، بعینہ اس کی عبادت میں بھی کسی دوسرے کی شرکت کا جواز موجود نہیں۔ یہی وہ بنیادی استدلال ہے کہ ہم اپنے خالق حقیقی کو مسجود حقیقی بنائیں، صرف اور صرف اسی کے عبودیت کے تقاضوں کو سمجھتے اور انجام دیتے ہوئے مقام عبدیت کی حد کمال کو حاصل کریں۔انبیاءؑ اس عبودیت کے مقام بلند پر فائز ہوئے ہیں اور بندگان خدا بھی اسی منزل شوق کے راہ رو کی حیثیت سے فرامین الٰہی کے مطابق جادہ ہستی کو طے کرتے ہیں۔

عبادات کی اصل یہ ہے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، بندوں پر اس کے حق کی ادائیگی اور اس کی ان نعمتوں کے شکر کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور ضروری نہیں کہ ان عبادات کے ثمرات اور ان کے فائدے انسان کی مادی زندگی میں ملیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ انسان کی محدود عقل ان کی حکمت کا ادراک کرلے اس میں درحقیقت انسان کی اس کے رب کی بندگی میں آزمائش ہے اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے کہ وہ اس ساری تفصیلات کے راز کو سمجھے۔ بندہ بندہ ہے اور رب رب ہے اور بہت ہی خوش قسمت ہے وہ انسان جو اپنی ذات کی معرفت حاصل کرلے!

اگر انسان اللہ کی عبادت صرف اس صورت میں کرے جو اس کی محدود عقل کے موافق ہو اور اس نے اپنی محدود عقل کے ساتھ اس کی حکمت کو بالتفصیل سمجھ لیا ہو لیکن جب اس کے کسی ایک جز یا کئی ایک جزئیات کے راز کے ادراک سے عاجز رہ گیا تو اس نے اکڑ کر منہ پھیر لیا۔ ایسی حالت میں اپنے رب اور اپنے مولا کا بندہ بننے کی بجائے اپنی عقل اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا۔

اللہ کی بندگی کی علامت ایمان بالغیب ہے اگرچہ بندہ نے اسے دیکھا نہیں، اور اس کے حکم کی اطاعت ہے اگرچہ بندے نے اس کے حکم کے اسرار کا احاطہ نہیں کیا۔ مومن کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اجمالی طور پر جان لے کہ اللہ جہان والوں سے بے نیاز ہے، وہ بے نیاز ہے ان کی عبادات اور اطاعت سے اسے کسی اطاعت کرنے والے کی اطاعت فائدہ نہیں پہنچاتی اور کسی نافرمانی کرنے والے کی نافرمانی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ پاتا۔

{ وَمَن يَشكُر فَإِنَّمَا يَشكُرُ لِنَفسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِى حَمِيد}[1]

ترجمہ: ’’اور جو بندہ شکر ادا کرے گا وہ اپنے نفس کے لیے شکر ادا کرے گا، اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے‘‘

---

1 سورۃ لقمان ۳۱ : ۱۲

عبادات کا اسلامی تصور:

جب ہم اسلام کی عبادات کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہم وہ متعین صورتیں مراد لیتے ہیں جو اسلام نے تقرب الی اللہ کے لیے مقرر کی ہیں اور ان کے لیے امتیازی شعائر اختیار کیے ہیں، ان کے لیے اوقات، مقداریں اور کیفیات متعین کر دی ہیں جن میں تبدیل و تعدیل کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبادات سے متعلق ہم اپنی بات کو انہی چار معروف عبادتوں، نماز، روزہ، حج، اور زکوۃ تک محدود کر لیتے ہیں۔

اگر ہم اس میدان کو وسیع کرنا چاہیں تو ہمارے لیے لازم ہے کہ اسلامی عبادات میں سے کم از کم دو عبادتوں کو اپنی بات میں شامل کر لیں۔ جو خدا پرستی کے دائرے میں اوقات اور کیفیات کے ساتھ محدود نہیں ہوتیں۔ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ پر مشتمل فرائض ہیں۔ معروف اسلامی عبادات نماز، روزہ، حج، اور زکوۃ قدیمی عبادات ہیں۔ اسلام سے قبل کے ادیان کسی نہ کسی صورت میں ان سے متعارف تھے۔ اللہ نے بعض انبیاء کے بارے میں ارشاد فرمایا:

{وَجَعَلْنٰهُم اَئِمَّةً يَهْدُونَ بِاَمرِنَا وَ اَوحَينَا اِلَيهِم فِعلَ الخَيرَاتِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيتَاءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ}[1]

ترجمہ: ”اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کیا کرتے تھے اور ہم نے انہیں اچھے کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کا حکم دیا تھا، اور وہ ہماری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔“

روزوں کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

{ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ}[2]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے ان پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔

حج کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

{ وَاِذ بَوَّانَا لِاِبرَاهِيمَ مَكَانَ البَيتِ اَن لَا تُشرِك بِي شَيئًا وَطَهِر بَيتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَ القَائِمِينَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُود وَ اَذِن فِي النَّاسِ بِالحَجِ يَاتُوكَ رِجَالًا وَعَلٰى كُلِ ضَامِرٍ يَاتِينَ مِن كُلِ فَجٍ عَمِيق}[3]

ترجمہ: ”اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے کعبہ کی جگہ معین کر دی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھ۔ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے کہ تیرے پاس پاپیادہ اور پتلے دبلے اونٹوں پر دور دراز راستوں سے آئیں۔“

---

1 سورۃ الانبیاء ۲۱ : ۷۳

2 سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۸۳

3 سورۃ الحج ۲۲ : ۲۶ - ۲۷

لیکن یہ چار عبادات ان ادیان میں اس زمانہ اور ماحول کی مناسبت کے ساتھ تھیں پھر جب حضرت محمدؐ تشریف لائے اور اللہ نے آپؐ پر ان عبادات کو کامل ترین صورت میں فرض قرار دے دیا اور گزشتہ زمانوں کی ہر مشابہت سے انہیں بالکل پاک کر دیا۔

چنانچہ نماز محض تضرع اور دعا ہی نہیں ہے بلکہ وہ ذکر و دعا ہے اور تلاوت ہے۔ وہ اعمال و اقوال ہیں جن میں فکر، قلب زبان اور بدن شریک ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس کو طہارت و نظافت، اور دن اور رات کے متعین اوقات میں مزین ہو کر ادا کرنا واجب قرار دیا ہے۔ ہر نماز کے لیے گنتی کی رکعتیں ہیں اور اسلام نے اس کی کیفیت کو ایک منفرد ترتیب کے ساتھ منظم کیا ہے اور اس میں جماعت و جمعہ مقرر فرما کر اسے مکمل کر دیا، اور اس سب کچھ کو اذان و اقامت کی مشروعیت کے ساتھ نہایت خوشگوار بنا دیا۔ اس صورت ان شرائط کے ساتھ اسلامی نماز ایک لاثانی عبادت بن جاتی ہے جو اس صورت اور ان شرائط کے ساتھ کسی دوسرے دین میں نہیں پائی جاتی۔

زکوٰۃ اسلام میں ایک بے مثال عبادت ہے۔ وہ مجرد احسان نہیں کہ کوئی عطیہ دینے والا عطیہ دے اور نہ ہی وہ محض صدقہ ہے کہ کوئی رضاکارانہ طور پر اسے ادا کرے۔ وہ مقرر حق ہے اور متعین ٹیکس ہے ہر اس شخص پر جو مقررہ نصاب کا مالک ہو بشرطیکہ وہ بڑھنے والا مال ہو، اور اس پر ایک سال گزر گیا ہو۔ وہ اس کی حاجات اصلیہ سے زائد ہو۔ وہ اللہ کا حق ہے اس میں سے جو اللہ نے اسے مال، تجارت، یا زراعت کی صورت میں عطا فرمایا ہے وہ حق ہے جس کی ادائیگی پر ایمان مجبور کرتا ہے اور ریاست کا قیام ٹیکس کی وصولی پر ہی ہوتا ہے:

{خُذ مِن اَموَالِهِم صَدَقَةً تُطَهِّرُهُم وَ تُزَكِّيهِم بِهَا}[1]

ترجمہ: ''ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر اس سے ان کے ظاہر کو پاک اور ان کے باطن کو صاف کر دے''۔

لہٰذا جس نے اسے ادا کر دیا اس نے اللہ اور اس کے بندوں کی خوشنودی حاصل کر لی اور دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اگر اس نے انکار کر دیا تو اسے سختی کے ساتھ ادائیگی پر مجبور کر دیا جائے گا، اور اگر وہ طاقت ور ہو تو اس سے لڑا جائے گا اور اس پر لشکر کشی کی جائے گی، حتیٰ کہ وہ اسے ادا کر دے۔ اور یہ ہے وہ سلوک جو خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے ساتھ اختیار کیا۔

زکوٰۃ اس وضع اور اس کے ان مصارف کے ساتھ جنھیں قرآن نے بیان فرمایا ہے ایک جدید عبادت ہے جو اس کمال کے ساتھ کسی دیگر دین میں متعارف نہیں۔ اسی طرح سے روزے، حج، ذکر اور دعا قدیم عبادتیں ہیں جو بہت سے ادیان میں مشترک ہیں لیکن اسلام نے ان جملہ عبادات کو ہر قسم کے عیب سے پاک کیا ہے۔ اور عبادت کی ہر نوع کو انتہائی ترقی دی ہے۔ ان میں

---

1 سورۃ التوبۃ ۹ : ۱۰۳

خفیہ صلاحیتیں مرکوز کی ہیں، ان کے ساتھ اثرات مربوط کیے ہیں اور زندگی میں ان کے لیے ایسی تاثیر پیدا کی ہے جو عمومی اور دائمی دین کے شایان شان ہے جس سے مطلوب فرد کی اصلاح، گھروں کی سعادت، جماعت کا استقرار، ریاست کی رہنمائی اور اہل جہاں کی ہدایت ہے۔

فصل دوم: عبادات کے ظاہری ڈھانچے اور مقاصد میں فرق

اللہ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادات کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادات کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور مقاصد کیا ہے؟

عبادت میں سب سے بنیادی بات یہ ہے، کہ اللہ کی توحید پر ایمان لائے۔یعنی اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ نہیں کوئی الٰہ مگر اللہ جو اپنے پروردگار ہونے میں، اپنے لائق عبادت ہونے میں اور اپنے تمام اسماء وصفات اور افعال میں وحدہ لاشریک ہے۔
{وَاعبُدُوا اللہَ وَلَا تُشرِکُوا بِہ شَیئًا}[1]

ترجمہ:"اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو عبادت کے لائق نہ سمجھو۔"

اللہ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ پورے اسلام پر عمل کیا جائے۔ان سب تقاضوں کی پابندی ایک درجے میں نہیں، ان میں سے کچھ کا تعلق اصل ایمان سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ہونے دینا، شعائر عبادت کو تنہا اسی کے لیے مخصوص کر رکھنا اور اس ایک کی شریعت تحکیم کرنا۔یہ وہ تقاضے ہیں جن کو چھوڑ دینے کے بعد آدمی مومن ہی نہیں رہتا۔

عبادت کی ابتداء لَا اِلٰہَ اِلَا اللہُ مُحَمدرَسُول اللہ پر ایمان سے ہوتی ہے۔اللہ اکیلے ہر قسم کی عبادت کا مستحق جاننا اور شرک کی مکمل نفی کرنے سے ہی عبادت شروع ہوتی ہے۔اگر یہ ایمان نہ ہو تو پھر باقی جو کچھ ہے وہ عبادت تسلیم نہیں ہوتا۔اللہ کے علاوہ کسی اور کو مشکل کشا اور حاجت روا ماننا یا غیر اللہ کے قانون کی تحکیم پر راضی بر ضا ہونا کلمہ توحید کی نفی ہے۔اگر کوئی شرک صریح میں پڑا ہوا ہے تو یہ رکوع و سجود، یہ عمرے اور حج اس کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتے کیونکہ عبادت کے لیے ایمان پہلی شرط ہے۔شرک کرنے والوں کے حق میں ایمان کی شہادت نہیں دی جاسکتی۔اللہ تعالیٰ اس قانون کی انتہائی بالادستی یوں بیان فرماتا ہے:
{وَلَو اَشرَکُوا لَحَبِطَ عَنھُم مَا کَانُوا یَعمَلُونَ}[2]

ترجمہ: اور اگر یہ انبیاء ومرسلین شرک کرتے تو جو کچھ یہ عمل کرتے تھے سب ضائع ہو جاتا۔

آج کے مسلمان کے ہاں عبادت نماز سے شروع ہوتی ہے نہ کہ لَا اِلٰہَ اِلَا اللہ سے، یہ عبادت اس کے تصور میں نماز سے شروع ہوتی ہے تو روزہ، حج، اور کچھ ذکر اذکار پر ختم بھی ہو جاتی ہے۔عبادت کی ابتداء اللہ وحدہ لاشریک کے لیے اپنی عبدیت کے اقرار و اظہار سے نہیں ہوتی۔شرک کی نفی کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے ہاں نماز روزہ پایا جاتا ہے تو عبادت میں کیا خلل ہے،

---

1 سورۃ النساء ۴: ۳۶

2 سورۃ الانعام ۶ : ۸۸

اگرچہ آدمی اللہ کے سوا کسی اور کو مشکل کشا، حاجت روا سمجھ کر پکارتا اور اس کے نام پر چڑھاوے چڑھاتا ہو، بھلا نماز روزہ کرنے کے بعد مسلمان ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے، اگرچہ آدمی شریعت غیر اللہ کی تحکیم پر ہی راضی کیوں نہ ہو۔

کتنے ایسے لوگ تھے جن کو محض اس وجہ سے مرتد کہا گیا کہ وہ آپؐ کے بعد کسی اور کو نبی ماننے لگے تھے۔ان کا نمازیں پڑھنا، مساجد آباد کرنا، چہروں پر داڑھیاں سجانا انہیں کافر قرار دینے سے نہ روک سکا۔ آج لوگ مقام نبوت کے انکار سے کہیں آگے بڑھ کر رب کے مقام کا انکار کر رہے ہیں۔ یہاں نمازیں اور روزے رکھنے والے، بیت اللہ کا حج کرنے والے اپنے ہی جیسے مجبور انسانوں کو مشکلات میں پکارتے اور ان کے در پہ ماتھے ٹیکتے نظر آتے ہیں۔

کتنے ایسے لوگ تھے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے رک جانے پر ابو بکر رضی اللہ نے ان کے خلاف اعلان جنگ کر ڈالا تھا جبکہ وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے۔ان کے حق میں ایمان کی شہادت نہیں دی گئی۔ان نمازیوں کے خلاف قتال ہی ہوا کیونکہ اللہ کے احکامات میں سے ایک حکم سے اعراض کر لیا تھا جبکہ بقیہ احکام شریعت کے وہ بدستور اقراری تھے بلکہ پابند بھی تو پھر ایسے انسان کے بارے میں کیا خیال ہے جو اللہ کی پوری شریعت سے اعراض کیے بیٹھا ہو اور اللہ کی شریعت کے سوا کسی اور شریعت کو ہی اپنا دستور بنا چکا ہو اور اسی پر راضی برضا ہو۔عبادت کی اصل اور بنیاد عقیدہ ہے اسی سے عبادت شروع ہوتی ہے اور اسی پر لوٹتی ہے لہٰذا عبادت کی ابتداء توحید سے ہوتی ہے نماز سے نہیں ہوتی۔

ہر مسلمان شعائر عبادت کے ذریعے اللہ کی عبادت کرتا ہے، یہ وہ فرائض ہیں جن پر اسلام کی بنیادیں کھڑی ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا

''بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَہَادَۃً اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامَ الصَّلَاۃَ وَاِیْتَاءَ الزَّکَاۃِ وَالْحَجِّ وَ صَوْمَ رَمْضَانَ''[1]

ترجمہ: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر کھڑی ہے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ برحق نہیں ہے اور محمدؐ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر کھڑی ہے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

اس حدیث کے مطابق اسلام میں پانچ چیزیں ستون کی بنیاد رکھتی ہے جس طرح عمارت کچھ ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے اسی طرح اسلامی زندگی پانچ ارکان پر قائم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ارکان بظاہر پانچ شکلی چیزوں کے نام ہیں یعنی کلمۂ ایمان کے الفاظ کو دہرانا۔ صلوٰۃ کے ڈھانچہ کو قائم کرنا، زکوٰۃ کی مقررہ رقم نکالنا، حج کے مراسم کو ادا کرنا، رمضان کے صوم کا اہتمام کرنا مگر اس کا

---

1 صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب: دعاء کم ایمانکم، حدیث: ۸۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: بیان ارکان الاسلام وعائمہ العظام حدیث: ۲۱

مطلب شکل برائے شکل نہیں بلکہ شکل برائے اسپرٹ ہے یعنی ان شکلی احکام کی ایک حقیقت ہے اور ان کی وہی ادائیگی معتبر ہے جس میں اس کی حقیقت پائی جائے۔

اس دنیا میں ہر چیز کا معاملہ ہے مثلاً ٹیلیفون کو لیجئے جیسا کہ معلوم ہے، ٹیلیفون کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے مگر یہی ظاہری صورت وہ چیز نہیں ہے جو اصلاً ٹیلیفون سے مطلوب ہو، ٹیلیفون برائے ٹیلیفون مطلوب نہیں ہوتا بلکہ ٹیلیفون برائے رابطہ مطلوب ہوتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ میرے پاس ٹیلیفون ہے تو اس سے مراد یہ نہیں ہوگا کہ ٹیلیفون کی صورت آپ کے پاس موجود ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ٹیلیفون کی حقیقت آپ کے پاس موجود ہے یعنی ایک ایسی مشین جس کے ذریعہ دنیا کے ہر حصہ سے ربط قائم کیا جاسکے۔ جس کے ذریعہ دور کے لوگوں سے گفتگو کی جاسکے۔

یہی معاملہ اسلام کے مذکورہ پانچ ارکان کا بھی ہے۔ یہ ارکان اسی وقت ارکان اسلام ہیں جب ان کو اسی طرح اختیار کیا جائے کہ ان کی شکل کے ساتھ ان کی معنوی روح بھی آدمی کے اندر پائی جارہی ہو روح کو جدا کرنے کے بعد شکل کا موجود ہونا ایسا ہی ہے جیسے اس کا موجود نہ ہونا۔

ایمان کی اصل روح:

سب سے پہلا رکن ایمان ہے۔ اس کی ظاہری صورت کلمہ اسلام کی زبان سے ادائیگی ہے اور اس کی معنوی روح اعتراف ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ ایک انسان خدا کا اس کے تمام صفات کمال کے ساتھ اعتراف کرتا ہے۔ وہ محمد ﷺ کی اس حیثیت کا اعتراف کرتا ہے کہ خدا نے ان کو میرے لیے اور تمام انسانوں کے لیے ابدی رہنما بنایا۔ یہ حقیقت جس کے دل میں اتر جائے وہ اس کی پوری نفسیات میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا سینہ سچائی کے اعتراف کے لیے کھل جاتا ہے وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لیے کوئی بھی چیز کبھی حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

صلوۃ کی اصل روح:

صلوۃ کی ظاہری صورت پنج وقتہ عبادت ہے اور اس کی معنوی روح تواضع ہے۔ صلوۃ کا عمل کرنے والا آدمی اپنے رب کے آگے جھکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر تواضع کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔ جس آدمی کے اندر صلوۃ کی اصل روح پیدا ہو جائے وہ گھمنڈ اور انانیت جیسی چیزوں سے یکسر خالی ہو جائے گا۔ اس کا رویہ ہر معاملہ میں تواضع کا رویہ بن جائے گا نہ کہ فخر اور کبر کا رویہ ہوگا۔[1]

---

1 مولانا وحید الدین خان، صوم رمضان، الرسالہ بکس نئی دہلی، ص:٦

زکوٰۃ کی اصل روح:

زکوٰۃ کی ظاہری صورت سالانہ ایک مخصوص رقم کی ادائیگی ہے اور اس کی معنوی روح خدمت ہے جو آدمی زکوٰۃ کا عمل کرے اس کے اندر خلق کے لیے خدمت اور خیر خواہی کا عمومی جذبہ پیدا ہو جائے گا وہ چاہے گا کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

حج کی اصل روح:

حج اپنے ظاہر کے اعتبار سے سالانہ مراسم کی ادائیگی ہے اور اس کی معنوی روح اتحاد ہے جو آدمی صحیح کیفیت کے ساتھ حج کی فرائض ادا کرلے اس کے اندر اختلافی نفسیات کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ اتحاد و اتفاق کے مزاج کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہنے لگے گا، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ دوسروں کے ساتھ اس کا اختلاف پیش آگیا ہو۔

صوم کی اصل روح:

صوم کی ظاہری صورت رمضان کے مہینہ کا روزہ ہے اور اس کی معنوی روح صبر ہے۔ صوم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر صبر پیدا ہو، جو آدمی صوم کا عامل ہو، اس کے اندر یہ عمومی مزاج پیدا ہو جائے گا کہ وہ ناخوش گوار باتوں کو برداشت کرے، وہ لوگوں کی قابل شکایت باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے زندگی گزارے۔

جو لوگ اسلام کے ان پانچ ارکان کو محض ان کی شکل کے اعتبار سے اختیار کریں وہ مخصوص شکل کی حد تک تو ان کو اپنائیں گے، مگر ان شکلوں کے باہر ان کی زندگی ان ارکان سے بالکل آزاد اور غیر متعلق ہو گی۔

مثلاً وہ کلمۂ ایمان کے الفاظ کو اپنی زبان سے دہرائیں گے مگر ان مخصوص الفاظ کے باہر جب ان کے سامنے کوئی حق آئے گا تو وہ اس کا اعتراف نہ کر سکیں گے، کیونکہ ان کی روح کلمہ اسپرٹ سے خالی ہے۔ وہ نماز کی شکل کو مسجد میں کھڑے ہو کر دہرائیں گے مگر مسجد کے باہر جب لوگوں کے ساتھ ان کا سابقہ پیش آئے گا تو وہاں وہ تواضع کا انداز اختیار نہ کر سکیں گے اور اس کی وجہ یہ ہو گی نماز کی جو اسپرٹ ہے وہ ان کے اندر موجود نہیں ہے۔[1]

اس طرح وہ زکوٰۃ کے نام پر ایک رقم نکال کر کسی کو دیدیں گے مگر اس کے بعد جب وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کریں گے تو اس میں وہ خیر خواہی کا ثبوت نہ دے سکیں گے کیونکہ زکوٰۃ اسپرٹ سے ان کا سینہ خالی تھا۔ وہ اہتمام کے ساتھ حج کا سفر کریں گے، اور اس کے مراسم ادا کر کے واپس آجائیں گے مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں گے، کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا معاملہ کریں کیونکہ انہوں نے حج کے باوجود حج اسپرٹ اپنے اندر

---

1 صوم رمضان، ص: ۷

پیدا نہیں کی۔ رمضان کا مہینہ آئے گا تو وہ موسمی عبادت کے طور پر ایک مہینہ کا روزہ رکھ لیں گے مگر وہ صبر کے موقع پر صبر نہیں کریں گے، وہ ہر اشتعال پر مشتعل ہو کر لڑنے لگیں گے اور اس کا سبب یہ ہو گا، کہ ظاہری طور پر انہوں نے روزہ تو رکھ لیا مگر ان کے دل اور دماغ میں روزہ کی اسپرٹ پیدا نہ ہو سکی۔

جو آدمی اسلام کے پانچ ارکان کو اختیار کر لے وہ مومن و مسلم ہو گیا، وہ اس کا حقدار ہو گیا کہ دنیا میں اس کو اللہ کی رحمت ملے اور آخرت میں اس کو جنت میں داخل کیا جائے مگر اسلام کے پانچ ارکان اپنی شکل اور روح دونوں کے اعتبار سے مطلوب ہیں ۔ان کی ادائیگی پر جن انعامات کا وعدہ ہے اس کا تعلق کامل ادائیگی پر ہے نہ کہ ادھوری ادائیگی پر ہے۔[1]

پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں۔ جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو ادا کرتا ہے، اور اس باب کے نیچے کی مندرجات جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لئے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے مشکوک ہے۔ یہی سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور ہماری زکوٰتیں ہمارے قومی افلاس کو دور رکیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے:

{ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْ الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِيْ الْاَرْضِ}[2]

ترجمہ: اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیکی کے کام کرتے ہیں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں نائب بنالے گا۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کا اہل بنادے مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

---

1 صوم رمضان، ص:۷

2 سورۃالنور۲۴: ۵۵

اللہ کی اصلی بندگی یہ ہے کہ شعور آنے کے بعد سے آخری سانس تک آپ اللہ کے دستور پر چلیں، اور اپنی ساری زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزاریں۔ ۔اس بندگی کے لئے کوئی مقررہ وقت نہیں ہے، یہ بندگی ہر لمحہ ہونی چاہیے۔ ہر کام اور ہر شکل میں اسی کی بندگی ہونی چاہیے۔ جب آپ کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میں زندگی کے کچھ اوقات میں اللہ کا بندہ ہوں اور زندگی کے کچھ اوقات میں اس کا بندہ نہیں ہوں تو آپ کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ہے کہ زندگی کا کچھ حصہ اللہ کی بندگی کے لیے ہے اور زندگی کا کچھ حصہ اس کی بندگی کے لیے نہیں ہے۔ یہ نماز روزہ اور حج وغیرہ دراصل یہ عبادتیں جو اللہ نے آپ پر فرض کی ہیں، ان کا مقصد آپ کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرنا ہے جو آپ کو زندگی میں ہر وقت ہر حال میں ادا کرنی چاہیے۔ نماز آپ کو دن میں پانچ وقت یاد دلاتی ہے کہ تم اللہ کے بندے ہو اسی کو بندگی تمہیں کرنی چاہیے۔ روزہ سال میں ایک مرتبہ پورے ایک مہینہ تک آپ کو اسی بندگی کے لیے تیار کرتا ہے۔ زکوٰۃ آپ کو بار بار توجہ دلاتی ہے کہ یہ مال جو تم نے کمایا ہے یہ خدا کا عطیہ ہے اس کو صرف اپنے نفس کی خواہشات پر صرف نہ کرو، بلکہ اپنے مالک کا حق ادا کرو۔ حج دل پر خدا کی محبت اور بزرگی کا ایسا نقش بٹھاتا ہے کہ ایک مرتبہ اگر وہ بیٹھ جائے تو تمام عمر اس کا اثر دل سے دور نہیں ہو سکتا۔ ان سب عبادتوں کو ادا کرنے کے بعد اگر آپ اس قابل ہو گئے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی عبادت بن جائے، تو بلاشبہ آپ کی نماز نماز ہے اور روزہ روزہ ہے، زکوٰۃ زکوٰۃ ہے اور حج حج ہے لیکن اگر یہ مقصد پورا نہ ہوا تو محض رکوع اور سجدہ کرنے اور بھوک پیاس کے ساتھ دن گزارنے اور حج کی رسمیں ادا کرنے اور زکوٰۃ کی رقم نکال دینے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان ظاہری عبادات کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک جسم، کہ اگر اس میں جان ہے اور وہ چلتا پھرتا اور کام کرتا ہے تو بلاشبہ ایک زندہ انسان ہے لیکن اگر اس میں جان ہی نہیں تو وہ ایک مردہ لاش ہے۔ مردے کے ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک سب ہی کچھ ہوتے ہیں، مگر اس میں جان نہیں ہوتی اس لیے تم اسے مٹی میں دبا دیتے ہو۔ اسی طرح اگر نماز کے ارکان پورے ادا ہوں یا روزے کی شرطیں پوری ادا کر دی جائیں مگر خدا کا خوف اس کی محبت اور اس کی وفاداری واطاعت نہ ہو جس کے لیے نماز اور روزہ فرض کیا گیا ہے تو وہ بھی ایک بے جان چیز ہو گی۔[1]

اسلام کے پانچ ارکان ہیں۔ خدا اور رسول پر ایمان لانا، دن میں پانچ وقت کی نماز پڑھنا، ماہ رمضان میں تیس دن کے روزے رکھنا، زکوٰۃ یعنی اپنی جمع شدہ دولت کا کچھ حصہ اللہ کے نام پر خرچ کرنا، اگر استطاعت ہو تو حج کرنا، اگرچہ اللہ کے لفظ اور اس کا تصور عربوں میں محمد سے پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن ذہنی و عملی توحید کا فقدان تھا۔ نماز اور روزہ بھی دنیا کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھے کیونکہ صائبین دن میں سات وقت کی نماز پڑھتے تھے اور سال میں ایک مہینے کے روزے رکھتے تھے لیکن طہارت نفس کے علاوہ ان کا مقصود اپنے مخصوص معبودوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا لہذا رسول نے یہ شرط لگا دی کہ نمازیں پڑھو اور روزے بھی رکھو لیکن اللہ کے لیے رکھو۔ نماز کا مقصد خدا کی عظمت کا اقرار اور اپنی فروتنی کا اظہار ہے علاوہ ازیں ایک دوسرا مقصد مسلمانوں

---

1 ابوالاعلیٰ مودودی، خطبات حصہ دوم، حقیقت صوم وصلوۃ، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، مئی ۲۰۰۳ء، ص: ۱۱۔۱۲

میں اخوت اور مساوات کا احساس پیدا کرنا ہے۔ روز کی نمازیں ایک دوسرے محلے کے اجتماعات ہیں، جمعہ کی نماز کئی محلوں کا اجتماع، عید کی نماز شہر اور حج مختلف شہروں اور ملکوں کے مسلمانوں کا اجتماع ہیں۔ رسولؐ سے پہلے بھی حج ہوا کرتا تھا لیکن مرد اور عورت برہنہ ہو کر کعبہ کے گرد چکر لگاتے تھے، لیکن رسول اکرمؐ نے اسے بھی منع کر دیا لیکن عبادات کے سلسلہ میں جو مشرکانہ حرکتیں ہوتی تھی ان کو بھی دور کر دیا۔ قرآن نے خدا کی وحدت کے ساتھ نوع انسان کی وحدت پر بھی زور دیا "رب العالمین" کے فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا دنیا کی ساری قوموں کی یکساں نگہداشت کرتا ہے۔ سب اقوام کا خدا ہے۔ ہر ایک سے یکساں پیش آتا ہے۔[1]

اللہ کو راضی کرنے کے لیے جہاں ان عبادات کو یقیناً سنت کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے وہیں ان کی مقاصد کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک مسلم اگر ان مقاصد اور مطالبوں کو نظر انداز کر دے جو شریعت نے ان کے ساتھ نتھی کر رکھے ہیں تو یہ عبادت صحیح معنوں میں اس کے لیے اجر کا باعث نہ ہو گی۔ آیات و احادیث میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے، مگر آج ہم نے ان شعائر کو محض ادائیگی تک محصور کر دیا ہے۔ دین کے علماء کرام اور داعیان بھی عبادات کے شروط، ارکان، واجبات اور مستحبات کی تو خوب فکر کرتے ہیں مگر ان کے تقاضوں اور مقاصد کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

شعائر کی محض ادائیگی نہیں بلکہ ان کے مقاصد بھی مطلوب ہیں۔ کتاب و سنت کی رو سے شعائر میں سے ایک ایک عمل ایک خاص مقصد کو پورا کرانے کے لیے ہے اور ہر ایک کے اپنے مطالبے اور تقاضے ہیں اور نفس پر ہر عبادت کے اپنے خاص اثرات اور نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

نماز:

نماز کا خاص مقصد اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے:

{وَاَقِمِ الصَلوٰۃَ اِنَ الصَلوٰۃ تَنھٰی عَنِ الفَحشَاءِ وَالمُنکَرِ}[2]

ترجمہ: "اور نماز قائم کرو، بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔"

بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔ فحشا اور منکر ان دو لفظوں میں تمام اخلاقی مفاسد شامل ہیں جو برائیاں شہوانی جذبات کی بے اعتدالی کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں اور پورے معاشرے کو بے حیا بنا دیتی ہیں حتیٰ کہ لوگوں میں بے حیائی کا احساس تک مٹ جاتا ہے اور لوگوں کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے وہ فحشا ہیں اور منکر وہ برائیاں ہیں جو صالح معاشرہ کی پاکیزہ روایات کے خلاف ہوں۔ جو شخص نماز کے معنی و مفہوم پر

---

1 علامہ نیاز فتح پوری، خدا اور تصور خدا، فکشن ہاؤس ۲۰۱۷، ص ۲۱۰

2 سورۃ العنکبوت ۲۹ : ۴۵

غور کرے گا کہ میں روزانہ اللہ کے دربار میں حاضری دیتا ہوں، نماز میں اپنی عاجزی اور محتاجی کا تذکرہ کرکے اللہ کی عظمت بیان کرتا ہوں۔ رکوع، سجود، تشہد اور قیام کی صورت میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور ایسا دن میں کم از کم پانچ بار دہراتا ہوں تو ایسی نماز اسے اللہ کے قریب کرے گی اور برائی اور بے حیائی سے دور رکھے گی۔ آخرت میں کامیابی کی خاطر نبی ﷺ کی فرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہوگا اور جو شخص یہ سوچتا ہی نہیں کہ وہ نماز میں کس کی عظمت بیان کر رہا ہے اور اس نے نماز میں کس چیز کا اقرار کیا اور کن باتوں سے بچنے کا وعدہ کیا تو ایسی نماز اسے بے حیائی اور برائی سے نہیں روک سکتی۔

نماز کا آغاز نماز ادا کرنے سے ضرور ہو جاتا ہے۔ نماز کا وہ طریقہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر ٹھہرا رکھا ہے اس کے ادا ہونے سے اسلام کا ظاہری سرٹیفکیٹ وجود میں آ جاتا ہے مگر یہ سرٹیفکیٹ اللہ کے ہاں تبھی کام دیتا ہے جب اس کے تقاضے اور مقاصد بھی اس کے ساتھ وجود میں آئیں اور اس کی نماز بے حیائی اور برائی کے مقابلے پر ایک بریک کا کام دینے لگے۔ اللہ نے ان نمازیوں کے لیے قرآن میں وعید بھی سنائی جو نماز کے ظاہری ڈھانچے کے ساتھ ان کے تقاضے اور مقاصد پورے نہیں ہوتے۔

{فَوَيل لِلمُصَلِّينَ اَلَذِينَ هُم عَن صَلَا تِهِم سَا هُونَ اَلَذِينَ هُم يُرَآءُونَ وَيَمنَعُونَ المَاعُونَ}[1]

ترجمہ: پس بربادی ہے نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو ریاکار ہیں اور تنگ دل اتنے کہ کسی کو تھوڑی سی چیز دینے پر تیار نہیں۔

روزہ:

روزے کی بارے میں فرمایا:

{يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ}[2]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے ان پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔“

روزہ اللہ کی عظیم عبادت ہے اور ماہ رمضان نیکیاں کرکے اللہ کی رضا کی تلاش کا خصوصی مہینہ ہے۔ ماہ رمضان اللہ سے محبت، اس کی خشیت اور انابت کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ رات کو قیام اللیل میں قرآن مجید کے ذریعے ایک مومن اپنے دل کو روشن کرتا ہے۔ وہ ذکر و فکر کے ذریعے اپنے ایمان کو بڑھاتا اور خشوع پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ روزہ شہوات کنٹرول کرنے کے لیے بہترین مشق ہے اور نفس کا اپنی خواہشات پر جیت پانے اور اپنے میلانات کو قابو میں لانے کی اعلیٰ ترین استعداد پیدا کرتا

---

183 سورۃ الماعون ۱۰۷: ۴-۷

184 سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۸۳

ہے۔ جس دل میں خواہشات سر اٹھائے کھڑی ہوں وہاں تقوٰی کا پنپنا ایک دشوار کام ہے۔ خواہشات کو لگام ڈال لی گئی ہو اور انسان اللہ تعالٰی کے احکامات کے تابع ہو گیا ہو تو وہ فضاء ہے جہاں تقویٰ خوب پرورش پاتا ہے۔

اس لیے فرمایا گیا: {تِلکَ حُدُودُ اللہ فَلا تقرَبُوھا} [1]

ترجمہ: یہ ہیں اللہ کی حدیں، ان کے قریب مت پھٹکو۔

{تِلْکَ حُدُوْدُ اللہِ فَلاَ تَعْتَدُوْھَا} [2]

ترجمہ: یہ ہیں اللہ کی حدیں، سو ان سے آگے نہ بڑھو۔

آج ہم دن میں کھانے پینے سے تو اجتناب کرتے ہیں مگر سارا دن بازار میں سودا سلف خریدنے میں گزارتے ہیں اور افطاری اور سحری کی تیاری میں سارا وقت برباد کر دیتے ہیں۔ روزہ کی حالت میں ٹی وی کے آگے سارا دن لغویات سنتے ہیں اور بہت سے اسلامی ملکوں میں تھیٹر کی رونقیں رمضان کی راتوں میں جس قدر عروج پر ہوتی ہیں سارا سال وہ گرمجوشی دیکھنے میں نہیں آتی۔ گویا ہم زبان حال سے کہہ رہے ہوتے ہیں، نماز روزہ اپنی جگہ اور دنیاداری اور دل لگی اپنی جگہ اور شوق تو بہر حال شوق ہے۔

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

''مَن لَم یَدَع قَول الزُورِ وَالعَمَلَ بِه فَلَا حَاجة الله بِترَکِه طَعَامِه وَشَرَابِه'' [3]

ترجمہ: جو شخص جھوٹ ناحق بات کہے اور اس پر چلنے سے باز نہیں آتا تو اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا ترک کر دے۔

"ربَ صَائِمَ لَیسَ لَه مِن صِیَامِه اِلا الجُوع وَالعَطش" [4]

ترجمہ: کتنے ہیں روزہ دار ہیں جن کے حصے میں اپنے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ آنے والا نہیں۔

روزے کا مقصد یہ بیان کی "لعلکم تتقون "تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ متقی شخص وہ ہے جس کا نفس پاک، صاف اور طیب و طاہر ہو ایسا شخص برے اخلاق کا مالک نہیں ہو سکتا۔ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کو نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلی مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، روزہ ہے یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

---

1 سورۃ البقرۃ ۲: ۱۸۷

2 سورۃ البقرۃ ۲: ۲۲۹

3 صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب: من لم یدع قول الزور، حدیث: ۱۹۰۳

4 سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب: ماجہ فی الغیبۃ الرفث، حدیث ۱۶۹۰

زکوٰۃ:

زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا:

{خُذ مِن اَموَالِہِم صَدَ قَۃً تُطَھرُھُم وَتُزَکِیھِم بِھَا }[1]

ترجمہ: "ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر اس سے ان کے ظاہر کو پاک اور ان کے باطن کو صاف کر دے۔"

یہ زکوٰۃ نہ صرف مال کو پاک کرتی ہے بلکہ نفس کو بھی ظاہر اور باطن میں یعنی حسی اور معنوی ہر لحاظ سے پاکیزہ بناتی ہے۔ اللہ کی رضا پانے کے لیے یہ خالص نذرانہ اسی وقت قبول ہو گا جب یہ حلال طریقے سے حاصل کی گئی کمائی میں سے دیا جائے۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: " اللہ پاک ہے، اور پاک چیزوں کے علاوہ کوئی چیز قبول نہیں کرتا اور بے شک اللہ نے مومنوں کو وہی حکم دیا ہے جو اس نے رسولوں کو دیا ہے"۔

اس لیے اللہ نے ارشاد فرمایا: { یَآاَیُّھَاالرُّسُلُ کُلُوْا مِنْ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْ صَالِحًا}[2]

ترجمہ: اے رسولو! پاک اشیاء کھاؤ نیک اعمال کرو۔

{یَآاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ }[3]

ترجمہ: اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! اس پاک رزق سے جو ہم نے تمھیں دیا کھاؤ۔

پھر آپؐ نے ایک شخص کا ذکر کیا، جو طویل سفر کر کے غبار آلود پراگندہ بالوں کے ساتھ آتا ہے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے اے میرے رب! اے میرے رب! اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا پینا اور پہننا حرام مال سے ہے۔ حرام مال سے ہی اس کی پرورش کی گئی۔ ایسے شخص کی دعا کیسے قبول کی جائے گی۔"[4]

آج زکوٰۃ و عشر دینے والے امت میں انتہائی قلیل ہیں پھر ان میں کتنے ہیں جو اس بات کی فکر کرتے ہیں، کہ ان کی کمائی میں سود کا مال شامل نہ ہو، جھوٹ بول کر کمائی نہ کی گئی ہو، ٹھگی، نوسر بازی، رشوت اور زمینوں پر ناجائز قبضوں کے ذریعے مال حاصل نہ کیا گیا ہو۔ آج مسلمانوں نے عبادت کا مفہوم اس حد تک بگاڑ دیا ہے کہ وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور یہ کاروبار کرنے کے ہتھکنڈے ہیں ان کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔

---

1 سورۃ التوبۃ ۹: ۱۰۳

2 سورۃ المؤمنون ۲۳ : ۵۱

3 سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۷۲

4 صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب: قبول الصدقۃ من الکسب الطیبۃ وتر بیتھا، حدیث : ۱۰۱۵

حج:

حج کے بارے میں فرمایا:

{اَلحَجُ اَشهُرٍ مَعلُومٰتٍ فَمَن فَرَضَ فِيهِن الحَجَ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الحَجَ وَمَا تَفعَلُوا مِن خَيرٍ يَعلَمُهُ اللهُ وَ تَزَوَدُوا فَاِنَ خَيرَ الزَادِ التَقوٰى وَ اتَقُونِ يٰاُولِي الاَلبَاب} [1]

ترجمہ: حج کے مہینے معین ہیں جو معلوم ہیں، جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کر لے وہ جنسی میل میلاپ، گناہ اور لڑائی جھگڑے سے بچتا رہے، تم جو نیکی کرو گے اس سے اللہ باخبر ہے اور حج پر نکلتے وقت اپنے ساتھ سفر کا خرچ لے لیا کرو، سب سے بہتر توشہ اللہ کا خوف ہے اور اے عقلمند! مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

" والحج المبرور ليس له جزاء الا الجنة "[2]

ترجمہ: وہ حج جو گناہ و معصیت سے سلامت رہا، جنت سے کم اس کی کوئی جزاء نہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"من اتى هذا البيت فلم يرفث ولم يفسق ، رجع كما ولدته امه " [3]

ترجمہ: جو شخص خانہ کعبہ کی زیارت کو آئے، اور اس دوران جنسی ملاپ اور گناہ سے دور رہے تو وہ یوں (پاک صاف) لوٹے گا جیسے اس کی ماں نے اس کو جنم دیا تھا۔

حج زندگی میں ایک بار فرض ہے مگر گنتی کے یہ چند دن ایک مسلمان کی زندگی میں بڑے گہرے اثرات کے حامل ہیں سب سے پہلے اللہ کے لیے خالص ہونا ہے۔ ایک مسلمان اپنے اہل خانہ، اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑ کر اللہ کی خاطر حج کے سفر پر روانہ ہوتا ہے، وہ اپنا لباس چھوڑ کر احرام کی دو چادریں لپیٹتا ہے اور لبیک اللھم لبیک کہتا ہوا یعنی اللہ کی وحدانیت بیان کرتا ہوا مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے قافلے میں شامل ہو جاتا ہے۔ منیٰ سے عرفات اور عرفات سے مزدلفہ ہوتے ہوئے منیٰ میں واپسی ایک ایسے مجمع کے ساتھ کرتا ہے جو اسے حشر کی یاد دلاتے ہیں اس ساری مشقت سے نفس میں ایسی تبدیلیاں آتی ہیں اور ایک مسلمان گناہوں سے یوں صاف ستھرا ہو جاتا ہے گویا اس کی ماں نے اسے آج ہی جنم دیا۔ وہ لوگ کتنے بدنصیب ہیں جو اپنے نام کے ساتھ حاجی کا اضافہ تو کر لیتے ہیں مگر نفس کی صفائی کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔ سماجی فوائد حاصل کرنا حج کا مقصد ہی نہیں، مقصد تو اللہ سے تعلق کو مظبوط کرنا ہے مگر یہ حاجی حج کے دنوں میں بھی اللہ کے احکامات کی تابعداری نہیں کرتا اپنے کندھوں کے زور سے لوگوں کو دھکیلتا ہوا حجر اسود کو بوسہ لیتا ہے، عورتوں اور بوڑھوں سمیت مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے حتیٰ کہ

---

1 سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۹۷

2 صحیح بخاری، ابواب العمرۃ، باب: وجوب العمرۃ وفضلھا، حدیث: ۱۷۷۳، صحیح مسلم، الحج، باب: فی فضل الحج والعمرۃ ویوم عرفۃ حدیث: ۱۳۴۹

3 صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، حدیث: ۱۵۲۱ :، صحیح مسلم، الحج، باب: فی فضل الحج والعمرۃ ویوم عرفۃ حدیث: ۱۳۵۰

میدان عرفات میں دعا کی بجائے گپ شپ اور موبائل سے کھیلنے میں وقت ضائع کرتا ہے بلکہ بعض تو ایسے بھی ہیں جو کچھ واجبات چھوڑ کر کفارہ ادا کیے بغیر وطن واپس آجاتے ہیں تو ایسے حاجیوں میں خشوع اور انابت پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہم نے یہ باتیں ایک مشینی انداز سے اپنائی ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی ہمارے اندر خشوع، انابت، انکساری، ذلت اور تعظیم پیدا نہیں کرتیں نہ ہی توحید کا عقیدہ ہمارے دلوں میں پختہ ہوتا ہے اور نہ ہی یہ باتیں ہمیں صغیرہ کبیرہ گناہوں سے دور کرتی ہیں ایسی عبادت جو مسلم معاشرے میں کوئی کردار ادا نہ کرے وہ اللہ کو پسند نہیں آسکتی۔

دنیا کے کام خواہ ان کا تعلق سیاست کے امور سے ہو، یا معیشت سے، تہذیب و تمدن سے ہو یا زمین آباد کرنے سے، روزی کمانے سے ہو یا تفریح کے سامان سے یہ تمام امور اللہ کی عبادت ہیں۔ انہیں عبادت بنا دینے والے دو بنیادی وصف ہیں۔ ایک اس کام کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے اور دوسرا اس پورے عمل کو اللہ کے احکامات کے تابع کر دیا جائے۔ یہ دو وصف سر گرمیٔ حیات کو عبادت بنا دیتے ہیں اور اس پر اُس کو اللہ کے ہاں ثواب کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔

ایک مسلمان جس وقت کام کو عبادت سمجھ کر کرے گا تو اس وقت وہ خیانت، بد دیانتی، کام، چوری، جھوٹ، دو نمبری، دھوکہ دہی، دوسروں کا حق مارنا اور ظلم و جور کی صورت میں ان کا استحصال کرنا یا صرف کسی وقتی فائدے کے لیے حرام اشیاء کا ارتکاب کرنا، اسے کسی کام کا حصہ نہیں رہے گا۔

جس وقت راحت اور آسائش عبادت کا معنٰی لیے ہوئے ہو گی، اس وقت آدمی گھٹیا اور سفلہ پن کی طرف نہیں جائے گا نہ ہی وہ اپنی انسانیت کی سطح سے گرے گا جیسا کہ معاصر جاہلیت کے اندر ہو رہا ہے، جہاں "تفریح" لچر پن اور غلاظت کا ہم نام ہو گئی ہے اور جہاں "دل لگی" فحاشی اور بدکاری کا عنوان بن گئی ہے، بلکہ پہلے یہ بدکاری کا نام تھا اور اب تفریح کا نام ہے۔

دوسرا عبادت کے جذبے سے کیے گئے عمل کا نتیجہ اس کام سے کہیں زیادہ ہو گا جو محض اپنی خواہشات کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے، اسی لیے اسلامی تاریخ میں جب مسلمانوں کے ہاں عبادت کا حقیقی مفہوم پایا جاتا تھا تو مسلمانوں نے دنیا کے علوم، فلاح و بہبود کے کام اور سائنسی ترقی میں اپنے جوہر کے کمال دکھائے اور پھر اس سارے عمل میں وہ اللہ کے احکامات کے تابع او ر فرمانبردار رہے۔ امت اسلامیہ کا کارنامہ محض کشور کشائی اور غلبہ کا حصول نہیں تھا۔ امت اسلام کا اصل کارنامہ محض وہ سائنسی و تمدنی پیشرفت یا وہ زمینی ترقی بھی نہیں تھا جو اس امت کے ہاتھوں رونما ہوا، یہ تو اللہ کا انعام ہے جو کچھ ہمت دکھا لینے کے عوض کافروں کو بھی مل جایا کرتا ہے اور مومنوں کو بھی مل جایا کرتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

{كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا}[1]

---

1 سورۃ بنی اسرائیل ۱۷ : ۲۰

ترجمہ: ''ہم ہر فریق کو اپنی پروردگاری بخششوں سے مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی، اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں''

مسلم امت کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ تمدن، تعمیر ارض اور حصول قوت کا یہ سارا عمل اس نے اللہ کے احکامات کی روشنی میں کرکے دکھایا، یہاں پر اسلامی اقدار اور شرعی معیارات قائم کرکے دکھائے۔ اپنی قوت اور برتری سے جہان میں اخلاق کا بول بالا کیا اور یہ کارنامہ پوری تاریخ میں اس سطح پر صرف اور صرف امت اسلامیہ کے ہاتھوں رونما ہوا۔

فصل سوم: اسلام کے وسیع تصور عبادت کے معمولات زندگی پر اثرات

پہلے ادوار میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چندان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان اللہ کے لئے کرتا ہے مثلاً نماز، دعا، قربانی وغیرہ لیکن نبی ﷺ کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بے حد وسیع کر دیا۔ اس تعلیم کی رو سے ہر وہ نیک کام جو خاص اللہ کے لئے، اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو محض اللہ کی رضا کے حصول کے لئے کیا جائے، وہ عبادت کہلاتا ہے ۔اسلام میں اللہ کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے، کہ وہ کام خواہ اللہ کی بڑائی اور پاکی کے لئے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو لیکن اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی رضامندی ہو۔

نبی ﷺ کی تعلیمات سے اندازہ ہو گا، کہ حسن عمل ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے۔ وحی محمدیؐ نے صحیح طور سے خلقت انسانی کی غرض وغایت عبادت الٰہی قرار دی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ}[1]

ترجمہ: ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اسکی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف نبی ﷺ کے ذریعے سے تمام دنیا کو معلوم ہوا۔ شریعت میں عام طور پر چار عبادتیں فرض ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے۔ حقیقت میں یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے۔ جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں اسی طرح یہ چاروں فرائض در حقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں۔

آج عبادت کا مفہوم تبدیل ہو گیا ہم نے عبادت کو صرف نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تک محدود کر دیا اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں اللہ تعالیٰ کے احکامات سے اعراض کرتے ہوئے شیطان کی اطاعت شروع کر دی۔ آج سیاست میں ہم اللہ کی

---

1 سورۃ الذاریات ۵۱: ۵۶

بجائے جمہور کے نمائندوں کی، معیشت میں سودی سرمایہ دارانہ نظام کی معاشرت میں یورپ کے ننگے کلچر کی، تعلیم میں لارڈ میکالے کے الحادی نظریات کی اتباع کر رہے ہیں۔ زندگی کے ان اجتماعی پہلوؤں میں اللہ کی بجائے اوروں سے ہدایات لیتے ہیں جو کہ شیطان کی عبادت ہے۔ جب ہم پیدا ہی اللہ کی بندگی کے لیے ہوئے ہیں تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ چند شعائر عبادت میں وہ پوری عبادت مکمل ہو جائے جو کہ در حقیقت اس کے پورے وجود نے کرنی تھی۔ یہ شعائر عبادت دن رات میں کل کتنا وقت لے لیں گے ؟ عمر کا کتنا حصہ شعائر عبادت میں گزر سکتا ہے جبکہ باقی عمر کہا جائے گا کہاں خرچ ہو گا عبادت میں صرف ہو گا یا غیر عبادت میں ؟ اگر غیر عبادت میں صرف ہو گا تو وجود انسانی کی زندگی کا وہ مقصد پورا نہ ہوا جو کہ از روئے آیت ہے ہی عبادت میں محصور۔ انسان کے لیے یہ ناجائز ہے کہ وہ خود اپنے پاس سے اپنے وجود کے لیے یا اپنے وجود کے کسی حصے کے لیے کوئی ایسی غایت وضع کر لے جو اللہ نے مقرر نہیں ٹھرائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{ قُل اِن صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحیَایَ وَمَمَاتِی لِلہِ رَب الغَالَمِینَ لَا شَرِیکَ لَہ }[1]

ترجمہ: ''کہہ دو کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے۔''

یہ ہے وہ عبادت جس کا انسان مکلف کیا گیا ہے جس میں نماز اور مناسک بھی آتے ہیں، شعائر عبادت اور پوری زندگی بھی آتی ہے۔ عبادت بذات خود وہ چیز ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے صرف زندگی کو نہیں بلکہ انسان کے مرنے اور جان دینے تک کو بھی گھیر لیتی ہے۔ مرنا بذات خود عبادت ہے، یعنی ایک ایسا کام جس میں انسان کا اپنا کوئی اختیار ہی نہیں اس فرمان (وَمحیای و مماتی للہ رب العالمین) سے مراد یہ ہے، کہ انسان مرے تو اس حال میں کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرتا ہو۔ یہ انسان کے بوقت موت، حالت عبادت میں ہونے کی کم از کم سطح ہے۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو اس حال میں فوت ہوا کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، جنت میں داخل ہو گا۔'' [2]

اس کی اعلیٰ سطح یہ ہے کہ انسان کا مرنا شہادت فی سبیل اللہ ہو یعنی اللہ سے وابستگی کی وہ جیتی اور بولتی شہادت جو انسان اپنی جان قربان کر دینے کی صورت میں پیش کرتا ہے اور ایسی موت عبادت کی معراج ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{الذِینَ یَذکُرُونَ اللہَ قِیمًا و قُعُودًا و عَلٰی جُنُوبِھِم}[3]

ترجمہ: جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حالت میں اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

---

1 سورۃ الانعام ٦: ١٦٢

2 صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: من مات علی التوحید دخل الجنۃ، حدیث: ٢٦

3 سورۃ آل عمران ٣: ١٩١

یہ اللہ کو یاد کرنا زبان سے یا دل سے یاد کرنے میں قید نہیں اس یادالٰہی کا ذریعہ ایک مسلمان کا عمل، کردار، رویہ اور سرگرمی بھی ہے جو وہ عبادت کے جذبے سے ہی سرانجام دیتا ہے۔ دور اول کے مسلمان کا راز حیات میں شریک رہتے ہوئے عبادت سے عہدہ برآ ہو رہے ہوتے تھے۔ زندگی کے ہر میدان میں عبادت کی کوئی نہ کوئی صورت ان کی منتظر ہوتی۔ وہ اللہ کو یاد کرتے تو یہ سوال ان کے سامنے آکھڑا ہوتا کہ وہ جس موقع، جس صورت یا جس مقام پر ہیں کیا وہ اللہ کو راضی کرنے کا موجب ہے یا اسے ناراض کرنے کا موجب ہے۔ اگر وہ رب کو راضی کرنے والا ہوتا تو اپنے مالک کی حمد و تعریف کرتے اور اگر دوسری صورت ہوتی تو تائب ہونا، رب کی جانب پلٹنا اور مغفرت کا سوال زبان پر لانا ہی ان کے لیے ذکر الٰہی ہوتا:

{وَالذِینَ اِذَا فَعَلُوا فَا حِشَةً اَو ظَلَمُوا اَنفُسَهُم ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاستَغفَرُو لِذُنُوبِهِم وَمَن یَغفِرُ الذُ نُوبَ اِلا اللّٰہ وَلَم یُصِروا عَلٰی مَا فَعَلُوا وَهُم یَعلَمُونَ } [1]

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جب کوئی کھلا گناہ کر بیٹھے یا اپنے حق میں ظلم کریں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں سے بخشش مانگتے ہیں ، اور اللہ کے علاوہ کون گناہ بخشنے والا ہے، اور اپنے کیے پر وہ اڑتے نہیں اور وہ جانتے ہیں۔''

جب وہ اللہ کو یاد کرتے تو یہ سوال ان کے سامنے آئے بغیر نہ رہتا کہ یہ لحظہ جو ان کو اس وقت درپیش ہے اس میں اللہ ان سے کیا چاہتا ہے یعنی اس لمحے اور اس حالت میں اللہ کی جانب سے ان پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔ ان فرائض کو ادا کرنا ہی ذکر الٰہی کرنا تھا چاہے یہ فرض نماز، روزے اور دیگر شعائر عبادت کا ہو یا یہ فرض گھریلو زندگی میں بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا ہو یا یہ فرض میدان جہاد کرنے کا ہو یا پھر حلال روزی تلاش کرنے کا حتی کہ شغل و تفریح اور خوشی منانے کا یہ سب ہی عبادت ہے۔

''نبی ﷺ نے صحابہ کو جو دن رات اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، کہ اس کو آرام دو تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو''۔ [2]

غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا اللہ کے احکام کی فرمانبرداری اور اس کی عبادت ہے۔ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

{یٰٓاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ} [3]

ترجمہ: اے اہل ایمان! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

---

1 سورۃ آل عمران ۳: ۱۳۵

2 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب: صنع الطعام والتکلف للضیف، حدیث: ۶۱۳۹

3 سورۃ البقرہ ۲ : ۱۷۲

اس آیت سے یہ بات عیاں ہوئی کہ پاک روزی ڈھونڈ ھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے۔ کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین کی بات کرنا اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

{قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى}[1]

ترجمہ: "اچھی بات کہہ دینا اور در گزر کرنا اس خیرات سے افضل ہے جس کے بعد ستانا ہو۔"

ایک حدیث میں ہے "واماطة الاذى عن الطريق صدقة" [2]

ترجمہ: راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹادینا بھی خیرات ہے۔

لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔

ابو مسعود انصاری رضی اللہ نے ارشاد فرمایا:

مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے[3]

غریب اور نادار صحابہ نے در بار رسالت میں ایک دن شکایت کی، کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں وہ بھی روزے رکھتے ہیں ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں جو ہم نہیں بجالا سکتے۔ فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا" یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے" فرمایا کہ اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا۔[4]

اسلام اللہ کا دین ہے، محمدؐ پر اللہ کی آخری شریعت نازل ہوئی، اللہ کے احکامات زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں نازل ہوئے۔ یہ زندگی اجتماعی ہو یا انفرادی، گھریلو ہو یا سماجی، معاشی ہو یا سیاسی، انسان سکھ میں ہو یا دکھ میں، عشق میں ہو یا نفرت میں، جنگ میں ہو یا امن میں، عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بوڑھا الغرض انسانی وجود کے ہر پہلو کو اللہ کی عبادت گھیرے ہوئے ہے۔ زندگی

---

1 سورۃ البقرۃ ۲: ۲۶۳

2 صحیح البخاری ،کتاب :الھبۃ وفضلھا والتحریض علیھا، باب : فضل المنیحۃ، حدیث :۲۶۳۱

3 صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقۃ علی الاھل، حدیث: ۵۳۵۱

4 ادب المفرد، باب: کل معروف صدقہ، دار البشائر الاسلامیۃ بیروت ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء، حدیث: ۲۲۷ صحیح

کا کوئی شعبہ بھی عبادت سے خارج نہیں چونکہ انسان کے وجود میں آنے کا کوئی مقصد ہی نہیں سوائے اس کے کہ عبادت کرے۔ زندگی کو کوئی پہلو بندگی سے باہر نہیں ہو سکتا۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

{وَاعبُدُوا اللهَ وَلاَ تُشرِكُوا بِهِ شَيئاً و بِالوَالِدَينِ اِحسَانًا وبِذِى القُربٰى وَاليَتٰمٰى وَالمَسٰكِينِ وَالجَارِ ذِى القُربٰى وَالجَارِ الجُنُبِ وَابنِ السبِيلِ وَمَا مَلَكَت اَيمَانُكُم } [1]

ترجمہ: ”اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کا شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ اور پاس بیٹھنے والے مسافر اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی نیکی کرو۔“

{اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓى اَهْلِهَاۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا} [2]

ترجمہ: ”بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمہیں نہایت اچھی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حاکم ہوں، پھر اگر آپس میں کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لاؤ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو، یہی بات اچھی ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔“

{فَليُقَاتِل فِى سَبِيلِ اللهِ الَذِينَ يَشرُونَ الحَيٰوةَ الدُنيَا بِالآخِرَةِ وَمَن يُقَاتِل فِى سَبِيلِ اللهِ فَيُقتَل اَو يَغلِب فَسَوفَ نُؤتِيهِ اَجرًا عَظِيمًا} [3]

ترجمہ: پس چاہیے کہ وہ لوگ جو دنیا کو آخرت کے عوض بیچ چکے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کریں اور جو شخص اللہ کی راہ میں لڑتا ہے پھر چاہے وہ شہید ہو جائے یا غالب آ جائے ہم عنقریب اس کو بہت بڑا اجر عطا کریں گے۔

{وَعَاشِرُوهُن بِالمَعرُوفِ فَاِن كَرِهتُمُوهُن فَعَسٰى اَن تَكرَهُوا شَيئًا و يَجعَلَ اللهُ فِيهِ خَيرًا كَثِيرًا} [4]

ترجمہ: ” ان کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرو گو وہ تمہیں ناپسند ہوں بہت ممکن ہے کہ تم کسی ایسی چیز کو ناگوار ہو جس میں اللہ نے تمہارے لیے بھلائی رکھ دی ہو۔“

---

1 سورۃ النساء ۴: ۳۶

2 سورۃ النساء ۴: ۵۸ - ۵۹

3 سورۃ النساء ۴ : ۷۴

4 سورۃ النساء ۴ : ۱۹

{هُوَالَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الاَرضَ ذَلُولاً فَامشُوا فِی مَنَاکِبِهَا وَکُلُوا مِن رِزقِه }[1]

ترجمہ:" وہی ذات ہے جس نے تیرے لیے زمین کو مسخر کیا ہے، چلو اس کی چھاتی پر اور اللہ کا رزق کھاؤ۔"

{وَاَقِیمُوالوَزنَ بِالقِسطِ وَلاَ تُخسِرُو المِیزَانَ}[2]

ترجمہ: انصاف کے ساتھ ٹھیک توازن کرو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔

اسی طرح رسول ﷺ کا فرمان ہے:

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃ"[3]

ترجمہ: "علم حاصل کرنا فرض ہے"

"اللہ نے ہر چیز میں احسان لازم کر رکھا ہے۔ پس جب تم قتل کرو تو بھی احسان سے اور ذبح کرو تو بھی احسان سے اور چاہیے کہ آدمی اپنی چھری تیز کرلے اور جانور کو ذبح کرتے وقت راحت پہنچائے۔" [4]

"تم میں سے کوئی شخص کھائے تو داہنے ہاتھ سے کھائے، پیے تو داہنے ہاتھ سے کیونکہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے"[5]

ان سب آیات اور احادیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادات بذات خود کچھ ایسے مطالبات اور تقاضے رکھتی ہیں جن کا ربط روزمرہ زندگی سے ہی ہے، یعنی یہ عبادات ایسی چیز نہیں ہیں، کہ آپ نے ان کو ارکان و شروط و واجبات و مستحبات سمیت ادا کر دیا تو وہ ادا ہو گئی، خود ان عبادات کے ساتھ کچھ نجی و سماجی مطالبات جڑی ہیں، خود انہیں کچھ لازمی نتائج کا پابند بنا دیا گیا ہے، یوں کہ یہ آثار و نتائج پائے جائیں تو یہ شعائر اپنے حقیقی معنی میں پائے جائیں گے، دوسری صورت میں نہیں پائے جائیں گے۔ اس لحاظ سے شعائر عبادت خود بھی مسلم زندگی اور مسلم معاشرہ میں باقاعدہ ایک کردار رکھتے ہیں اور یہ کردار ادا ہوئے بغیر ان کا ادا ہو جانا اللہ کو ہرگز پسند نہیں ہے۔

---

1 سورۃ الملک ۶۷: ۱۵

2 سورۃ الرحمٰن ۵۵: ۹

3 سنن ابن ماجہ، المقدمہ، باب: فضل العلماء والحث علیٰ طلب العلم، حدیث: ۲۲۴۔۔۔ صحیح

4 صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب: الامر باحسان الذبح، حدیث: ۱۹۵۵

5 صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، باب: آداب الطعام والشراب واحکامھا، حدیث: ۲۰۲۰

عبادت کے معمولات زندگی پر اثرات:

توحید کا ایک اہم باب اللہ کی حاکمیت ہے، یہ زمین اللہ کی ہے اور اس پر حکم و دستور بھی اللہ کا چلنا چاہیے، حلال و حرام، جائز و ناجائز طے کرنے کا اختیار محض اللہ کو حاصل ہے، اسی کے احکامات پر عمل کرنے سے دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی ملتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"لتنفضن عرى هذاالدين عروة عروة، فاولها نقضا الحكم ، وآ خرها نقضاً الصلاة"[1]

ترجمہ: اس دین کی کڑیاں یقیناً ایک ایک کر کے ٹوٹیں گی اس کی جو پہلی کڑی ٹوٹے گی وہ حکم (اسلام کا اقتدار) ہوگا، اور آخری کڑی جو ٹوٹے گی وہ نماز ہے۔

توحید کی یہ کڑی یعنی اسلام کا اقتدار آپ ﷺ کی پیشن گوئی کے عین مطابق ٹوٹ رہا ہے۔ زمین پر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے فیصلے ہونے لگے اور اللہ کا دین بطور قانون و دستور ریاستوں میں قائم نہ رہا۔ افسوسناک معاملہ محض اسلام کے اقتدار کا ختم ہونا نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑھ کے امت کے لیے جو افسوس ناک بات ہے، وہ یہ کہ اللہ کی حاکمیت کو جو مقام اللہ نے دیا تھا وہ مسلمانوں کی اکثریت کے ذہنوں سے نکل چکا ہے۔ وہ بھول گئے کہ اللہ کا حکم نافذ کرنا اور اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کروانا توحید اور عبادت ہے۔

عبادت کو شعائر میں محصور کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ سیاست کو عبادت سے جدا کر دیا گیا اب سیاست کا اللہ کی عبادت سے کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا۔ اللہ کی شریعت کو فیصلہ کن ماننا، ریاستوں کی پالیسیاں قرآن سے لینا، دوستی و دشمنی کے اصول سنت مصطفی ﷺ سے لینا، جائز و ناجائز کا سوال شریعت سے کرنا، ہیرو کون اور زیرو کون، عزت والا کون اور ذلت والا کون اس کا پتا دین سے لگانا، حکمرانی کا حقدار کون اور تختہ دار پر لٹکنے کا حقدار کون اس کا علم وحی سے حاصل کرنا توحید نہ رہا! عبادت نہ رہا۔ اس سب کو سیاست بنا کر دین سے جدا کر دیا گیا اور پھر اس میں ہدایت اللہ رب العزت سے لینے کی بجائے اور خداؤں سے لینے لگے ۔ کہیں پارلیمنٹ کو خدا کے درجہ پر فائز کیا تو کہیں خود ساختہ دستور اور قانون کو! کہیں وقت کی کفریہ طاقتوں کو سجدہ کیا تو کہیں انسانی فلسفوں کو سجدہ کیا۔ رسول ﷺ نے ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل جہاد قرار دیا۔

"اِن مِن اَعظَم الجہَاد کَلِمَۃ عَدل عِندَ سُلطَانٍ جَائر"[2]

ترجمہ: سب سے فضیلت والا جہاد وہ ہے جو جابر حکمران کے آگے حق بات کہے۔

---

1 مسند احمد، مسند الشامئین، جلد: ۲۹، ص: ۵۷۳ حدیث حسن لغیرہ

2 سنن ابی داؤد، اول کتاب الملاحم، باب: الامر والنھی، حدیث: ۴۳۴۴، صحیح۔ سنن ترمذی، ابواب الفتن عن رسولؐ باب: افضل الجھاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر' حدیث: ۲۱۷۴

سیاست میں حصہ ''امر بالمعروف''اور ''نہی عن المنکر''ہی کے حکم پر ہے، یہ امت کی اجتماعی ذمہ داریوں میں سے ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے،اس وجہ سے یہ امت بہترین امت قرار دی گئی ہے مگر سیاست کو عبادت سے خارج کرنے کی وجہ سے اسلام کا اقتدار قائم نہیں رہا۔

سیاست کو عبادت سے الگ کرنا، حاکم کا احتساب اور حق پر قائم رہتے ہوئے اس کے لیے ہمدردانہ نصیحت واصلاح اور حاکم کو معروف کی جانب توجہ دلانا اور منکر سے روکنا تاکہ حکومت کا معاملہ اللہ کی شریعت کے مطابق صحیح سلامت چلتا رہے اور وہ عدل وانصاف کی اس صورت پر قائم رہے جو مسلم معاشرے کے حق میں اللہ کا حکم ہے، اور اس کے نتیجے میں اسلام کا بول بالا رہے اور معاشرہ اسلام کے وہ ثمرات سمیٹتا رہے جو حق اور عدل پر قائم رہنے کا نتیجہ ہے اور جو کہ اللہ کی طرف سے اتمام نعمت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔قرآن میں ارشاد ہے:

{اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا}[1]

ترجمہ: ''آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے۔''

حاکم کا احتساب اور اس سے ملحقہ یہ سب امور عبادت سے باہر ہو گئے۔ یہ بہت اچھے کام سہی مگر آج مسلمانوں کے نزدیک عبادت وہی جو شعائر کی صورت میں ادا ہو۔اللہ فرماتا ہے:

{يَآيہَا الذِينَ اٰمَنُوا اَطِيعُو اللهَ وَ اَطِيعُوا الرَسُولَ وَاُولِي الاَمرِ مِنكُم فَاِن تَنَازَعتُم فِي شَيءٍ فَرُدُوهُ اِلَى اللهِ وَالرَسُولِ اِن كُنتُم تُؤمِنُونَ بِاللهِ وَاليومِ الآخِرِ، ذٰلِکَ خَير وَاَحسَنُ تَاوِيلًا}[2]

ترجمہ: '' اے اہل ایمان! اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حکمران ہوں، پھر اگر تمہارے مابین کسی معاملہ میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی جانب موڑ دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھتے ہو یہی بات افضل اور انجام کے حوالے سے بھی بہتر ہے۔''

یہ آیت مسلم معاشرے کے اندر اختیارات کے سرچشمہ کا نہایت واضح تعین کرتی ہے یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے پیغمبر ﷺ کی مطلق فرمانبرداری ہر ہر امر میں ہر ہر نہی میں، کتاب میں اور سنت میں وارد ایک ایک حکم کی اطاعت بلاچوں وچراں کی جائے۔اس کے بعد اولی الامر کی اطاعت ہے، جو کہ مطلق اور قائم بالذات اطاعت نہیں کہ جس طرح اللہ اور رسول ﷺ کو پلٹ کر پوچھنا جائز نہیں کہ یہ حکم کیوں اور کیسے دیا ویسے ہی حکمران کو ہر قسم کی جوابدہی سے بالاتر رکھا جائے۔ یہ اللہ اور

1 سورۃ المائدۃ۵: ۳

2 سورۃ النساء ۴: ۵۹

پیغمبر ﷺ کی فرمانبرداری کے تابع ایک فرمانبرداری ہے، یہ اللہ اور نبی ﷺ کی فرمانبرداری کی پابند ایک اطاعت ہے، یعنی جہاں یہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے خروج کرلے وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اسی طرح اخلاق وہ جامع اور وسیع دائرہ ہے جو انسان کے تمام معاملات کو اپنی زد میں لیتا ہے۔ انسان کی زندگی میں کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں جو اخلاق کے دائرہ کار میں نہ آتی ہو۔ انسان کا رویہ و سلوک، اس کی فکر، اس کے احساسات و جذبات، میل جول، رہن سہن، سیاست، سماج، معیشت، آرٹ کوئی چیز اخلاق سے مستثنیٰ نہیں۔ انسان کی تمام سرگرمی کو دراصل اسلامی اخلاقی ضابطے سے پھوٹتا ہے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

{اَفَمَن يعلَمُ اَنَمَا اُنزِلَ اِلَيکَ مِن ربکَ الحَقُ کَمَن هُوَ اَعمٰى اِنَمَا يَتَذَکَرُ اُولُو الاَلبَابِ، الَذِينَ يُوفُونَ بِعَهدِاللهِ وَلَا يَنقُضُونَ المِيثَاقَ، وَالَذِينَ يَصِلُونَ مَآ اَمَرَ اللهُ به اَن يُوصَلَ وَ يَخشَونَ رَبهُم وَيَخَافُونَ سُوْءَ الحِسَابِ ، وَالَذِينَ صَبَروا البتِغَاءَ وَجهِ رَبهِم وَاَقَامُواالصَلٰوةَ وَ اَنفَقُوا مِمَا رَزَقنٰهُم سِرًا وَ عَلَا نِيَةً وَ يَدرءُونَ بِا لحَسَنَةِ السيئةِ اُولٰئِکَ لَهُم عُقبَى الدَارِ}[1]

ترجمہ: ''بھلا جو شخص جانتا ہے کہ تیرے رب سے تجھ پر جو کچھ اترا ہے حق ہے اس کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھا ہے، سمجھتے تو عقل والے ہی ہیں۔ وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس عہد کو نہیں توڑتے۔ اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جس کے ملانے کو اللہ نے فرمایا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔ وہ جنہوں نے اپنے رب کی رضامندی کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور ہمارے دیے ہوئے میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا اور برائی کے مقابلے میں بھلائی کرتے ہیں انہیں کے لیے آخرت کا گھر ہے۔''

یہ عہد اعتقاد، رویے اور ذہنیت سے متعلقہ کچھ عظیم ترین امور پر مشتمل ایک چیز ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی ایک اخلاقی تصویر ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اخلاقی پابندی کا اصل منبع عبادت الٰہی ہے، جس سے پہلے اللہ کی الوہیت اور محمدؐ پر اترے ہوئے ایک ایک لفظ کی صداقت پر یقین پختہ کرایا گیا ہے یعنی ایک اعلیٰ اخلاقی کردار رکھنا "لَا اِلٰہَ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ "پر یقین کا براہ راست تقاضا ہے۔

نبی ﷺ کی احادیث دیکھتے ہیں تو اخلاق کا ایمان سے ایک ایسا ٹوٹ رشتہ سامنے آتا ہے گویا اخلاق ہے تو ایمان ہے اور اخلاق نہیں تو ایمان بھی نہیں۔

"مَن کَانَ يُؤمِنُ بِاللهِ وَاليَومِ الآخِرِ فَليُحسِن اِلٰى جَارَه ، وَمَن کَانَ يُؤمِنُ بِاللهِ وَاليَومِ الآخِرِ فَليُکرِم ضَيفُه، وَمَن کَانَ يُؤمِن بِاللهِ وَاليَومِ الآخِرِ فَليَقُل خَيرًا اَو لِيَسکُت" [2]

---

1 سورۃ الرعد ۱۳: ۱۹۔۲۲

2 صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: اکرام الجار والضیف، حدیث: ۴۸

ترجمہ: ''جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کے ساتھ احسان کرے، جو بندہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مہمان کا اکرام کرے، جو بندہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ بھلائی کی بات کرے یا پھر چپ رہے۔''

آپؐ نے فرمایا: '' اللہ کی قسم وہ بندہ مسلمان نہیں، اللہ کی قسم وہ بندہ مسلمان نہیں، اللہ کی قسم وہ بندہ مسلمان نہیں'' صحابہؓ نے عرض کیا: کون یا نبی ﷺ؟ ارشاد فرمایا: '' جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں''[1]

دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

''اَربع مَن کُن فِیہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا ، وَمَن کَانَ فِیہِ خِلۃ مِنھُنَ کَانَ فِیہ خِلۃ مَن النِفَاق حَتٰی یَدَعھَا : اِذَا حَدَثَ کَذَبَ، وَاِذَا عَاھَدَ غَدَر ، وَاِذَا وَعَدَ خُلِفَ، وَاِذَا خَاصَمَ فَجَر''[2]

ترجمہ: منافق کی چار نشانیاں ہیں جس میں چاروں ہوں گی وہ اصل منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک عادت ہو گی اس میں نفاق کی ایک عادت ہو گی۔ پہلی نشانی یہ ہے کہ کہ بات کریں تو جھوٹ بولے۔ دوسری نشانی وعدہ کریں تو خلاف ورزی کریں، تیسری نشانی امانت رکھی جائے تو خیانت کریں اور چوتھی نشانی جب جھگڑے تو بدزبان کریں۔

''سُئِلَت عَائِشَۃَ رَضِیَ اللہ عَنھَا عَن خلق رَسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَت: کَانَ خلقہ اُلقُرآن ''[3]

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے رسول ﷺ کے اخلاق کی بابت دریافت کیا گیا ام المؤمنین نے جواب دیا: آپؐ کا اخلاق خود قرآن ہی تھا۔

کتاب اور سنت کے اس پورے بیان سے واضح ہے کہ دین میں اخلاق ایک نہایت مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاق براہ راست ایمان سے پھوٹتا ہے اور مومن کا اخلاق سے آراستہ ہونا عبادت الٰہی کی ایک نہایت عظیم صورت ہے۔

اخلاق کو عبادت سے باہر کرنے کے نتائج:

عبادت کا مفہوم جب سکیڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس کو شعائر میں محصور جان لیا گیا تو عقیدہ کی طرح اخلاق بھی رفتہ رفتہ عبادت کے مفہوم سے باہر ہوتا چلا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشرے میں یہ بات کسی کے کان کھڑے کر دینے والی نہ رہی کہ ایک آدمی مسجد کا باقاعدہ نمازی ہے بلکہ مسجد اس کی روٹین ہے مگر پرلے درجے کا جھوٹا اور بددیانت ہے۔

آپؐ سے پوچھا گیا:

---

1 مسند احمد، ۱۳/ص: ۲۶۱ حدیث: ۷۸۷۸ ۲۰۱۶ و مسلم: ۴۶

2 صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب: علامۃ المنافق، حدیث: ۳۴، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: بیان خصال المنافق، حدیث: ۵۸

3 مسند احمد، حدیث: ۲۵۸۱۳، ۴۳/ص: ۱۵

"کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ پھر پوچھا گیا کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں"[1]

یہ بات کسی کو حیران تک نہیں کرتی کہ آدمی مسجد میں نماز پڑھ کر باہر آئے، ٹھگی اور فراڈ کرے! جبکہ رسول ﷺ فرماتے ہیں: "مَن غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا"[2]

ترجمہ: جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بات کسی کو متعجب نہیں کرتی کہ ایک آدمی مسجد میں نماز پرھ کر باہر آئے اور اپنی اس امانت یا ذمہ داری میں جو اس کو سونپ رکھی گئی ہے خیانت کرے یا وعدہ خلافی کرے جبکہ رسول ﷺ نے اسے علامات نفاق میں شمار فرمایا ہے۔

انہونی بات یہ نہیں کہ لوگوں میں اخلاقی قیود سے جان چھڑانے کے رجحانات پرورش پانے لگیں کیونکہ اخلاقی قیود پر پورا اترنا ایک مشکل کام ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اخلاق کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں اور عبادت کچھ مخصوص اعمال شعائر کا نام ہے، آپ وہ کر رہے ہیں تو عبادت تو ہو رہی ہے لیکن یہ اخلاقی خرابیاں ایک بڑی لعنت ہیں اور خود ہمارے واعظ کوئی خطبہ اس پر بات کیے بغیر نہیں چھوڑتے لیکن اس کو عبادت کے ساتھ خلط مت کریں، عبادت جس چیز کا نام وہ بہر حال نماز، روزہ اور ذکر اذکار اور وظائف وغیرہ ہی ہے، یہاں تک کہ امت کے حق میں یہ شرمناک واقعہ پیش آیا کہ معاصر جاہلیت (مغرب) اپنا یہ امتیاز پیش کرنے لگی کہ روزمرہ معاملات میں اس کے ہاں سچ کا التزام زیادہ ہے۔ دیانتداری اسکے ہاں زیادہ ہے، کرپشن اور فراڈ اسکے ہاں ہماری نسبت کم ہے جبکہ ہماری یہ امت اسلامیہ سرتاپاؤں بددیانتی، غبن، جھوٹ، خیانت اور وعدہ خلافی پر مبنی ہے۔ یہ مسلمانوں کے اخلاق ہی تھے جو کبھی لوگوں کو اسلام میں لانے کا موجب تھے اور آج یہ مسلمانوں کے اخلاق ہی ہیں جو اللہ کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

داعیان اسلام اقوام مغرب کو اسلام کے متعلق جو بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بات بتائیں وہ زبان حال یا زبان قال سے یہی کہتے ہیں کہ تمہارے پاس اگر واقعی کوئی ایسا خوبصورت دین ہے تو تمہارا اپنا معاملہ اس قدر بدصورت کیوں ہے؟ یہ کرپشن، جھوٹ، دھوکہ دہی، دو نمبری وعدہ خلافی، آپس کی بدسلوکی، اختلاف اور نزاع، یہاں تک کہ کسی ایک چیز پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یوں ہم مسلمان ہی دعوت اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں انسان صرف ہماری وجہ سے اسلام

---

1 موطا امام مالک، مؤسسۃ زاید بن سلطان الامارات، ۱۴۲۵ھ، بمطابق ۲۰۰۴ء، حدیث: ۱۶۶۶، ۳/ص: ۶۵۱

2 صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: النھی عن الغش، حدیث: ۲۲۲۵

سے دور ہیں۔ اس کے باوجود یہ سب دیکھ کر افسوس ضرور کر لیا جائے گا، مگر اخلاق اور عبادت رہیں گے دو الگ الگ دائرے یعنی اخلاق کو توحید اور عبادت کا اصل جزو بہر حال نہ مانا جائے گا[1]

امام غزالی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"عبادات انسان کے قلب کی صحت کے لیے وہی حکم رکھتی ہیں جو دوائیں اس کی بدنی صحت کے لیے جب کہ وہ دوا کے خواص اور اس کی ترکیب کے راز کو نہیں سمجھتا، اسے طبیب سمجھتا ہے یا وہ عالم جس نے اس کے علم میں اختصاص حاصل کیا ہو۔ طبیب جو دوائی تجویز کرتا ہے ہر مریض اس کی تقلید کرتا ہے، اور اس سے اس بارے میں بحث و مباحثہ نہیں کرتا لہذا مجھے بالیقین معلوم ہوا کہ عبادات کی دوائیں اپنی حدود اور مقداروں کے ساتھ انبیاء کی طرف سے مقرر شدہ ہیں۔ ان کی تاثیر کی وجہ کو عقلمندوں کی عقل کی پونجی کے ساتھ نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلکہ ان میں انبیاء کی تقلید کی ضرورت ہے۔ جنھوں نے ان خواص کو عقل کی پونجی سے نہیں نور نبوت سے سمجھا ہے اور جس طرح ادویات اپنے خواص کے لحاظ سے مقدار، وزن اور نوع میں اختلاف کے راز سے خالی نہیں ہوتیں، اسی طرح سے عبادات ہیں جو دلوں کی بیماریوں کی دوائیں ہیں جو مختلف قسم کے افعال اور مختلف مقداروں سے مرکب ہیں، حتی کہ سجود کا رکوع سے دوگنا اور صبح کی نماز سے مقدار میں نصف ہونے میں کوئی نہ کوئی راز ہے اور وہ خواص کی اس قسم سے ہے جسے نور نبوت کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔"[2]

جن لوگوں نے عبادت کی جزیات میں کسی جزو کی حکمت معلوم کرنے کی کوشش کی وہ گمراہ ہوئے اور جب حج جیسی عبادت کے بعض تفصیلات کے اسرار ان پر نہ کھلے تو وہ خود بھی شک میں مبتلا ہو گئے اور دوسروں کو بھی انھوں نے شک میں مبتلا کر دیا اور وہ اس شک میں صراط مستقیم سے بھٹک گئے۔ نماز میں قیام ورکوع و قعود و سجود کی حرکات اعلیٰ حکمت عملی اور تدبیر پر مبنی ہیں۔ اگر اہل یورپ میں اسلامی نماز کا رواج ہوتا تو ہمیں جسمانی ورزش کے لیے نئی نئی ورزشی حرکتیں ایجاد نہ کرنا پڑتیں ایشیاء کے گرم ملک میں انسانی جسم کے اندر چربی زیادہ پیدا ہوتی ہے اور سجدہ میں دونوں ہاتھ اور دیگر اعضاء ایک خاص کشش کے ساتھ پھیلانا اور سمیٹنا مناسب فربہی کی مضرتوں کو دور کر دیتا ہے۔[3]

عبادات کی ہماری روزمرہ زندگی پر مثبت اثرات:

عبادات کا ہماری زندگی پر بہت سے اثرات ہیں تاہم میں یہاں مختصر انداز میں اس پر روشنی ڈالوں گا۔

---

1 عبادات: ص:۲۶

2 امام غزالی، المنقذ من الضلال، دار الکتب الحدیث، مصر، س۔ن، ص:۲۰۳

3 اشرف علی تھانوی، احکام اسلام عقل کی نظر میں، اسلامی کتب خانہ اردو بازار لاہور س۔ن، ص:۳۱۱۔۳۱۲

نماز:

اسلام کی عبادت کا پہلا رکن نماز ہے جو امیر غریب، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، بیمار و تندرست، تمام لوگوں پر فرض ہے۔ نماز ہی عبادت ہے جو کسی بندے سے کسی حال میں بھی ترک نہیں ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو اور اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔[1] اور اگر رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو۔[2]

عبادت روح کے اسی فطری جواب کا مطالبہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش و جنون کا علاج ممکن نہیں۔ یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں کچھ ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت اور اسکا ترک کفر کی نشانی بتائی گئی ہے۔ نماز دین کا ستون ہے جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ قرآن میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:

{اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ}[3]

ترجمہ: اللہ ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔

نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے اسی لئے قرآن میں اس نکتہ کی شرح کی گئی۔

{وَاَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ}[4]

ترجمہ: اور نماز کے پابند رہو بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے، اور دوسرا یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بالاتر کوئی چیز نہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہیں۔

{اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ}[5]

---

1 نیل الاوطار، بروایت موقوف از دار قطنی، ۲ /ص ۲۸

2 مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب جواز صلاۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر حیث توجہت

3 سورۃ الرعد ۱۳: ۲۸

4 سورۃ العنکبوت ۲۹ :۴۵

5 سورۃ فاطر ۳۵ : ۱۸

ترجمہ : تو انہیں کو تو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے حاصل کرتا ہے اور آخر خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

{اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ}[1]

ترجمہ : بے شک انسان بے صبرا بنا ہے جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی ان باتوں سے پاک ہیں جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

نماز سے انسانی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ نماز کی وجہ سے انسان ہر اس کام سے رک سکتا ہے جس سے قرآن نے منع فرمایا۔ نماز سے بندے میں عاجزی پیدا ہوتی ہے کیونکہ دن میں پانچ مرتبہ جب انسان اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہو کر سر بسجود ہوتا ہے اس میں عاجزی والی صفت پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ جان جاتا ہے، کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا شرک کے زمرے میں آتا ہے۔

روزہ:

اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن روزہ ہے۔ ہر شخص اس دن جہنم کے دردناک عذاب سے بچنا چاہتا ہے اور دار آخرت میں بہتری کا طلب گار ہے مگر آخرت میں کامیابی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ راستہ تقویٰ ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے مؤثر طریقہ روزہ ہے۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے:

{يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ }[2]

ترجمہ: "اے اہل ایمان! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔"

روزہ ہمارے عمل، ہمارے اخلاق اور ہماری روح پر ایسے اثرات مرتب کرتا ہے کہ ہمارے لئے شیطان کی ترغیبات اور نفس کے داعیات کے باوجود تقوے کی نشوونما ممکن ہو جاتی ہے۔ روزہ ہماری عملی، اخلاقی اور روحانی زندگی پر اثرات قائم کرتا ہے، رمضان میں پورا ماحول اللہ کی عبادت میں سرگرم ہوتا ہے اس لئے ہر شخص کے اندر عبادت کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ یہ مہینہ ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم رضائے الٰہی کی جستجو میں نماز کو اپنے معمولات کا سب سے اہم حصہ بنائیں اور رمضان کے علاوہ باقی مہینوں میں بھی نماز کو پابندی سے ادا کیا جائے۔

---

1 سورۃ المعارج۔۷۰ : ۱۹۔۲۲

2 سورۃ البقرہ: ۲ : ۱۸۳

رمضان میں مطالعہ قرآن کی اہمیت دو پہلوؤں سے ہے۔ایک یہ کہ رمضان وہ برکت والا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔اللہ کا ارشاد ہے:شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِی أُنزِلَ فِیهِ الۡقُرۡآنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ
ترجمہ:''یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ''[1]

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کی قرآن مجید سے خاص مناسبت ہے۔دوسرے یہ کہ اس مہینے میں اللہ کی بات سننے اور سمجھنے کی طلب ہر دل میں پیدا ہوتی ہے اور خلوت میسر ہونے اور روزمرہ مصروفیات میں کمی کی وجہ سے فہم قرآن کا پورا موقع میسر آجاتا ہے۔انسان رمضان میں زیادہ سے زیادہ قرآن کا مطالعہ کرتا ہے اور دن کا زیادہ تر حصہ اسکا قرآن کے ساتھ ربط میں گزرتا ہے۔

اللہ کی یاد کو قائم رکھنے ،مال واولاد کے فتنوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اس کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کیا جائے۔رمضان میں انسان اس نیکی کا بھرپور اظہار کرتا ہے اس موقع پر وہ اپنے ہمسائیوں، ناداروں اور ضرورت مندوں پر جس قدر ممکن ہو وہ خرچ کرتا ہے۔

رمضان میں نبی ﷺ کے انفاق کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ بیان کرتے ہیں:
''نبی ﷺ رمضان میں بہت سخاوت کرتے تھے۔آپؐ کی سخاوت چلتی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ ہوتی تھی''[2]
رمضان میں انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ روزہ دار کو افطاری کرائے یہ بھی انفاق کی ایک صورت ہے۔
حضرت زید بن خالدؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہے:''جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا،اس کے لئے روزہ دار کے برابر اجر ہے اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی''[3]

شیطان انسان پر جن راستوں سے زیادہ تاخت کرتا ہے وہ بطن اور فرج ہیں۔اگر انسان اپنے پیٹ اور اپنی شرم گاہ کے تقاضوں کو بے لگام نہ ہونے دے تو وہ بیش تر برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔روزے کے دوران میں کھانے پینے پر پابندی ہوتی ہے ۔فضول گفتگو سے پرہیز بھی ضروری ہوتا ہے اس وجہ سے زبان کے چٹخارے اور اس کی فتنہ انگیزیاں بند ہو جاتی ہیں۔اسی طرح انسان کی حیوانی ضروریات پر بھی ایک لمبے وقت کے لئے پابندی لگ جاتی ہے۔اس دوران بے راہ روی سے بچنے کی صورت پیدا

---

1 سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۸۵
2 صحیح بخاری، باب: کیف بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ ، حدیث:۶
3 سنن ترمذی، ابواب الصوم عن رسول اللہؐ حدیث:۸۰۷

ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شادی نہ ہونے کی صورت میں روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ نکاح کرے اور جو اس کی اسطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزہ رکھے"[1]

روزے میں انسان کا زیادہ تر وقت کم گوئی اور پروردگار کے مناجات میں گزرتا ہے اور اگر گفتگو کا موقع بھی ہو تو انسان اس گفتگو کو پاکیزہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ روزے میں فحش گفتگو سے دور رہے۔

نبی ﷺ نے روزے میں فحش گفتگو کرنے اور جھگڑنے سے منع فرمایا ہے:

"روزہ دار کو چاہیے کہ وہ روزے میں فحش باتیں نہ کرے، نہ بد تمیزی کرے، اگر کوئی شخص اس سے جھگڑے تو اسے کہہ دے کہ میں روزے میں ہوں"[2]

روزے کی حالت میں روزہ دار صبر و برداشت کا پیکر بن جاتا ہے۔ جب اس کے سامنے کھانا آتا ہے تو بھوک کے باوجود وہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے جب کوئی اس سے جھگڑتا ہے تو وہ یہ کہہ کر گریز کر لیتا ہے کہ میں روزے میں ہوں۔ روزہ انسان کی وہ تربیت کر دیتا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی آزمائش کو بھی خندہ پیشانی سے سہ لیتا ہے۔ تربیت کے اسی پہلو کی وضاحت میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یہی روزہ ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لئے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیت کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے، بلکہ اس صلاحیت کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تا کہ انسان کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کیے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدود الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اٹھائیں۔ ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے"۔[3]

---

1 صحیح بخاری، کتاب انکاح، باب: قول النبی من استطاع منکم البارۃ فلیتزوج، حدیث: ۵۰۶۵ ۱۷۸۷

2 صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب: فضل الصوم حدیث: ۱۸۹۴

3 تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن، جلد: ۱، ص: ۴۶۲

روح انسانی کی فطرت رجوع الی اللہ ہے مگر نفس کی خواہشات اور شہوات اس کی فطرت کو مجروح کرتی رہتی ہیں۔ روزہ نفس کے میلانات پر پابندی عائد کر کے روح کو اس کے فطری رجحان کے مطابق پروان چڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ نکلتا ہے کہ بندہ دنیا سے کٹ کر اللہ کی رضاجوئی کے لئے سر گرم عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزے کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین عبادت ہے۔

خلاصہ بحث:

اس باب میں درج بالا تمام فصول کا خلاصہ یہ ہے کہ کہ ہم خود اپنے اور پھر لوگوں کے ساتھ صراحت اور صاف گوئی سے کام لیں، آج جو چیز ان مسلم معاشروں میں پائی جارہی ہے اس کا نام اسلام نہیں، یہ وہ دین نہیں جو اللہ کے ہاں سے نازل ہوا ہے، یہ عبادت نہیں جس کا اللہ نے حکم دے رکھا ہے۔ یہاں اسلام، ایمان دین اور عبادت کی بابت تصورات کو ہی سر تا پاؤں بدلا جانا ہے اور پھر ان صحیح و مستند مفہومات کی بنیاد پر ایک مکمل نئی عمارت اٹھانی ہے۔ مسلم معاشروں میں آج جو یہ خاک اڑتی نظر آتی ہے، یہ پسماندگی جو ہر میدان میں نظر آتی ہے اس کی وجہ نہ مسلمان ہونا ہے اور نہ ہی کوئی نام نہاد معاشی ادوار، اس کا سبب صرف ایک ہے، مسلمان عمل اور کام کرنے کے میدان میں اسلام کی حقیقت سے دور ہو چکے ہیں، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ فہم اور تصور کے میدان میں بھی اسلام کی حقیقت سے غافل ہیں۔ آج جس چیز کو ہم اسلام سمجھتے ہیں وہ اسلام نہیں کچھ اور ہے ورنہ جس روز "وَاَعِدُوا لَهُم مَا استَعطُم مِن قُوةٍ" ایک عبادت تھی، اس روز کسی کی جرات نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی زمین پر پیر رکھ کر دکھائے، ان کو نسل در نسل غلام بنا رکھنا، ان کے وسائل کو لوٹنا اور خود انہی کو بیوروکریسی سے اپنے لیے ٹیکس کلکٹری کروانا تو بہت دور کی بات ہے۔

جس روز "طَلَبُ العِلمِ فَرِيضَة" ایک عبادت تھی، اس روز یہاں کوئی علمی پسماندگی اور سائنسی بدحالی نہیں تھی، بلکہ اس روز امت مسلمہ علم اور آگہی میں دنیا کی امام تھی۔ یہی یورپ ہے جو اس روز ہمارے سکولوں اور ہماری جامعات میں داخلے لیتا پھرتا تھا۔

جس روز "كُلُكُم رَاعٍ وَ كُلُكُم مَسؤُل عَن رَعِيَتِه" ایک عبادت تھی اور والی یہ جانتا تھا کہ دراصل وہ ایک راعی چرواہا ہے جس کو اپنے گلے کی بابت پوچھ گچھ ہونی ہے اس روز مسلمان معاشرے کے غریبوں اور ناداروں کو جلوس نکالنے کی ضرورت نہیں تھی، غربت اور معاشی ناہمواریوں کا علاج تو خود اس شریعت کے اندر ہے جو کہ اس روز مسلم معاشرے کے اندر قائم تھی۔

جس روز "وَعَاشِرُوهُنَ بِالمَعرُوف" ایک عبادت تھی، اس روز مسلمان عورت اپنے حقوق کے لیے سڑکوں پر خوار ہوتی نہیں پھر رہی تھی کیونکہ سب حقوق اور سب سماجی ضمانتیں بدرجہ اتم اس شریعت میں درج ہیں، جس کی لفظ بلفظ پابندی آپ سے

آپ اللہ واحد قہار کی عبادت ہے۔اس امت کا آخری حصہ ہر گز نہ سنورے گا جب تک وہ نقشہ نہ ہو جس پر اس کا اولین حصہ سنوارا گیا تھا۔

عبادت بذات خود کچھ ایسے مطالبات اور تقاضے رکھتی ہیں جن کا تعلق روز مرہ زندگی سے ہی ہے، یعنی یہ عبادات ایسی چیز نہیں ہے کہ آپ نے ان کو ارکان و شروط و واجبات و مستحبات سمیت ادا کر دیا تو بس وہ ادا ہو گئیں، خود ان عبادات کے ساتھ کچھ نجی و سماجی مطالبات جڑی ہیں، خود انہیں کچھ لازمی نتائج کا پابند کر دیا گیا ہے، یہ آثار و نتائج پائے جائیں تو یہ شعائر عبادت اپنے حقیقی معنی میں پائے جائیں گے، بصورت دیگر نہیں پائے جائیں گے۔اس لحاظ سے شعائر عبادت خود بھی مسلم زندگی اور مسلم معاشرہ میں باقاعدہ ایک کردار رکھتے ہیں اور یہ کردار ادا ہوئے بغیر ان کا ادا ہو جانا اللہ تعالیٰ کو ہر گز پسند نہیں۔

یہ عبادات بذات خود بھی فرض ہیں اور ان مقاصد اور مطالبوں کو پورا کرنے کی خاطر بھی فرض ہیں جو ان کے ساتھ جڑی ہیں، پس جب ہمارا ان کو ادا کرنا بھی اسی چیز تک محدود ہو گا اور وہ مقاصد اور مطالبے جو شریعت نے ان کے ساتھ جڑ کر رکھے ہیں ہماری نظر سے اوجھل ہوں گے تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم وہ عبادت حقیقی معنوں میں ادا کر رہے ہیں جو اللہ نے ہم پر فرض کر رکھی ہے۔

عبادت پورے نظام زندگی کا نام ہے جس میں تجارت و معیشت، سیاست و معاشرت، اخلاقیات اور معاملات، حقوق فرائضِ انسانی کی تفصیلات اور روح و باطن کی تسکین و اصلاح کے لیے عبادات کا سلسلہ بھی ہے۔جب ایک انسان کو تمام معاملات میں وحی الٰہی کی روشنی نصیب ہو جاتی ہیں تو پھر اس کا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھتا ہے۔اس کا زاویہ فکر کجی سے محفوظ اور شاہراہ زندگی کے تمام سنگ ہائے میل اس پر واضح ہو جاتے ہیں۔وہ اخلاق کردار کے اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے جسے اللہ پسند کرتا ہے ،اس کی داخلی و خارجی زندگی پر کسی زیغ و ضلال کا سایہ نہیں پڑتا۔وہ ایک امن پسند شہری، ایک دیانت دار تاجر، ایک عادل حکمران ،ایک کامیاب شوہر، خیر خواہ باپ اور غم خوار دوست بن جاتا ہے، غرض وہ معاشرے میں جس حیثیت کا بھی حامل ہوتا ہے، اسے خیر و خوبی کے ساتھ نبھانے والا ہوتا ہے۔

باب سوم: معاملات کے متعلق اسلامی تعلیمات اور معاصر تصورات

فصل اول: معاملات زندگی کی شریعت اسلامیہ میں اہمیت

فصل دوم: معاملات کے متعلق معاصر دینی تصورات و رویے

فصل سوم: قرآن و سنت کی روشنی میں معاملات کے صحیح تصور کی وضاحت

فصل اول: معاملات زندگی کی شریعت اسلامیہ میں اہمیت

باہمی سوادگری، خرید وفروخت ادھار وغیرہ کو ''معاملات'' کہتے ہیں۔ زندگی میں ایک دوسرے سے تعلق کے سبب باہمی معاملات ضروری ہے، بلکہ زندگی کا انحصار ہی معاملات پر ہے۔ اسلام نے دیگر شعبوں کے ساتھ باہمی معاملات میں بھی لوگوں کی راہبری کی ہے، تاکہ خرید وفروخت کرتے وقت انسان اسلامی احکامات کی روشنی میں اپنے معاملات کو حلال اور ناجائز چیزوں سے پاک رکھ سکیں، ایک دوسرے کے ساتھ بددیانتی، دھوکہ اور فریب وغیرہ جیسے غلط کاموں سے منع کر سکیں۔

معاملات کی شریعت اسلامیہ میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔ معاملات کی اہمیت کو قرآن وسنت کی تناضر میں دیکھتے ہیں:

1۔ حضرت عبداللہ بن ابیؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بازار میں بیچنے کے لیے کوئی سامان رکھا اور اس کے بیچنے کے سلسلے میں قسم کھائی تو یہ آیت نازل ہوئی:

{اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ وَاَيْمَانهُم ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِیْ الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَاب اَلِيْم }[1]

ترجمہ: جو لوگ اللہ کی قرار پر اپنی قسموں پر تھوڑا سا مول لے لیتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ قیامت کے دن ان سے نہ اللہ بات کرے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

2۔ ایک اور حدیث میں حضور پاکؐ فرماتے ہیں:

''جس نے جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق کھایا تو اس نے خود کو آگ کے لیے واجب کیا، راوی نے دریافت کیا اے نبی ﷺ اگروہ کوئی چھوٹی چیز ہو تب بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا'' اگرچہ وہ درخت کی سبز ٹہنی ہی کیوں نہ ہو''[2]

3۔ نبی ﷺ ایک بندے کے پاس سے گزرے جو کوئی غذائی جنس بیچ رہا تھا۔ آپؐ نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ آپؐ نے اس کے دام پوچھے اس نے بتادیے۔ آپ ﷺ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو اسے پانی سے نم پایا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا، یہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ بارش کا پانی پڑ گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تو اسے اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ سکتے؟ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا''[3]

ترجمہ: ''جس نے فریب کاری کی وہ ہم میں سے نہیں۔''

4۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا:

---

1 سورۃ آل عمران ۳ : ۷۷

2 صحیح مسلم، کتاب: الایمان، باب: وعید من اقتطع حق مسلم بیمین، حدیث: ۱۳۸

3 سنن ترمذی، ابواب: البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب: ماجاء فی کراھیۃ الغش فی البیوع، حدیث: ۱۳۱۵، صحیح

”اِنَّ اللہَ یَقُوْلُ اَنَا ثَالِثُ الشَّرِیْکَیْنِ مَا لَمْ یَخُنْ اَحَدَھُمَا صَاحِبہُ ، فَاِذَا خَانَہُ خُرِجَتْ مِنْ بَیْنِھِمَا“[1]

ترجمہ: ”اللہ فرماتا ہے میں دو حصہ داروں کے درمیان تیسرا حصہ دار ہوں، جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے بددیانتی نہ کرے، اگر کوئی ایک بھی بددیانتی کرتا ہے تو میں نکل جاتا ہوں۔“

4۔ حضرت حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا:

”قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلّمَ اَلْبیْعَانَ بِالْخِیَارِ مَالَم یَتَفَرَّقَا اَوْ قَالَ حَتیٰ یَتَفَرَّقَا فَاِنْ صَدَقَا وَ بَیَّنَا بُوْرِکَ فِیْ بَیْعِھِمَا ، وَاِنْ کَتَمَا وَ کَذَبَا مُحِقَتْ بَرْکَۃُ بَیْعِھِمَا“[2]

ترجمہ: خرید و فروخت کرنے والے جب تک الگ نہ ہو جائیں انہیں اختیار باقی رہتا ہے۔ اگر دونوں سچائی سے کام لیں گے تو ان کے سودے میں برکت ہو گی اور اگر جھوٹ بولیں گے اور چھپائیں گے تو اس کی برکت مٹا دی جائے گی۔

6۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"نَھٰی رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الْغَرَرِ وَبَیْعِ الْحَصَاۃ "[3]

ترجمہ: نبیؐ نے دھوکے کی بیع سے منع فرمایا ہے

7۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا:

”اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقِ الْاَمِیْن مَعَ النَّبِیِّنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ“[4]

ترجمہ: ” سچا اور امین تاجر آخرت میں انبیاء کرامؑ، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہو گا۔

اسلام کے دیگر احکامات کی طرح معاملات میں بھی اسلامی قوانین میں کس طرح کوتاہی اور سستی برتتے ہیں، جھوٹی قسموں کے ذریعے چیزوں کی فروخت کرنے کے بارے میں کس قدر سخت وعید آئی ہیں، جہنم کی آگ کو واجب قرار دیا گیا ہے، لیکن ہمارے تمام تر معاملات جھوٹی قسموں پر موقوف ہیں، جھوٹی قسمیں کھا کر گاہک کو کس طرح پھانسنے کے جتن کرتے ہیں۔ آج دھوکہ دینا، ادنیٰ کو اعلیٰ چیز کو اعلیٰ کو الٹی بتا کر فروخت کرنا، ناپ تول میں کمی کرنا، اور ملاوٹ کرنا ایک بازاری اور کاروباری اصول بن چکا ہے۔ معاملات میں خیانت کرنا کس قدر عام اور معاشرتی رواج بن چکا ہے، جس کی بدولت ہماری چیزوں سے برکت اٹھالی گئی ہے، سچے اور امین تاجر کے لیے کس قدر خوش بختی ہے کہ روز قیامت وہ انبیاء، شہداء اور صدیقین کے ساتھ ہو گا،

---

1 سنن ابی داؤد، کتاب: البیوع والاجارات، باب: فی الشرکۃ، حدیث: ۳۳۸۳، ضعیف

2 صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اذا بین البیعان ولم یکتما، حدیث: ۲۰۷۹

3 سنن الترمذی، ابواب البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب: ماجاء فی کراھیۃ بیع الغرر، حدیث ۱۲۳۰، صحیح

4 سنن الترمذی، ابواب: البیوع عن رسول اللہ ﷺ، باب: التجار، وتسمیۃ النبیۃ صلی اللہ علیہ وسلم ایاھم، حدیث: ۱۲۰۹، ضعیف

لیکن ہماری تجارتی زبان ہی جھوٹی ہو گئی ہے، مارکیٹ میں کاروبار کرتے وقت جب تک ہم جھوٹ اور خیانت نہ کریں ہمیں یہ خیال ہوتا ہے شاید اس کے بغیر ہم منافع حاصل ہی نہ کر پائیں گے۔

قرض کے لین دین میں آج کل کتنی لاپرواہی اور کوتاہی ہوتی ہے، قرض نہ دینے اور غصب کر جانے کے لیے کس قدر کوششیں کی جاتی ہیں لیکن جس شخص کے ذمہ قرض تھا حضور اکرم ﷺ نے اس بندے کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ قرض بندوں کے حقوق میں سے ہے وہ کسی صورت میں معاف نہیں ہو سکتا۔

ہمارے معاشرے کا وہ گروہ جو عقل و دانش میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس کے مطابق کسی بھی ملک کے لوگوں کے لیے روزی کمانے کا سب سے بہترین ذریعہ تجارت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تاجر مذہبی، سچا اور امانت دار ہو اس کے علاوہ وہ اپنے تجارتی امور میں ان کاموں سے بچے جو قرآن و سنت کے برخلاف ہوں اور ایسے تجارتی امور جو قانون محمدیہ کو شک میں ڈالیں اور اس کے ساتھ اس تاجر کو چاہیے کہ وہ کاروبار سے متعلقہ قانون محمدیہ کے تمام آداب کا خیال رکھے۔ دین اسلام میں ہی نہیں بلکہ تمام ادیان میں تجارت کو انتہائی قابل عزت اور خیر و برکت کا کام قرار دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاءؑ کا روزی کمانے کا ذریعہ ان کی اپنی محنت کی کمائی تھی۔ حضرت محمدؐ خاتم النبین بھی تجارت کے پیشے سے مسلک تھے اور تجارت کے کام پر آمادہ کرنے کے لیے ان میں تجارت کا شوق پیدا کرتے تھے، اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ کی اکثریت تجارت ہی کیا کرتی تھی۔ ہماری آخری الہامی کتاب اور آپؐ کے ارشادات میں حلال تجارت اور صادق و امین تاجر کی اہمیت و فضیلت کو مختلف جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ اللہ نے قرآن مجید میں بہت سی آیات میں حلال تجارت کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فائدے کو اپنی مہربانی عبادت فرمایا ہے جس سے تجارت جیسے کام کی اہمیت اور برکت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ انسانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

{لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاح اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ }[1]

ترجمہ: ''تم پر کسی بھی قسم کا کوئی گناہ یا زیادتی نہیں کہ تم اپنے رب کا رزق تلاش کرو۔''

اسی طرح فرمایا: {فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِيْ الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا منْ فَضْلِ اللهِ}[2]

ترجمہ: ''پھر جب نماز مکمل ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔''

اوپر بیان کی گئی آیات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ کو ان پر خاص مہربانی ہوتی ہے جو روزگار حاصل کرنے کے جائز طریقے اپناتے ہیں اور خاص طور پر تجارتی امور میں اسلامی احکامات اور قواعد و ضوابط کا خیال رکھا جائے تو ان کا یہ عمل بھی اجر و ثواب کا

---

1 سورۃ البقرۃ ۲: ۱۹۸

2 سورۃ الجمعہ ۶۲: ۱۰

باعث بنے گا اور عبادت کا درجہ حاصل کرے گا اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فیوض اور برکات سے اسی دنیا میں مالا مال کر دیتا ہے۔

رسول اللہؐ سے ایک مرتبہ ایک سائل نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ سب سے پاکیزہ و بہترین روزی کمانے کا ذریعہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:"

"عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَ كُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ" [1]

ترجمہ: "بہترین ذریعہ معاش آدمی کے خود کے ہاتھ کی کمائی اور ہر وہ تجارت ہے جو شرعی لحاظ سے جائز ہو۔"

اس میں امانت و صداقت کو ملحوظ خاطر رکھ کر کیا جائے۔ اس میں جھوٹ، دھوکہ فریب، خیانت زیادتی اور حرام کا شائبہ تک نہ ہو۔ درج بالا حدیث سے تجارت کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ ایسی تجارت کو آپؐ نے سب سے پاکیزہ اور بہترین قرار دیا ہے جو کہ صداقت اور امانت پر مبنی ہو۔

شادی بیاہ کے معاملات:

دین اسلام میں نکاح صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل اور بشری جذبات کی تسکین کا نام نہیں بلکہ انسان کے جس طرح بہت سے بشری اور فطری ضروریات ہیں اسی طرح نکاح بھی انسان کے لیے ایک اہم ضرورت ہے اسی لیے اسلام نے انسان کی جائز فطری ضروریات کو بہترین طریقے سے پورا کرنے کے لیے نکاح کو انسانی وجود کے قیام اور حفاظت کے لیے ضروری قرار دیا ہے اور نکاح ایک ایسی عبادت ہے جس کو ادا کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت اور زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھتا ہے۔ احادیث مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ" [2]

ترجمہ: "نکاح میری سنت ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ الْبَاءَةُ فَلْيَتَزَوَّجَ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهُ لَه وَجَاءَ" [3]

ترجمہ: " تم میں سے جو نکاح کی قوت رکھتا ہے اسے نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ نکاح نظروں کو نیچے رکھتا ہے اور شرمگاہ کی بھی حفاظت کرتا ہے اور جو نکاح کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی قوت نہیں رکھتا اسے چاہیے کہ خواہشات کا زور توڑنے کے لیے روزے رکھیں۔"

---

1 مسند احمد ۲۸، ص: ۵۰۲، حدیث ۱۷۲۸۵، حسن لغیرہ۔ عند شعیب ارناؤوط فی تعلیقہ علی مسند الامام احمد

2 سنن ابن ماجہ، کتاب: النکاح، باب: ماجاء فی فضل النکاح، حدیث: ۱۸۴۶، حسن عند الالبانی

3 صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب: قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، من استطاع منکم الباء فلیتزوج، حدیث: ۵۰۶۵

انسان فطری طور پر آرام و سکون چاہتا ہے اور اس راحت و سکون کا ایک بڑا ذریعہ اس کی مخالف جنس میں پیدا ہونے والے جذبات اور خواہشات ہیں۔ یہی راحت اور سکون حاصل کرنے کے لیے اور عبادت میں یکسوئی اور دلچسپی پیدا کرنا اور بندوں کے حقوق ادا کرنے میں نکاح ایک بنیادی اور مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ نکاح میں اللہ نے بنی نوع انسان کے لیے بہت سے فوائد رکھے ہیں مثلاً انسان کے معاشرتی روابط، دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، رشتوں کی قدر و قیمت اور ذہنی اور نفسیاتی سکون نکاح جیسے خوبصورت رشتے میں پوشیدہ ہے جیسا کہ اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

{هُوَالَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا}[1]

"وہ وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑ بنایا تاکہ اس سے آرام پائے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پسلی سے حضرت حواؑ کو پیدا کیا[2] اسی لیے عورت مرد کے دل کے بہت قریب ہوتی ہے اور اس آیت سے عورت کی مرد کی زندگی میں ضرورت اور اہمیت کے ساتھ نسل انسانی کی بقا واضح ہوتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

{وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا}[3]

ترجمہ: "عورتوں کے ساتھ اچھی طرح زندگی بسر کرو اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تمہیں ایک چیز پسند نہ آئے مگر اللہ نے اس میں کچھ بھلائی رکھی ہو"

یعنی اللہ نے جن عورتوں کو تمہاری زندگی میں شامل کر دیا ہے ان میں یقیناً برائیوں کے ساتھ اچھائیاں بھی ہوں گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ نگاہ ہو جو ان خوبیوں کو تلاش کر سکے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے:

"استوصُوا بالنِّسَاء خَيْرًا، فانَّهنَّ خُلِقنَ مِن ضلع، وَإِنْ أعوجَ شَيء في الضّلع أعلاه، فان ذَهبتَ تُقيمُهُ، كسرتَه، وَإن تركته، لم يزل أعوج، فَاسْتَوصُوا بالنِّساء"[4]

ترجمہ: عورتوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو، اس لیے کہ اُن کی پیدائش مرد کی پسلی سے ہوئی ہے، اور پسلی میں اوپر کا حصہ سب سے زیادہ ٹیڑھا ہوتا ہے اور اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اگر چھوڑ دو گے، تو ٹیڑھی ہی رہ جائے گی؛ اس لیے عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ۔

---

1 سورۃ الاعراف ۷: ۱۸۹

2 صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء صلوات اللہ، باب: قول اللہ تعالیٰ: واذ قال ربک، حدیث: ۳۳۳۱

3 سورۃ النساء، ۴: ۱۳

4 صحیح البخاری، کتاب: احادیث الانبیاء صلوات اللہ علیھم، باب: قال اللہ تعالیٰ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً حدیث: ۳۳۳۱

درج بالا حدیث میں مردوں پر عورتوں کے حقوق، اُن کے ساتھ ہمدردی اور حسن سلوک کا تاکیدی حکم واضح ہے۔
دوسری طرف عورتوں کو بھی مردوں کے حقوق ادا کرنے، خاص طور پر شوہر کی اطاعت و فرماں برداری اور عفت و پاک دامنی کے بارے میں سخت تاکید کی گئی ہے اور جو عورت ان صفات کے ساتھ متصف ہو، اُس کے فضائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔
نبی ﷺ فرماتے ہیں:
"مومن بندہ اللہ کے ڈر اور پرہیز گاری کے بعد جو سب سے افضل چیز حاصل کرتا ہے وہ نیک خصلت زوجہ ہے کہ اگر وہ اسے حکم دیتا ہے، تو مانتی اور فرماں برداری کرتی ہے، اُس کو دیکھتا ہے، تو اسے خوشی اور مسرت ہوتی ہے، اگر اُس پر کوئی قسم کھاتا ہے، تو اسے پورا کرتی ہے اور اگر شوہر کہیں چلا جاتا ہے، تو اُس کے غیاب میں اپنی جان، عزت اور شوہر کے مال کی حفاظت کرتی ہے"[1]

اسی طرح عصرِ حاضر میں خصوصاً بعض اہلِ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں نے بھی شادی کو غیر اہم بتایا ہے اور شادی سے انکار کر دیا ہے۔ ان کے بے ہودہ نظریات کے مطابق انسان ہر طرح کی آزادی کا حق رکھتا ہے اور اسے اپنے فطری جذبات کو جیسا چاہے ویسا پورا کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس معاملہ میں انسان کسی قسم کی روک ٹوک اسی طرح شادی جیسی کوئی پابندی اور بندھن کا قائل نہیں ہے۔ ان کے ہاں شادی کا تصور ہے بھی تو اس کا مقصد صرف جنسی خواہشات کا پورا کرنا رنگ رلیاں منانا، موج مستی کرنا اور سیر و تفریح کرنا پھر ایک مقررہ وقت اور مدت کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہے۔ مغربی ممالک کے لوگ خصوصاً اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے دنیا کے دیگر ممالک کے افراد عموماً مرد عورت دوست اور عورت کے لیے مرد دوست نظریے کے تحت بے حیائی بے شرمی کے شکار ہیں۔ عاشق و معشوق کی حیثیت سے بے حیا اور بے شرم زندگی گزارتے ہیں ۔ اہل مغرب اور مغرب زدہ لوگوں نے شادی کو ایک کھیل تماشا بنا کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے مغربی ممالک میں گھر گرہستی کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ خاندان اور اقارب کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔ ماں باپ اور بچوں کے درمیان کوئی تعلق قائم نہیں رہ گیا ہے۔ اس سنگین صورت حال سے خود مغربی ممالک کے سنجیدہ اور غیور لوگ بہت پریشان ہیں اور غور و فکر کر رہے ہیں کہ کس طرح ان تباہ کن حالات اور انسانیت سوز ماحول پر قابو پایا جائے اور سوسائٹی کو ان برائیوں اور خرابیوں سے محفوظ رکھا جائے۔

اسی بناء پر اسلام نے نکاح کو اس قدر اہم بتایا ہے اور مرد اور عورت کو نکاح کے مہذب بندھن میں باندھنا لازمی سمجھا ہے اس لیے نکاح خاندان کو وجود بخشتا ہے، سماج کا تصور دیتا ہے۔ اسلام نکاح کے ذریعے نسل آدم کا تسلسل کے ساتھ صحیح طریقہ پر افزائش چاہتا ہے اور اس میں کسی بھی طرح کے انقطاع کو ناپسند کرتا ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:
{وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا وَّجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا}[2]

---

1 صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب: فی حقوق المال، حدیث: ۱۶۶۴

2 سورۃ الفرقان ۲۵: ۵۴

ترجمہ: وہ ہی اللہ ہے جس نے انسان کو پانی سے بنایا اور اس کے ذریعہ نسل آدم کو چلا دیا اور اسے خاندان اور سسرال والا بنا دیا اور تمہارا رب واقعی بڑی قدرت والا ہے۔

اسی طرح اسلام انسانی زندگی کو اللہ کی بندگی اور اسوہ نبوی ﷺ میں ڈھلی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام نکاح کو روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے رکاوٹ نہیں بلکہ ترقی کی شاہراہ قرار دیتا ہے۔ روحانیت اور اخلاق میں سب سے اونچا مقام اور بلند معیار انبیاء کرام کا ہوتا ہے اور انبیاء کرام کے تعلق سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ انبیاء کرام شادی شدہ اور بال بچے والے رہے ہیں۔ انسان کو نکاح کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کو نبھانے میں اور انسانی حقوق کے ادا کرنے میں جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اگر انسان ان حقوق و ذمہ داریوں کو اسلامی تعلیمات اور اسوہ نبوی ﷺ کی روشنی میں ادا کرتا ہے تو اسلام کی نظر میں نکاح خود انسان کے حق میں روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ایک طرف رہبانیت کو روا نہیں رکھا ہے تو دوسری طرف انسان کو بے لگام بھی نہیں چھوڑ دیا ہے۔ اسلام انسان کی زندگی میں برابری پیدا کرتا ہے اور اسی میں انسان کی بھلائی ہے۔

جن لوگوں نے شادی کرنے کو غلط قرار دیا ہے اور عورت سے دور رہنے کا درس دیا ہے اور روحانی ترقی کے لئے ایسا کرنا ناگزیر بتایا ہے آخر کار وہی لوگ انسانی خواہشات اور فطری جذبات سے مغلوب ہو کر طرح طرح کی جنسی خرابیوں اور اخلاقی برائیوں کے مرتکب ہوئے ہیں حتیٰ کہ فطرت کے خلاف کاموں تک میں ملوث ہوئے ہیں اور برے نتائج اور تباہ کن حالات سے دوچار ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ عمر بھر کے لیے کیا جائے اور اس کو توڑنے اور ختم کرنے کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ اس معاملہ کے ٹوٹنے کا اثر نہ صرف میاں بیوی پر ہی پڑتا ہے بلکہ اولاد کی بربادی اور بعض اوقات خاندانوں میں جھگڑے کا سبب بنتا ہے جس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ نے دونوں میاں بیوی کو وہ ہدایات دی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے یہ رشتہ زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف رونما ہوں تو سب سے پہلے دونوں کو مل کر اختلاف دور کرنے چاہئے۔ اگر بیوی کی طرف سے کوئی ایسی صورت پیش آئے جو شوہر کے مزاج کے خلاف ہو تو شوہر کو حکم دیا گیا کہ افہام و تفہیم اور زجر و تنبیہ سے کام لے۔ دوسری طرف شوہر سے بھی کہا گیا کہ بیوی کو محض نوکرانی اور خادمہ نہ سمجھے بلکہ اس کے بھی کچھ حقوق ہیں جن کی پاس داری شریعت میں ضروری ہے۔ ان حقوق میں جہاں نان ونفقہ اور رہائش کا انتظام شامل ہے وہیں اس کی دل داری اور راحت رسانی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو اپنے گھر والوں یعنی بیوی بچوں کی نظر میں اچھا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی نظر میں اچھا وہی ہو گا جو اُن کے حقوق کی ادائیگی کرنے والا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے نکاح کے چند الفاظ میں اتنی طاقت رکھی ہے کہ جب ایک مرد اور عورت نکاح کے پاکیزہ بندھن میں بندھ ہو جاتے ہیں تو ان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں ان کے نکاح کا

بندھن ہمیشہ قائم رہے اور صرف موت ہی انہیں ایک دوسرے سے جدا کرے لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان پر خلوص محبت اور جذبات نہیں رہتے ان کے درمیان لڑائی جھگڑے اور اختلافات اتنے بڑھ جاتے ہیں جن کی وجہ سے شادی جیسا مقدس رشتہ برقرار رہنا ممکن نہیں رہتا اور وہ رشتہ توڑنا ضروری ہو جاتا ہے جب اس طرح کے حالات پیدا ہو جائیں کہ وہ میاں بیوی اللہ کی قائم کردہ حدود کا خیال نہ رکھ سکیں تو ان کے درمیان علیحدگی یعنی طلاق ہو جانی چاہیے۔

میاں بیوی کے جدا ہونے کے متعلق شریعت کی اصل منشاء:

مذکورہ تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ نکاح ایک شرعی پائیدار معاہدہ ہے لہٰذا سخت ضرورت کے بغیر اُس کو ختم کرنا یا ختم کرنے کا مطالبہ کرنا اسلام میں ناجائز و ممنوع اور نکاح کے بنیادی مقصد اور اسلامی منشا کے خلاف ہے، اسی معاہدے کو ختم کرنے کا نام دوسرے لفظوں میں "طلاق" ہے۔ احادیث میں بلاضرورت اس کا اقدام کرنے پر ناپسندیدگی ظاہر کی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے: ''اللہ نے حلال کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام طلاق کو قرار دیا ہے۔'' [1]

مولانا اشرف علی تھانوی[2] اس حدیث کے ضمن میں فرماتا ہے:

''مطلب یہ ہے، کہ طلاق ضرورت کے تحت جائز رکھی گئی ہے، بغیر ضرورت طلاق دینا بہت بری بات ہے، اس لیے کہ نکاح تو آپس میں الفت و محبت اور میاں بیوی کی راحت کے لیے ہوتا ہے اور طلاق سے ان نیک مقاصد کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور اللہ کی نعمت کی ناشکری ہوتی ہے دونوں کو پریشانی ہوتی ہے آپس میں دشمنی ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے بیوی کے رشتہ داروں سے بھی دشمنی پیدا ہو جاتی ہے، جہاں تک ہو سکے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، میاں بیوی کو ایک دوسرے کو برداشت کرنا چاہیے اور پیار و محبت سے رہنا چاہیے''

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

"أيما اِمْرأة سالَتْ زَوْجَهَا طلاقًا فِي غَيْرِ مَا بَأْس، فَحَرَام عَلَيْهَا رَائِحَة الْجَنَّة"[3]

ترجمہ: جو عورت سخت مجبوری کے بغیر خود طلاق طلب کرے، اُس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے:

---

1 سنن ابی داود، کتاب: الطلاق، باب: فی کراھیۃ الطلاق، حدیث: ۲۱۷۸۔۔۔ ضعیف الاسناد

2 مولانا اشرف علی بن عبدالحق ۱۸۶۳ء کو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر ہندوستان میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم میرٹھ میں حاصل کی، ۱۸۷۸ء کو دیوبند چلے گئے، جہاں سے ۱۸۸۲ء کو فارغ التحصیل ہوئے، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کی، سیاسی طور پر مسلم لیگ میں شامل تھے، بہت زیادہ تصانیف لکھی ہیں۔ ۱۹۴۳ء کو وفات پائی۔ {اکابر علماء دیوبند اکبر علی صفحہ ۶۱ ادارہ اسلامیات طبع دوم}

3 سنن ابی داؤد، کتاب: الطلاق، باب: فی الخلع، حدیث: ۲۲۲۶

"اِنَّ اِبْلِیْسَ یَضَعُ عَرْشَہُ عَلَی الْمَاءِ ثُمَّ یَبْعَثُ سَرَایَاہُ فَاَدْنَاھُمْ مِنْہُ مَنْزِلَتًا اَعْظَمُھُمْ فِتْنَۃً، یَجِیْءُ اَحدُھُمْ فَیَقُوْلُ: فَعَلْتَ کَذَا وَکَذَا ، فَیَقُوْلُ : مَا صَنَعْتَ شَیْاً، قَالَ ثُمَّ یَجِیْءُ اَحدُھُمْ فَیَقُوْلُ : مَا تَرَکْتُہُ حَتّٰی فَرَقْتُ بَیْنَہُ وَبَیْنَ امْرَاَتِہٖ قَالَ فَیُدْنِیْہِ مِنْہُ ، وَیَقُوْلُ : نِعْمَ اَنْتَ"[1]

"شیطان اپنے تخت کو پانی پر بچھاتا ہے، پھر لوگوں کو بھٹکانے کے لیے اپنی فوجوں کو بھیج دیتا ہے، اُن فوجوں میں سے رتبہ کے اعتبار سے شیطان کے سب سے قریب وہ بندہ ہوتا ہے، جو اُن میں زیادہ فتنہ باز ہو، یعنی زیادہ پسندیدہ وہ چیلا ہوتا ہے، جو بڑا فتنہ برپا کرے، اُن میں سے ایک آکر کہتا ہے: میں نے یہ فتنہ برپا کیا اور یہ فتنہ برپا کیا، شیطان کہتا ہے: تونے کوئی بڑا کام نہیں کیا، ایک آکر کہتا ہے: میں نے فلاں شخص کو اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک ان دونوں میں طلاق نہ کی، تو شیطان اس کو اپنے قریب کرلیتا ہے، اور اپنے گلے سے لگا کر کہتا ہے "ہاں تونے بہت بڑا کام کیا"

خلاصہ یہ ہے کہ طلاق اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ عمل ہے، بلاضرورت اس کا ارتکاب کرنا عرشِ الٰہی کو ہلانا اور شیطان کو خوش کرنا اور عورت کا بلاضرورت طلاق کا مطالبہ جنت کی خوشبو سے محرومی کا سبب ہے۔

میاں بیوی کے ناخوش گوار حالات میں اسلام کی تعلیمات وہدایات:

درج بالا تفصیل میں اس بات کی وضاحت ہو چکی کہ نکاح ایک دائمی رشتہ کا نام ہے، اسلام کا اصل منشا اُس رشتہ کو باقی اور قائم رکھنا ہے، اسی لیے بلاضرورت اس رشتہ کو توڑنے کی سخت مذمت بیان کی جاچکی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بسا اوقات میاں بیوی کے درمیان حالات خوش گوار نہیں رہتے، آپسی نااتفاقیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دونوں میں نبھاؤ مشکل ہوتا ہے، ایسی صورت میں بھی اِسلام نے جذبات سے مغلوب ہو کر جلد بازی میں فوراً ہی اس پاکیزہ رشتہ کو ختم کرنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ میاں بیوی دونوں کو مکلف بنایا کہ وہ حتی الامکان اس بندھن کو ٹوٹنے سے بچائیں، چنانچہ عورت کی طرف سے نافرمانی کی صورت میں مردوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے:

{والّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھجُرُوھنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوھنَّ فَإِنْ أَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَیْھِنَّ سَبِیلًا}[2]

اس آیت کے ذریعے قرآن نے آپسی انتشار کو ختم کرنے کے تین طریقے بیان کیے ہیں:

(۱) اگر عورت کی نافرمانی کا خطرہ ہو، تو حکمت اور نرمی کے ساتھ پہلے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی جائے۔

(۲) اگر سمجھانا موثر نہ ہو، تو عارضی طور پر اُس کا بستر الگ کر دیا جائے۔

(۳) اگر دوسری صورت بھی مفید ثابت نہ ہو اور عورت اپنی عادت پر قائم رہے، تو کچھ زجر وتوبیخ اور ہلکے درجہ کی سرزنش سے کام لیا جائے۔

---

1 صحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنّۃ والنّار، باب تحریش الشّیطان وبعثہ سرایاہ لفتنۃ النّاس، حدیث: ۲۸۱۳

2 سورۃ النساء ۴ : ۳۴

اور مردوں کی جانب سے کسی قسم کی بد سلوکی کے وقت عورتوں کو یہ ہدایت ہے:
{وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِھَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَھُمَا صُلْحًا}[1]
ترجمہ: "اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے لڑنے یا منہ پھیرنے سے ڈرے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں کسی طرح سمجھوتہ کرلیں۔"

مولانا اشرف علی تھانوی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں یعنی عورت اگر ایسے شوہر کے پاس رہنا چاہے جو پورے حقوق ادا کرنا نہیں چاہتا اور اس لیے اس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو عورت کو جائز ہے کہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ دے، مثلاً نان ونفقہ معاف کردے یا مقدار کم کردے، تاکہ وہ چھوڑے نہیں اور شوہر کو بھی جائز ہے کہ اس معافی کو قبول کرلے۔

اگر اس سے بھی معاملہ حل نہ ہو اور خدانخواستہ آپس کے تعلقات بہت ہی خراب ہو جائیں، پھر بھی شریعت نے رشتۂ نکاح کو توڑنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ یہ حکم دیا کہ میاں بیوی دونوں اپنی طرف سے ایک ایک ایسا حَکَم (پنچ) اور ثالث مقرر کرلیں، جو مخلص اور خیر خواہ ہوں، جن کا مقصد اختلاف کو ختم کرانا ہو، اس لیے دونوں حکم پوری ایمان داری اور انصاف کے ساتھ اختلاف کا جائزہ لیں اور دونوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں۔ ارشاد باری ہے:
{وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا}[2]
ترجمہ: "اور اگر تمھیں ان دونوں کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو تو ایک منصف مرد کے رشتے داروں سے اور ایک عورت کے رشتے داروں سے مقرر کرو۔"

مذکورہ آیت سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ میاں بیوی کے درمیان نااتفاقی اور ناخوش گوار حالات کے مسئلہ کا ابتدائی حل طلاق دینا نہیں ہے، بلکہ اختلاف کے اسباب کو تلاش کرکے اُس پر روک لگانا ہے۔

طلاق:

صلح وصفائی کی مذکورہ تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے بعد بھی ممکن ہے کہ حالات قابو میں نہ آئیں اور دونوں میں موافقت اور نبھاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہ جائے، زوجین میں باہم اعتماد ختم ہو جائے اور اللہ تعالی کے قائم کردہ حدود واحکام کو پورا کرنا مشکل ہو جائے، تو ایسی آخری حالت میں بھی معاہدۂ نکاح کے برقرار رکھنے پر مجبور کرنا دونوں پر ظلم ہے، ایسی صورت میں اُن کی زندگی تنگی وپریشانی کا بدترین نمونہ بن جائے گی، جس کے نتیجے میں قابلِ نفرت گھناؤنی اور ناپسندیدہ حرکتوں کے صادر ہونے کا امکان ہے، نیز اس میں خاندانی فوائد کے بجائے سینکڑوں مصیبتیں ہیں۔

---

1 سورۃالنساء ۴: ۱۲۸

2 سورۃالنساء ۴ : ۳۵

اسلام کی نظر میں طلاق اگرچہ طلاق ناپسندیدہ چیز ہے، لیکن ایسے حالات میں بھی اگر طلاق کو بالکل روک دیا جائے، تو یہ نکاح دونوں فریق کے لیے فساد اور پریشانی کا ذریعہ بن جائے گا، لہٰذا ایسے حالات میں اسلام نے طلاق کی اجازت دی ہے، کیونکہ نکاح کے بعد جنم لینے والی مشکل حالات سے نکلنے کا واحد اور پر سکون راستہ طلاق ہے، اس کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اسلام کی جانب سے ایسے مشکل حالات میں طلاق کا قانون کسی رحمت سے کم نہیں ہے، جس میں مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے اور دوسری شادی کرلے، اسی طرح عورت بھی نکاح سے آزاد ہو کر چاہے تو دوسری جگہ اپنا نکاح کرلے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں حلال کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ کام طلاق کو قرار دیا ہے وہی اس تعلق سے ہونے والے مساعد حالات سے پیدا ہونے والی صورت حال سے بچنے کے لیے طلاق کے قانون کو باعث رحمت بنا رہا ہے جہاں اللہ نے مرد کو طلاق کا حق دیا ہے وہاں عورت کو بھی اس حق سے محروم نہیں رکھا گیا اور دونوں کو یکساں حقوق عطا کر دیے، فرق صرف یہ ہے کہ مرد طلاق دیتا ہے اور عورت اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اور اس بات کا ثبوت قرآن کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے:

{بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ}[1]

ترجمہ: "شوہر کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے"

اگر بیوی چاہے تو شوہر سے طلاق کا دعویٰ کر سکتی ہے اور اگر شوہر اس کے اس مطالبے کو رد کر دے تو وہ عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اللہ نے چونکہ مرد کو گھر کا حاکم اور نگہبان مقرر کیا ہے اور انسانی عقل بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ گھر کا وہ مرد جو گھر کے تمام امور کو چلانے کا ذمہ دار ہو وہی گھر کا نگہبان ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ گھر کا سربراہ ہو چنانچہ جو بھی گھر کا سربراہ ہوگا اسے ہی یہ حق ملنا چاہیے۔ عورت یا مرد کی اس میں کوئی تخصیص نہیں کیونکہ جب اللہ نے ایک فیصلہ کر دیا تو ہم انسان جو اس کی بندگی کرتے ہیں اور اسے کے آگے سربسجود ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں اس کے فیصلوں کے آگے بولنے کا حق نہیں اگر عورت گھر کے سربراہ کے لیے موضوع ہوتی تو یقیناً اللہ اس کو یہ حق دیتا لیکن اللہ نے عورت کو یہ حق اس لیے نہیں دیا کہ عورت ایک کمزور اور نازک صنف ہے جس پر ایسی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی طرف سے طلاق لینے کی صورت میں شوہر کو اس سے کس بھی قسم کی مالی معاونت سے استثنیٰ قرار دیا ہے، اس لیے شوہر کے لیے یہ ناجائز ہے کہ وہ اس موقع پر اپنی بیوی سے کسی بھی چیز کا تقاضا کرے۔

جب مرد اور عورت، میاں بیوی کی حیثیت سے ایک گھر میں رہ رہے ہوں اور اس وقت ان کے درمیان کسی بھی قسم کے اختلافات نہ ہوں اور اس وقت شوہر اپنی بیوی کو جو کچھ بھی بتا دیتا ہے مثلاً روپیہ پیسہ، زیور، جائیداد اور اس کے حوالے کرتا ہے تو وہ عورت کی ملکیت ہو جاتی ہے اور جب میاں بیوی میں اختلافات ہوں اور شوہر اس ڈر سے اپنی بیوی کو طلاق نہ دے کہ جو مال و

---

1 سورۃ البقرہ ۲ : ۲۳۷

زر اس نے اپنی بیوی کو دیا ہے اس کے پاس نہیں رہے گا تو اس حوالے سے قرآن فرماتا ہے کہ معاملے کو احسن طریقے سے انجام تک پہنچانے کے لیے بیوی میاں کے مال و دولت کا کچھ حصہ یا ساری دولت اپنے شوہر کے حوالے کر کے علیحد گی حاصل کر سکتی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اللہ فرماتا ہے:

{وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَاللّٰهِ،فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَاللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ،تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ} [1]

ترجمہ: ''اور تمہارے لیے اس میں سے کچھ بھی لینا جائز نہیں جو تم نے انہیں دیا ہے، مگر یہ کہ دونوں ڈریں کہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدود پر ثابت قدم نہیں رہ سکتے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت معاوضہ دے کر پیچھا چھڑا لے، یہ اللہ کی حدیں ہیں سو ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا سو وہی ظالم ہیں۔''

مزید قرآن مجید اس بات پر زیادہ تاکید کرتا ہے، کہ علیحد گی کے وقت شوہر کے لیے مناسب نہیں کہ اس نے بیوی کو جو جائیداد یا تحفے دیے ہیں، وہ اس سے واپس لے۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ صرف مہر واپس نہ لینے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کی چیز یا تحفہ، جو وہ اپنی بیوی کو دے چکا ہے، وہ اسے واپس نہیں لینی چاہیے، بلکہ یہ اس کی مردانگی کا تقاضا ہے کہ اسے علیحد گی کے وقت بیوی کو کچھ دے دلا کر رخصت کرے، یہاں تک کہ اگر مہر کی رقم مقرر نہ کی گئی ہو تب بھی وہ اسے کچھ دے دلا کر رخصت کرے اور اگر مہر کی رقم تو مقرر ہو چکی ہو، لیکن ان کے درمیان تعلق پیدا ہونے سے پہلے طلاق کی نوبت آجائے تو شوہر کو مہر کی آدھی رقم ادا کرنی چاہیے، البتہ اگر بیوی خود مہر معاف کر دے تو پھر شوہر مہر کی ادائیگی کا پابند نہیں ہے، لیکن اس کی طرف سے پسندیدہ بات یہی ہے کہ وہ اسے مہر کی پوری رقم ادا کرے۔

---

1 سورۃ البقرہ ۲ : ۲۲۹

فصل دوم: معاملات کے متعلق معاصر دینی تصورات و رویے

شادی ایک ایسی تقریب ہے کہ جس میں مرد و عورت کے ذریعے میاں بیوی کہ خوبصورت بندھن میں بندھے جاتے ہیں۔ نسل انسانی کو بڑھانے کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔اسلام چونکہ خیر خواہی کا اور آسانی فراہم کرنے کا دین ہے اس لیے اس نے شادی جیسی تقریب کو نہایت آسان بنایا ہے۔تاکہ معاشرے میں بے راہ راوی بگاڑ پیدا نہ ہو لوگ آسانی سے اس بندھن کے ذریعے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکیں مگر اس وقت دُنیا اسلام میں خاص طور پر پاکستان میں شادی ایک ایسی پیچیدہ اور طویل رسم، نہایت پُر مصارف کام، شان و شوکت اور خاندان کی مالی اور شہری حثیت کے اظہار کا ذریعہ بن گئی ہے اس کی سادگی اور سہولت رخصت ہو کر رہ گئی ہے بلکہ اس کی ادائیگی پریشانی اور مصبیت کا ذریعہ اور درد سر بن گئی ہے کیونکہ آج اس میں دوسری مذہبی تہواروں اور رسومات کی طرح ایسی رسومات شامل ہو گئی ہیں کہ معاشرے میں بے راہ روی بڑھتی جا رہی ہے۔

شادی بیاہ کے متعلق عصری تصورات و رویے:

ہمارے ہاں آج شادی بیاہ کی شرعی رسومات کے ساتھ اپنی جاہلانہ رسومات بھی شامل ہو گئی ہیں کہ جن کے متعلق شریعت نے حکم نہیں دیا۔ان رسومات کی وجہ سے آج شادی بیاہ کی پاکیزہ تقریب بے حیائی کا بازار بن چکی ہے اور ان رسومات کے بغیر شادی بیاہ کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل جاہلانہ رسومات کو بیان کرتے ہیں۔

رشتہ تلاش کرنے کی رسم:

شادی بیاہ کے سلسلے میں جاہلانہ جو رسم سب سے پہلے ہے وہ رشتہ تلاش کرنے کی ہے کیونکہ یہیں سے ایسی باتیں شروع ہوتی ہیں جن کی شریعت میں اجازت نہیں۔ رشتہ تلاش کرنے کے سلسلے میں آج لوگ اس قدر سطحی سوچ رکھتے ہیں کہ ان کے مسلمان نہ ہونے پر شک گزرتا ہے کیونکہ آج ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی یا بیٹے کے لیے ایسا رشتہ جو مال دار ہو جو بہت زیادہ خوبصورت ہو یا بیٹی کو باہر لے جائے وغیرہ،اور پھر بعض لوگ خاندان سے باہر رشتہ نہیں کرتے بلکہ اپنی ہی ذات کے لوگوں سے رشتہ کرنے کو اہمیت دیتے ہیں اور اگر رشتہ نہ آئے تو لڑکی ساری زندگی بیٹھی رہتی ہے۔[1]

اگر دیکھا جائے تو اسلام نے تو ایسی کوپابندی نہیں لگائی کہ رشتہ تلاش کرتے ہوئے دیکھا جائے کہ بہت خوبصورت ہو یا مالدار ہو یا کہ ذات پات کی ہو بلکہ آپ ؐ نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے ارشاد فرمایا:

"تَنْکِحُ الْمَرْاَۃ لِاَرْبَع : لِمَالُھا ، وَلِحَسْبُھَا ،وَلِجَمَالُھَا ، وَلِدِیْنُھَا ، فَاظفرَ بِذَاتِ الدّیِنِ تُرِبَتْ یَدَاکَ" [2]

---

[1] شاہدہ شوکت ظفر، سنت نبوی کے مطابق شادی بیاہ، ص:۳۹

[2] صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب:استجاب نکاح ذات الدین: حدیث:۱۴۶۶

ترجمہ: ''چار اسباب سے عورت سے نکاح کیا جا سکتا ہے، اس کے مال و جائیداد کے سبب، اس کے حسب نسب کے سبب، اس کے حسن و جمال کے سبب اور اس کے دین کے سبب۔ اے ابو ہریرہؓ تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہوں دین والی عورت کے ساتھ نکاح کر کے کامیابی حاصل کر۔''

اس حدیث میں اگر یہ کہا گیا ہے کہ شادی حسن، مال اور حسب و نسب کی وجہ سے کی جائے مگر ساتھ اس کی وضاحت کر دی کہ دین دار عورت زیادہ نکاح کے لیے زیادہ بہتر ہے مگر ہمارے ہاں اس کو اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ شکل و صورت کو دیکھا جاتا ہے اور پھر رشتہ تلاش کرنے والے جس طرح لڑکی کے گھر جا کر باتیں کرتے اور لڑکی کو دیکھتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے کہ کوئی منڈی سے جانور خریدنے آیا ہوا ہو حالانکہ ایسا کرنا غلط ہے کیونکہ اس طرح سے لڑکی کی انا اور عزت مجروح ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بعض لوگ لڑکی کے لیے کسی ڈاکٹر، وکیل یا جاگیر دار کا رشتہ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اس تلاش میں لڑکی کی عمر نکل جاتی ہے حالانکہ اسلام نے لڑکی کے لیے دیندار اور احسن اخلاق کے حامل مرد سے شادی قرار دینے کا حکم دیا ہے وہ کسی ڈاکٹر یا وکیل کے چکر میں پڑنے کا حکم نہیں دیتا جیسے ارشاد نبوی ہے کہ:

''اگر تمھاری طرف کوئی ایسا آدمی پیغام نکاح بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو اس سے اپنی لڑکی نکاح کر دو اگر ایسا نہیں کرو گے، تو زمین میں فتنے اور بہت سے فساد پھیل جائے گا۔''[1]

لہٰذا رشتہ تلاش کرنے میں آج جن باتوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے اس اعتبار سے یہ ایک جاہلانہ رسم بن چکی ہے۔

منگنی کی رسم:

رشتہ تلاش کرنے کے بعد منگنی کا رسم ہوتا ہے جو کہ ہندوانہ رسم ہے جس کا مقصد لڑکے لڑکی کے رشتے کی نسبت طے کرنا ہے، جس کی شرعی حیثیت فقط وعدہ نکاح کی ہے اس سے زائد کچھ نہیں ظاہر ہے اتنی ہی بات تو دو آدمی بھی مل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے دن مقرر کرنا، تقریب منعقد کرانا، اور خرچ اخراجات کی ضرورت ہے نہ ہی کوئی تک اس لیے کہ اس رسم کا کوئی نشان نہ تو آپ کے عہد سے ملتا ہے نہ صحابہ کرام کے دور سے ملتا ہے۔[2]

مگر آج منگنی کی رسم ہمارے معاشرے میں اس حد تک رائج پا گئی ہے کہ اس کے بغیر شادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور اس قدر مہنگی ہے جس کا تصور آدمی کے لیے سوہان روح ہے۔ منگنی کی رسم میں باقاعدہ ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے جو باقاعدہ شادی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں بھی لوگوں کو دعوت نامے دے کر بلایا جاتا ہے، بغیر لڑکے اور لڑکی کو اکٹھے بٹھا کر مجمع عام میں نمائش کی جاتی ہے۔ زیورات، جوڑوں اور دیگر لوازمات پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں پھر لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو

---

1 سہ ماہی منہاج، طبع: جولائی ۱۹۸۶ء، ک: ۴، ص: ۱۷۶،

2 ہفتہ روزہ خواتین کا اسلام، طبع ۱۷ جنوری ۲۰۰۷ء، ص: ۷

انگوٹھی پہناتے ہیں پھر حسب دستور دونوں طرف سے لین دین کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔[1]

اسی وجہ سے مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا ہے کہ آج کے مسلمانوں کے لیے منگنی قیامت صغری اور شادی قیامت کبری سے کم نہیں۔[2]

بعض لوگ منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے بھی قرض لیتے ہیں حالانکہ اگر دیکھا جائے تو منگنی کی رسم اس قدر ضروری تو نہیں ہوتی کیونکہ بات تو دو لوگوں کے درمیان بھی طے پاسکتی ہے پھر منگنی کی رسم اس لیے شرعی حیثیت نہیں رکھتی کہ اس میں مال پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ اگر یہی پیسہ کسی غریب کی بچی کی شادی کے کام آجاتا تو کتنا ثواب ملتا۔ منگنی کا ایک اور نقصان یہ بھی ہے کہ لوگوں نے آج اس کو ایسا بندھن بنا دیا ہے کہ لڑکا لڑکی شادی سے پہلے ہی ایک دوسرے کے ملتے جلتے ،خط و کتابت کرتے ہیں ، تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اور بعض روشن خیال لوگ اس کو لڑکا اور لڑکی کے درمیان understanding کا نام دیتے ہیں، حالانکہ یہ سب باتیں شریعت بلکہ انسانی غیرت کے سراسر خلاف ہیں کیونکہ منگنی کی بھی شرعی رشتے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عارضی رشتہ ہے جو کبھی ٹوٹ سکتا ہے اور پھر منگنی ہونے کے بعد بھی لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے لیے غیر محرم ہی رشتے ہیں کیا کسی بھی گھر میں غیرت مند والدین اس بات کو گوارا کرلیں گے کہ کوئی باہر کا اجنبی لڑکا ان کی لڑکی سے رابطہ کرے ، ملاقاتیں کرے وغیرہ آج تو حد ہو چکی ہے کہ منگنی کے بعد تحفے تحائف نہ دینے پر منگنی ٹوٹ جاتی ہیں لہٰذا منگنی کی رسم ایک خود ساختہ اور جاہلانہ رسم ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں البتہ اگر سادگی سے یہ رسم انجام دی جائے مثلاً دو آدمی بات طے کرلیں تو اس میں مضائقہ نہیں۔[3]

مہر بڑھانے کی رسم:

آج ایک اور رسم جو کہ شرعی تھی مگر اسی کو غیر شرعی کر دیا گیا ہے وہ مہر بڑھانے کی رسم ہے جو خلاف سُنت ہے ،حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ :

’’عورتوں کو مردوں کے پلے باندھنے کی کوشش کرو اور مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔ آپ کا قول کہ مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو کیونکہ اگر دُنیا میں یہ کوئی قابل عزت اور آخرت میں تقوی کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ کو اختیار فرماتے مگر آپ نے تو مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں لیا‘‘[4]

---

1 ہفتہ روزہ خواتین کا اسلام، ص:۷

2 مولانا اشرف علی تھانوی، اصلاح الرسوم، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ۲۰۱۵ء، ص:۵۴

3 ہفتہ روزہ خواتین کا اسلام، ۱۷ جنوری ۲۰۰۷ء، ص:۷

4 پروفیسر مسز کنیز فاطمہ، افہام القرآن، قریشی برادر پبلشرز، اردو بازار لاہور، بدون تاریخ، ص ۴۰۱

مگر آج ہمارے معاشرے میں مہر بڑھانے کی رسم عام رواج ہو چکی ہے جس کو دکھاوے اور فخر کی خاطر باندھا جاتا ہے جن کے ادا کرنے کی ابتداء سے نیت نہیں ہوتی کہ کون لیتا ہے اور کون دیتا۔ حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جائے وہ اللہ کے نزدیک فاسد ہوتا ہے چنانچہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

”جس نے مہر کے عوض کی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ کریگا وہ دراصل زانی ہے“[1]

زیادہ مہر باندھنے کا یہ مقصد ہے کہ شوہر نہ چھوڑ سکے یہ بالکل درست نہیں ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر شوہر بیوی میں نااتفاقی پیدا ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رسکیں تو یہی زیادہ مہر عورت کے لیے وبال جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی ادائیگی کے خوف سے طلاق نہیں دیتا اور سالہا سال بلکہ بعض اوقات عورت ساری عمر کے لیے معلق ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ عذر درست نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ مہر وہی مقرر کیا جائے جو حیثیت کے مطابق ہو اور مرد عورت دونوں کے لیے وبال جان نہ بنے۔[2]

جہیز کی رسم:

شادی کی ایک اور قبیح رسم جہیز کی ہے جو معاشرے میں ناسور کی طرح پھیل چکی ہے۔

جہیز کی لغوی تعریف:

لفظ جہیز دراصل عربی زبان کے لفظ ”جہاز“ کا امالہ ہے جس کا اطلاق اس ساز و سامان پر ہوتا ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

”جہاز اس اشیائے ضروری کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور جہیز کے معنی ہے اس اشیائے ضروری کو اٹھانا یا بھیجنا۔“[3]

جہیز کی اصطلاحی تعریف:

جہیز اصطلاح میں اس اشیائے ضروری کو کہتے ہیں، جو لڑکی کو شادی کے موقع پر دیا جاتا ہے۔ جہیز دینے کی رسم بہت پرانی ہے۔ ہر ملک اور علاقے میں جہیز مختلف شکلوں میں دیا جاتا ہے لیکن عموماً جہیز میں زیورات، کپڑے، نقدی اور روزانہ استعمال کے برتن وغیرہ شامل ہوتے ہے۔[4]

سید سابق اسکی تعریف بیان کرتے ہیں کہ:

---

1 المعجم الصغیر، طبرانی، المکتب الاسلامی، دار عمار، ۱۹۸۵ء، ۱/۸۴، حدیث: ۱۱۱، صحیح۔

2 مولانا اشرف علی تھانوی، بہشتی زیور، حصہ ششم، توصیف پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور، بدون تاریخ, ص: ۳۶۶

3 امام راغب اصفہانی، المفردات القرآن، ص: ۱۰۱

4 اُردو انسائکلوپیڈیا، ص: ۵۴۹

’’جہیز وہ سامان ہے جس کو عورت خود اور اس کے ورثاء تیار کرتے ہیں تاکہ جب وہ بیاہ کر کے خاوند کے گھر جائے تو یہ سامان اس کے ساتھ ہو‘‘۔[1]

چنانچہ تعریفوں سے ثابت ہوا کہ جہیز وہ سامان ہوتا ہے جو لڑکی کو بیاہ کے وقت دیا جاتا ہے۔ مروجہ جہیز کی رسم ہندو ومعاشرت کی پیداوار ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندو چونکہ لڑکیوں کو اپنی جائیداد میں سے حصہ نہیں دیتے تھے اس لیے شادی کے وقت اکٹھا ہی جو چیز میسر ہو سکا جہیز کے نام سے لڑکی کے حوالے کر دیا کرتے تھے ہندووں کی دیکھا دیکھی آہستہ آہستہ رسم مسلمانوں میں بھی جڑ پکڑ گئی حتیٰ کہ شادی کا جز بن گیا ہے اور غریب والدین کے لیے مستقبل درد سر بن گئی ہے۔ کہ جس کو ادا کرنے کے لیے والدین کو قرض تک لینا پڑتا ہے تاکہ ان کو بچیوں کی شادی ہو سکے۔ حالانکہ آج جو جہیز کا طریقہ رائج ہے وہ محض ایک رسم ہے۔[2]

جس کے بارے میں سید سابق لکھتے ہیں کہ ’’یہ صرف ایک عرف وعادت‘‘ ہے جو لوگوں کے اندر جاری ہے۔[3]

یعنی جس طرح دیگر کئی رسومات کو جن میں کوئی شرعی قباحت یا ممانعت نہ تھی قبول کی لیا گیا اسی طرح اس کو بھی اپنا لیا گیا ورنہ یہ کوئی شرعی حکم یا نکاح کا کوئی لازمی جزو نہیں ہے۔

جہیز کا مطالبہ کرنا:

جہیز کا رسم جو کہ ہمارے معاشرے میں رائج ہو چکی اس کی وجہ سے آج بہت سی لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتیں اس لیے کہ آج لڑکے والوں کی طرف سے اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ لڑکی کو زیادہ سے زیادہ جہیز دیا جائے اور اگر بدنصیبی سے لڑکی شرط کے مطابق یا خواہش کے موافق جہیز نہ لے کر آئے تو سسرال میں اس کے ساتھ سوتیلا سلوک برتا جاتا ہے، بات بات پر اس کو طعنے دیے جاتے ہیں اور گھر کے افراد کی طرف سے اس کی توہین وتذلیل کی جاتی ہے۔[4]

عبدالرحمن الجزیری فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بندہ ایک ہزار مہر پر کسی عورت سے شادی کرلے اور عادت یہ ہو، کہ اتنا مہر ایک بڑے جہیز کے مقابلے میں ہوتا ہو مگر وہ عورت ایسا نہ کرے، جہیز نہ لائے تو شوہر کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ بیوی سے جہیز لانے کا مطالبہ کرے۔[5]

---

1 السید سابق، فقہ السنہ ج:۲، مکتبہ اسلامیہ لاہور ۲۰۱۵ء، ص۱۶۷

2 ماہنامہ منہاج، جولائی ۱۹۸۶ء، ص:۱۶۴

3 السید سابق، فقہ السنہ، ج:۲، ص:۱۶۷

4 علمی وتحقیقی مجلہ فقہ اسلامی، اگست ۲۰۰۶ء، ص۱۷

5 عبدالرحمن الجزیری، الفقہ علی مذاہب الاربعہ۔ ج:۴، ص:۱۷۶

الاحکام الشرعیہ میں ہے کہ ''نکاح میں مال مقصود نہیں لہذا عورت کو اپنے مہر کی رقم یا کسی دوسری رقم سے اپنے لیے سامان جہیز لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی اس کے والد کو مجبور کیا جاسکتا۔''[1]

لہذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کم جہیز لائے جو اس کے مہر کے شایان نہ ہو تو خاوند کو حق نہیں ہے کہ وہ اس سے جہیز کا مطالبہ کرے، جہاں جہیز کا مطالبہ کرنے سے منع کیا گیا ہے وہاں شریعت نے بیوی کی جملہ جائز ضروریات اور اخراجات کا شرعاً ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے، کیونکہ جب اس نے خود کو خاوند کے سپرد کر دیا ہے تو اس کا ہر قسم کا خرچہ خاوند پر واجب ہے کہ وہ اپنی حسب حیثیت ضروری امور پر مال خرچ کرے۔ جن میں اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور سونے کے لیے جن اشیاء کا استعمال میں لانا ضروری ہے شامل ہیں۔[2]

محمد عبداللہ لکھتے ہیں کہ ''اگر بیوی نے رخصتی سے قبل کوئی چیز نہ لی ہو تو اس پر سامان جہیز لازم نہیں۔''[3]

سید سابق بھی لکھتے ہیں:

''گھر کی شرعی تیاری اور گھر کے لیے ہر اس چیز کا مہیا کرنا جس کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً سامان، بستر اور برتن وغیرہ کا ذمہ دار خاوند ہے۔''[4]

چنانچہ جہیز دینا خاوند کے ذمے ہیں بیوی کی ذمہ داری نہیں ہے۔

جہیز کی نمائش:

ہمارے ہاں یہ بھی رائج ہے کہ شادی کہ موقع پر جہیز کی نمائش کی جائے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ اس قدر سامان دیا گیا ہے۔ جب لوگ دیکھنے کے لیے آتے ہیں تو اس کا خوب چرچا ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے اتنا جہیز دیا، حالانکہ اسلام نے نمود و نمائش سے منع کیا ہے اور پھر اگر دور نبویؐ کا بھی جائزہ لیا جائے تو اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ جہیز کی نمائش کرائی جائے خواہ وہ عورت کی طرف سے دیا گیا ہو یا مرد کی طرف سے اور نہ ہی یہ کوئی نکاح کا لازمی جز ہے۔ آج جہیز کی رسم کو رواج دینے اور پروان چڑھانے میں اپنی رہنماؤں اور دانش وروں کا خاص کردار رہا ہے، کیونکہ یہ حضرات جہیز کے خلاف دھواں دھار تقریریں تو کرتے

---

1 الجنتہ احیاء التراث العربی، الاحکام الشرعیہ، ص:۳۹

2 سہ ماہی منہاج، جولائی ۱۹۸۶ء، ص:۱۶۷

3 محمد عبداللہ، الکوکب الدویہ فی فقہ المالکیہ، ج؛۲:ص:۱۸۶

4 السید سابق، فقہ السنتہ، ج۲، ص:۱۶۷

ہیں اس کی بُرائیاں بھی بیان کرتے ہیں اور دوسری ہی سانس میں اس کو سنت ثابت کرتے ہیں اور دلیل میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی مثال پیش کی جاتی ہے کہ آپ نے ان دونوں کو نکاح کے وقت جہیز دیا تھا۔[1]

نبی ﷺ نے جب حضرت علیؓ کے نکاح کا فیصلہ کیا تو آپؐ نے حضرت علی سے پوچھا کہ آپ کے پاس کیا ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: گھوڑا اور زرہ، آپؐ نے فرمایا: زرہ بیچ دو۔ آپؐ نے وہ زرہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ ۴۸۰ میں فروخت کی اس رقم سے مندرجہ بالا چیزیں خریدی ہوئی تھیں، جو اس وقت اور معیار زندگی تھا۔ بقیہ رقم مہر اور ولیمہ وغیرہ میں استعمال کی گئی۔ اور اگر نبیؐ یہ چیزیں اپنے پاس سے دیتے بھی تو اس حیثیت جہیز کی نہ ہوتی کیوں کہ حضرت علی خود نبی کے زیر پرورش تھے۔[2]

جہیز کو سنت نبوی سمجھنا اس لیے بھی درست نہیں ہے کہ حضور کی دیگر تینوں صاحبزادیوں کو اتنا سامان بھی نہیں دیا گیا۔ اور حضور کی ذات سے یہ بات بعید ہے کہ آپ اپنی اولاد میں کسی قسم کا ترجیحی سلوک روا رکھیں، معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہ کا جہیز حضور کی طرف سے عطیہ نہ تھا ورنہ آپ ﷺ باقی صاحبزادیوں کو بھی ضرور دیتے اور پھر قرآن و حدیث، فقہ کی کتابوں میں شادیوں میں جہیز کا نہ پایا جانا بھی اس بات کا ثبوت ہے، کہ یہ سنت نہیں ہے بلکہ جاہلانہ رسم ہے۔[3]

آج اس رسم کی وجہ سے معاشرے میں اس قدر خرابیاں پھیل چکی ہیں کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ آج اس رسم کی وجہ سے لڑکیوں کو وراثت سے بے دخل کر دیا جاتا ہے یہ کہ کر کہ اتنا جہیز جو دیا تھا، حالانکہ یہ شریعت کے خلاف ہے کیونکہ جب شریعت نے اس کا حق مقرر کیا ہوا تو پھر ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے اس کے علاوہ اس کی وجہ سے آج معاشرے میں نمود و نمائش کی دوڑ شروع ہو چکی ہے ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو وہ سب کچھ دے جو کسی نے نہ دیا ہو۔ مثلاً گار، ٹی وی، فریج، وی سی آر وغیرہ۔ عبدالرحمن انباء جہیز کے معاملے میں موجودہ معاشرے کی تصور پیش کرتے ہیں کہ:

"ہمارے زمانے کے افراد جہیز کے معاملے میں ایسے اسراف میں پڑ گئے ہیں جس کی کوئی حاجت نہیں، اور ان کا مقصد محض اپنی بڑائی کو ظاہر کرنا ہے، اور پھر آج فقراء بھی اس رسم کی خاطر اپنے گھر کے سامان کو بیچ دیتے ہیں یا قرض اٹھاتے ہیں حالانکہ اس کا یہ فعل حرام ہے۔"[4]

---

1 ماہنامہ زندگی نو، مارچ ۲۰۰۷ء ص: ۷۶

2 ماہنامہ زندگی نو، مارچ ۲۰۰۷ء، ص: ۷۶

3 سہ ماہی منہاج، جولائی ۱۹۸۶، ص: ۱۸۲

4 محمد عبدالرحمن النساء، بلوغ الامانی، ج: ۱۶۔ ۱۷۷:

نکاح سے متعلق معاملات:

اسلام نے نکاح کو نہایت سادگی سے انجام دینے کا حکم دیا تھا کہ جس میں دو گواہوں کا ہونا، ولی کا ہونا، عقد نکاح کے الفاظ اور حق مہر کا ہونا ضروری ہوتا تھا، مگر آج نکاح کے معاملے کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ عام انسان کو ادا کرتے ہوئے کئی بار سوچتا ہے، کیونکہ آج نکاح کے ساتھ بھی کئی معاملات ضروری ہو گئیں ہے جیسے:

بارات:

بارات کی خالص ہندوانہ اختراع ہے جیسے جھتے کی صورت میں لوگ جمع ہو کر اور باقاعدہ چڑھائی کے انداز میں لڑکی والوں کے گھر جانا، لڑکی اور مال غنیمت جہیز کی شکل میں لانا بلکہ اگر اس جھتے کو ڈاکووں کا ٹولہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ اس میں بھی لوگ سامان ٹرکوں میں بھر کر فرار ہوتے ہیں۔[1] بارات کی حقیقت ہندؤوں میں بھی اس لیے رائج تھی کہ ان میں لڑکی کو جائیداد سے حصہ نہیں دیا جاتا بلکہ دہیج دیا جاتا تھا اور پُرانے وقتوں میں آمد ورفت کے ذریعے مشکل تھے اور راستے بھی محفوظ نہ تھے چنانچہ ہندو لڑکی اور ران جہیز کو بچانے کے لیے بارات کی شکل میں بدمعاشوں اور ڈاکوں کا ٹولہ لے جاتے تھے۔ اگر راستے میں کوئی حملہ آور ہو جائے تو وہ مال اور لڑکی کو بچا کر لے آئیں، ہوتے ہوتے یہ چیز مسلمانوں میں رائج ہو گئی اور اب اتنی رائج ہو چکی ہے کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ بارات مسلمانوں کا طریقہ نہیں تو اُسے یقین نہیں آتا۔ آج بارات میں سو سے زائد لوگ شادی میں شرکت کرتے ہیں، حالانکہ اسلام میں تو شادی میں دو گواہوں، ولی اور گھر والوں کے علاوہ کسی کی ضرورت نہیں ہوتی مگر آج اپنی شان وشوکت کی خاطر ایسا کیا جاتا ہے بلکہ بارات کو لڑکی والوں کی طرف سے کھانا بھی دیا جاتا ہے جس میں طرح طرح کے کھانے ہوتے ہیں، حالانکہ شادی کی ضیافت شادی کے بعد خاوند کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن آج ان رسومات کو ادا کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور سنت نبویؐ پر عمل نہیں کیا جاتا۔[2]

ولیمے کی تقریب کا معاملہ:

ولیمہ مسنون ہے مگر آج اس کو ایسے طریقوں سے انجام دیا جاتا ہے کہ یہ سنت نبویؐ معلوم ہی نہیں ہوتا کیونکہ سنت نبویؐ تو یہ ہے کہ انسان صرف اتنا کھانا دے جتنا وہ دے سکتا ہے اور یہ کہ وہ دعوت بینڈ باجوں اور ناچ گانوں سے پاک ہو مگر آج ولیموں پر اتنا مال خرچ کیا جاتا ہے کہ لوگ مقروض ہو جاتے ہیں، بلکہ اسی حالت میں اس دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور پھر گانا بجانا اور ناچ گانا تو اسلام میں حرام ہے مگر پھر بھی ایسی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں، اور ان میں طرح طرح کے کھانے پکوائے جاتے ہیں۔

---

1 شاہدہ شوکت، سنت نبوی کے مطابق شادی وبیاہ، ص:۱۹

2 شاہدہ شوکت، سنت نبوی کے مطابق شادی وبیاہ، ص:۱۹

شادی بیاہ سے متعلق شرعی اور غیر شرعی معاملات پر روشنی ڈالنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ شریعت نے شادی بیاہ کا جو طریقہ بتایا تھا وہ نہایت سادہ تھا، مگر آج اس میں جو غیر شرعی معاملات شامل ہو چکی ہیں، ان کا اسلام سے کوئی ربط نہیں ہے کیونکہ یہ تمام معاملات گناہوں اور بے حیائی کا مجموعہ ہیں۔اس صورت حال کا حل اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ بااثر لوگ اپنی شادیوں کی تقریبات میں حتی الامکان سادگی اختیار کریں اور ہمت کر کے ان رسموں کو توڑیں جنہوں نے شادی کو ایک عذاب بنا کر رکھ دیا ہے، اور پھر اگر دولت مند افراد اس طریق کار کو نہیں چھوڑتے تو کم از کم محدود آمدنی والے افراد یہ طے کر لیں کہ وہ دولت مندوں کی حرص میں اپنا پیسہ اور توانائیاں ضائع کرنے کی بجائے اپنی چادر کے مطابق پاوں پھیلائیں گے اور اپنی استطاعت کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے۔

اس سلسلے میں اگر ہم مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر اہتمام کر لیں تو اُمید ہے کہ مذکورہ بالا خرابیوں میں انشاءاللہ نمایاں کمی واقع ہو گی۔

۱۔ خاص نکاح اور ولیمہ کی تقریبات کے علاوہ جو تقریبات منگنی، اور جہیز وغیرہ کے نام رواج پا گئی ہیں اس کو ختم کیا جائے اور یہ طے کر لیا جائے کہ ہماری شادیوں میں یہ تقریبات شامل نہیں ہوں گی۔

۲۔ نکاح اور ولیمے کی تقریبات حتی الامکان سادگی سے اپنے وسائل کی حد میں رہتے ہوئے منعقد کریں کیونکہ نکاح جس میں سادگی ہو بابرکت ہوتا ہے، جیسے کہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ سب سے برکت والا نکاح وہ ہے جس میں زیر باری کم سے کم ہو۔

۳۔ نکاح اور ولیمے کی تقریبات میں سنت نبوی کو مد نظر رکھا جائے تو بھی ان غیر شرعی معاملات سے چھٹکارا حاصل ہو سکتا ہے۔[1]

باہمی معاملات ولین دین کے معاملات کے متعلق عصری رویے:

ان معاملات میں ہم ان موضوعات پر بات کرینگے جس کا اثر معاشرے کے ہر فرد پر پڑتا ہے۔کوئی بھی بندہ تقریباً اس سے محفوظ نہیں ہے۔ان موضوعات میں سب سے پہلے ہم بیمہ کے اوپر بات کرینگے۔

بیمہ: لغوی معنی

بیمہ کے لئے انگریزی زبان میں Insurance (انشورنس) کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور عربی زبان میں اس کو تامین کہا جاتا ہے۔ان تینوں الفاظ یعنی بیمہ، انشورنس، تامین کے معنی "یقین دہانی" کے ہیں۔

اصطلاحی تعریف:

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا مقالہ نگار لکھتا ہے "بیمہ فریقین کے درمیان ایک معاہدے کا نام ہے جس میں ایک فریق (بیمہ کمپنی) دوسرے فریق (بیمہ کرانے والا) کے نامعلوم نقصان کے واقع ہونے پر ایک مقررہ رقم ادا کرنے کا ذمہ لیتا ہے اور

---

1 مفتی محمد تقی عثمانی، ذکر و فکر، مکتبہ معارف القرآن کراچی، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۷۰

اس کے بدلے دوسرا فریق ایک مقررہ رقم اقساط کی شکل میں اس وقت تک ادا کرنے کا عہد کرتا ہے جب تک کہ وہ نامعلوم نقصان واقع نہ ہو جائے۔[1]

بیمہ کی ابتداء:

بیمہ کی ابتداء ۱۴۰۰ء میں اٹلی کے تاجروں نے کی۔ سترہویں صدی عیسوی میں انگلستان میں بیماروں کی امداد کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ اٹھارہویں صدی میں تاجروں نے اپنی انجمنیں قائم کیں اور تاجر برادری کا جو فرد کسی حادثہ کا شکار ہو جاتا اس کی مشترکہ فنڈ سے مدد کی جاتی، تاہم انگلستان سے متعلق قدیم ترین بحری انشورنس کی تاریخ ۱۵۴۷ء بتائی جاتی ہے۔

بیمہ کے مفاسد:

مغرب کے سرمایہ دارنہ نظام کا مجوزہ نظام انشورنس کے بیان کردہ اغراض و مقاصد کے پیش نظر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک سود مند اسکیم ہے جس میں کم از کم بیمہ دار کے دکھوں کا مداوا ہو جاتا ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں انشورنس اپنی موجودہ شکل و صورت اور شرائط کے ساتھ جائز ہے تو اس کا جواب یہی ہو گا کہ بیمہ اپنے بنیادی مقاصد کے ساتھ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے لیکن بیمہ کی جو موجود صورت ہے جس میں دینی اور دُنیوی دونوں قسم کے مفاسد پائے جاتے ہیں اس کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش نہیں، لیکن بیمہ کے مفاسد کے بارے میں بعض علماء حضرات اور مصنفین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ذیل میں اسلامی نقطہ نظر سے اس کے مفاسد پر بحث کیا جاتی ہے۔

ا۔ قمار:

قمار کی تعریف یہ ہے، کہ ایک ایسا باہمی معاہدہ جس میں ایک فریق کسی نامعلوم واقعے کے پیش آنے پر کوئی رقم یا اس کے متبادل کوئی چیز دوسرے فریق کو دینے کا وعدہ کرتا ہے اور قمار شریعت میں حرام ہے۔

وضاحت طلب بات یہ ہے کہ آیا بیمہ میں قمار کا شائبہ پایا جاتا ہے یا نہیں تو اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔

علماء کرام ایک رائے یہ دیتے ہیں کہ بیمہ کے معاہدے میں جس خطرے کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے وہ ایک نامعلوم واقعہ ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ پیش بھی آئے گا یا نہیں اور اگر آئے تو اس میں اصل نقصان کتنا ہو گا۔ یہی بات اسے قمار کی ایک شکل بنا دیتی ہے۔[2]

مولانا مودودی کے مطابق بیمہ میں قمار کا عنصر پایا جاتا ہے کیونکہ موت، حادثات یا کسی نقصان کی حالت میں جو رقم دینے کی زمہ داری یہ کمپنیاں اپنے ذمہ لیتی ہیں[1]۔ بیمہ میں قمار کے ہونے کے بارے میں ایک اور رائے یہ ہے کہ جو آدمی ایک آدھ قسط

---

1 اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱۴: ۴۵۶، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور

2 اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص: ۴۰۶

ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے تو اسے اس کی ادا کردہ رقم سے کئی گنا زائد رقم مل جاتی ہے جو جوئے سے مشابہت رکھتی ہے تھوڑی سے محنت پر اتفاق طور پر بہت زیادہ رقم مل جانے کو ہی میسر کہا جاتا ہے جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ 2

ڈاکٹر نوری محمد غفاری لکھتے ہیں کہ بیمہ کی یہ شرط کہ اگر بیمہ یا شے اس معینہ مدت سے پہلے مر یا تلف ہو جائے تو اصل رقم کے ساتھ جو بونس ملے گا اس کی شرح زیادہ ہو گی اس شرط کے تحت بیمہ کا کاروبار قمار یا جوا سے مشابہ ہے اور جوا کی حرمت قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔

{یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَاالْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْس مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ} [3]

ترجمہ: ''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! بے شک شراب، جواء، بت اور پانسے ناپاک ہیں، شیطان کے کام ہیں پس ان سے بچو شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔''

درج بالا بحث سے یہ بات عیاں ہے کہ بیمہ میں قمار کا عنصر پایا جاتا ہے لیکن دوسری طرف بعض علماء کرام یہ کہتے ہیں کہ بیمہ تمام مفاسد سے پاک ہے۔اس میں قمار کا عنصر نہیں پایا جاتا۔

شریعت نے جس قمار کو حرام فرمایا ہے، اس سے انشورنس پاک ہے۔ قمار اور بیمہ میں بنیادی فرق نفع کی اُمید سے تعلق رکھتا ہے قمار کا مالی محرک اس مالی منفعت کا حصول ہے جو بازی جیت جانے کی صورت میں ہو گی جب کہ بیمہ کرانے کا مالی محرک اس نقصان کی تلافی ہے جو متعلہ خطرہ پیش آجانے کی صورت میں ہو گا، لہذا قمار اور بیمہ کرنے والے کے محرکات یکسر مختلف ہے اول الذکر کی نظر اس خالص نفع پر ہے جب کہ دوسرے کی نظر اس نقصان کی تلافی پر ہے جس کا اسے اندیشہ ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بیمہ کے نتیجہ میں کسی بھی فرد کو بغیر استحقات مزید دولت نہیں حاصل ہوتی بلکہ جو دولت اسے کسی استحقاق کی بنا پر ملی تھی مگر حادثہ کے نتیجہ میں ضائع ہو گئی تھی وہی واپس مل جاتی ہے۔[4]

شاہ ولی اللہؒ[5] نے لکھا ہے کہ قمار سے کوئی تمدنی فوائد نہیں وابستہ ہیں نہ اسے اس طرح کا تعاون قرار دیا جا سکتا جو عام تجارتی لین دین میں پایا جاتا ہے اس کے برعکس اس طریقے کے رواج پانے سے اس تعاون اور ان سرگرمیوں کا ترک لازم آتا ہے جو اس کے لیے ناگزیر ہیں۔[1]

---

1 ابوالاعلیٰ مودودی، معاشیات اسلام، اسلامک پبلشرز لمیٹیڈ لاہور۔۱۹۷۹، ص:۴۰۸

2مولانا عبدالرحمٰن گیلانی، بیمہ، سہ ماہی منہاج لاہور، جنوری اپریل ۱۹۹۲، ج:۱۰

3 سورۃ المائدۃ۵ : ۹۰

4 ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، انشورنس اسلامی معشیت میں، اسلامک پبلیکیشنز لاہور' بدون تاریخ، ص:۵۰

5 حضرت شاہ ولی اللہ ابن شاہ عبدالرحیم ۱۷۰۳ء کو پیدا ہوئے، مغلیہ دور کے مشہور عالم تھے، آپ نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر کافی غور و فکر کی اور ان سے نکلنے کے طریقے بتائے۔ ۱۷۶۳ء کو وفات ہوئی {وکیپیڈیا}

بیمہ اصل تعاون پر مبنی ہے اس سے تمدنی فوائد وابستہ ہیں نیز ان سے ان سرگرمیوں میں مدد ملتی ہے جو تمدن کے لیے نا گزیر ہیں، لہٰذا جس جوئے یا قمار کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے بیمہ یا اس سے پاک ہے۔

۲۔ سود:

سود اس زیادتی کو کہتے ہیں جو قرض پر دیے ہوئے مال پر مدت گزر جانے کے بعد شرط اور تعین کے ساتھ لی جاتی ہے۔ اس بارے میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ بیمہ میں سود کا عنصر پایا جاتا ہے، یا نہیں ذیل میں اسی بحث کی جاتی ہے۔ چونکہ موجودہ بیمہ بیع العرف کا ایک معاہدہ ہے اور چونکہ اس میں نقد تبادلہ اور برابر مقداروں کے شرعی اصول ٹوٹتے ہیں لہذا شریعت میں یہ ایک رہائی معاہدہ ہے جو حرام ہے۔[2]

بیمہ میں جو منافع یا بونس دیا جاتا ہے جو بیع و تجارت کے اصول پر نہیں بلکہ ربوا کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اس لیے چونکہ سود اسلام میں حرام ہے لہذا بیمہ میں بھی یہی معاملہ صادر آتا ہے۔[3]

ربوا تو ہر صورت میں ہے اس لیے کہ اس جمع شدہ رقم کی حیثیت قرض کی ہے، اور منافع گویا اس مہلت کا معاوضہ ہے۔ جو قرض کی واپسی کے لیے دی گئی ہے۔ اسی کا نام ربوا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سود تجارت میں ہوتا ہے قرض میں ہنس ہوتا وہ صریح غلطی اور بدترین قسم کی معنوی تحریف میں مبتلا ہیں۔[4]

بعض علماء کا کہنا ہے کہ بیمہ کے اندر سود نہیں پایا جاتا ہے۔

بیمہ کا معاملہ ربوا سے یکسر مختلف ہے۔ سودی قرض میں قرض لینے والے کو انفرادی طور پر لی گئی رقم سے زیادہ رقم واپس دینی ہوتی ہے اور یہی صورت حال ان تمام افراد کے مجموعہ کے لیے بھی قائم رہتی ہے جو سودی قرض لیتے ہیں بیمہ میں بیمہ کرانے والے افراد کو مجموعی طور پر اتنی ہی رقم واپس ملتی ہے جتنی انہوں نے ادا کی ہوتی ہے اگرچہ انفرادی سطح پر صورت حال مختلف ہوتی ہے۔

سود کی جو تعریف فقہیوں میں مقبول و معروف ہے یعنی وہ زیادتی جو قرض پر دیئے ہوئے رأس المال پر مدت کے مقابلے میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جاتی ہے۔ وہ بیمہ پر چسپاں نہیں ہوتی اور جو راس المال بیمہ خریدنے پر خرچ کیا جاتا ہے وہی غیر متعین ہوتا ہے ایک متعین رقم بیمہ کرانے والے یا اس کے وارثوں کو مل جاتی ہے۔ اس لیے بیمہ میں سودی معاملہ نہیں پایا جاتا۔[5]

---

1 شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، ج:۲، کتب خانہ شان اسلام لاہور ۲۰۱۲ء، ص:۱۰۶

2 اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص:۴۵۷

3 مولانا مفتی محمد شفیع، جدید معشیت و تجارت، ص۱۸

4 مولانا رحمانی، خالد سیف اللہ، جدید فقہی مسائل، پروگریسو بکس ۴۰۔بی اردو بازار، لاہور۔ ص:۲۶۰

5 یعقوب شاہ، چند معاشی مسائل اور اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۔کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص:۲۰۷

۳۔غرر:

غرر وہ ہے جس میں انجام سے بے خبری ہو۔[1] بیمہ کے کاروبار میں غرر اور خطر دونوں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بیمہ شدہ شخص یا شے کا مقررہ مدت سے پہلے ضائع ہونا یا مرنا، اور زندہ رہا تو کم اور فوت ہوا تو زیادہ اور کتنی رقم پائے گا یہ سب معلوم نہیں، لہذا جس کاروبار کو زندگی اور موت کے ساتھ مشروط کیا جائے تو وہ جوا نہیں تو کیا ہے؟ اور اس میں غرر شامل ہے لہذا ایسا کاروبار حرام ہے۔

جس معاہدے کے اندر تین باتوں میں سے ایک بات پائی جاتی ہو اس میں غرر شامل ہو گا۔

۱۔یعنی یہ پتہ نہ ہو کس چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہے۔

۲۔یعنی بائع جو چیز فروخت کر رہا ہے وہ اس کے قبضے میں نہ ہو

۳۔کسی ایسے واقعے سے متعلق کرنا، جس کے وجود میں آئے اور نہ آنے دونوں کا اندیشہ ہو، لہذا بیمہ کے اندر بھی غرر ہے[2]

بیمہ میں غرر اس طرح ہے، کہ یہ معلوم نہیں، کہ کتنے پیسے واپس ہونگے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جتنے پیسے دیے ہیں وہی بمعہ سود واپس ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی حادثے کی حالت میں زیادہ رقم مل جائے۔[3]

اس کے برعکس ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں کہ بیمہ غرر سے بھی پاک ہے غرر دھوکہ ہے جس کی بنیاد عدم علم اور عدم تعین ہے، اور جہاں تک بیمہ کا ربط ہے وہ رقوم معلوم اور متعین ہوتی ہیں جو اسے بیمہ کرنے والے افراد کے مجموعہ سے ملیں گی اور انہیں ادا کرنی ہوں گی۔ بعض حضرات بیمہ میں دوسرے مفاسد کا ذکر بھی کرتے ہیں مثلاً غبن، غش، ضرر وغیرہ۔ لیکن بیمہ اس سے بھی ایک ہے۔ بیمہ کے نجی کاروباری ادارے اگر معقول مقدار سے زیادہ پریمیم وصول کریں تو اسے "غبن" قرار دیا جا سکتا ہے۔ بیمہ کروانے والا درف اپنی عمر، صحت، مالی حیثیت یا جن املاک کا بیمہ کرایا جارہا ہو ان کی ملکیت کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے تو یہ غش کی تعریف میں آئے گا۔

سود کی تعریف:

عربی زبان میں سود کو ربا کہتے ہیں، ربا کا مطلب ہے بڑھنا، اضافہ ہونا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ}[4]

---

1 ابو بکر الکاسانی، بدائع الصنائع، ج:۳، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۶، ص:۶۸،

2 مولانا سراج الحق، بیمہ کی مختلف قسمیں اور شرعی حیثیت، ص:۷۰

3 مولانا محمد تقی عثمانی، اسلام اور جدید معیشت و تجارت، مکتبہ معارف القرآن کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۲

4 سورۃ الحج ۲۲: ۵

ترجمہ: " اور تم زمین کو سوکھی دیکھتے ہو پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو تروتازہ ہو جاتی ہے۔"

فقہاء کی اصطلاح میں سود سے مراد ہے: "ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کے لئے وقت ادائیگی میں مخصوص اضافہ جو بغیر کسی عوض کے ہو"۔

سود کی دو اقسام ہیں:

(۱) قرض کا سود : جس میں قرض دے کر زیادہ طلب کیا جائے یا ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں رقم بڑھادی جائے۔

(۲) تجارت کا سود : اس کی دو اقسام ہیں: (أ) زیادتی کا سود (ربا الفضل) (ب) ادھار کا سود (ربا النسیئہ)

(أ) زیادتی کا سود یہ ہے کہ وہ مخصوص اجناس جنہیں شرعی اصطلاح میں "سودی اجناس" کہتے ہیں میں سے ایک ہی جنس کا تبادلہ کرتے وقت اضافہ کر دینا، جیسے مثال کے طور پر:

پانچ تولہ سونا (سکہ کی صورت میں) = چار تولہ سونے کا سیٹ۔

(ب) ادھار کا سود: سودی اجناس کا آپس میں تبادلہ کرتے وقت ادھار کر لینا، جیسے مثال کے طور پر:

ایک من گندم = ایک من چاول ایک مہینہ بعد۔

تجارت، اجارہ، اور سود میں فرق:

تجارت سے مراد خرید و فروخت کے معاملات ہیں، جس میں ایک بندہ ایک چیز بناتا ہے یا اگاتا ہے یا کہیں سے خرید کر لاتا ہے پھر اسے آگے فروخت کرتا ہے، اس دوران اسے اس چیز کے تلف ہو جانے، ضائع ہو جانے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے، اسے یہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ اس کی یہ چیز فروخت ہو گی یا نہیں اور اگر فروخت ہو گی تو کتنی قیمت پر ہو گی، اسی طرح اجارہ سے مراد کرایہ داری کے معاملات ہیں، جس میں ایک شخص اپنی محنت سے حاصل کردہ ایک چیز کو کچھ رقم کے عوض استعمال کی غرض سے دوسرے شخص کے حوالے کر دیتا ہے اور اس چیز کے تلف ہو جانے کی صورت میں وہ کرایہ سے محروم بھی ہو سکتا ہے، غرض یہ کہ تجارت اور اجارہ میں اگرچہ ایک شخص کو منافع ضرور حاصل ہو رہا ہے لیکن اسے نقصان کا اندیشہ بھی ہے، اور یہ منافع اسے کسی چیز کے بدلہ میں حاصل ہو رہا ہے، جبکہ سود میں سود خور کو کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا اور جو زائد رقم وہ وصول کر رہا ہے وہ کسی چیز یا محنت کے عوض نہیں ہے، بلکہ وہ صرف اس رقم کے بدلہ ہے جو اس نے قرضدار کو دی، اب چاہے قرضدار نے جس مقصد کے لئے بھی رقم لی، چاہے قرضدار کو منافع ہوا ہو یا نقصان ہوا ہو سود خور کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اسے صرف اپنے قرض اور سود سے غرض ہوتی ہے جو قرضدار کو ہر حالت میں ادا کرنا ہوتا ہے اسی لئے اللہ کا فرمان ہے:

{وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا}[1]

---

1 سورۃ البقرۃ ۲: ۲۷۵

ترجمہ: ''اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے''۔

سود لینا اور سود دینا دونوں کا شمار کبیرہ گناہ میں سے ہوتا ہے، اور دونوں پر اللہ کی لعنت ہے، سود کے گناہ میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

{اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ}[1]

ترجمہ: ''جو لوگ سود کھاتے ہیں قیامت کے دن وہ نہیں اٹھیں گے لیکن جس طرح کہ وہ شخص اٹھتا ہے جس کے حواس جن نے لپٹ کر کھو دیے ہیں۔''

اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ سود پر قرض لینا جائز ہے، بلکہ سود پر قرض لینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے:

{وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ}[2]

ترجمہ: گناہ اور زیادتی کے معاملہ میں تعاون نہ کرو۔

اس کے علاوہ کسی کے پاس زیور رکھوا کر قرض لینے کا تعلق ہے تو وہ جائز ہے، کیونکہ قرض کے بدلہ رہن رکھوانے میں کوئی حرج نہیں بلکہ بعض معاملات میں رہن رکھنے کی شریعت نے تاکید کی ہے، فرمان الٰہی ہے:

{وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ}[3]

ترجمہ: '' اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی کو قبضہ میں دے دیا جائے۔''

زیور بطور رہن کے رکھواتے وقت دو باتیں ذہن نشین ہونی چاہئیں۔

(۱) جو رقم دی جارہی ہو زیور کی قیمت سمجھ کر یا اس کے بدلہ نہ دی جارہی ہو کیونکہ اس صورت میں یہ خرید و فروخت کا معاملہ تصور ہوگا اور ایسی خرید و فروخت جس میں سونا یا چاندی شامل ہوں اسے بیع الصرف کہتے ہیں، اور بیع الصرف کی شرط یہ ہے کہ معاملہ ہاتھوں ہاتھ نقد ہو اور فریقین میں سے کسی پر کسی قسم کا ادھار یا قرض باقی نہ رہے، نبیؐ سے بیع الصرف کے حوالے سے سوال پوچھا گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''إِنْ كَانَ يَدًا بِيَدٍ فَلَا بَأْسَ، وَإِنْ كَانَ نَسَاءً فَلَا يَصْلُحُ''[4]

ترجمہ: اگر وہ ہاتھوں ہاتھ ہے تو کوئی حرج نہیں اور اگر وہ ادھار ہے تو جائز نہیں۔

---

1 سورۃ البقرۃ ۲: ۲۷۵

2 سورۃ المائدۃ ۵ : ۲

3 سورۃ البقرۃ ۲ : ۲۸۳

4 صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب: التجارۃ فی البر، حدیث: ۲۰۶۱

لہذا اگر ایسی کوئی صورت ہے تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ یا تو قرض دینے والے کو زیور کا خریدار سمجھا جائے گا اور قرضدار کو زیور کا فروخت کنندہ اور اس صورت میں کوئی قرض باقی نہیں رہے گا، یا پھر اس معاملہ کو فاسد سمجھ کر ختم کر دیا جائے گا۔

(۲) قرض کی واپسی میں کسی زائد رقم کا مطالبہ نہ ہو، اور نہ ہی تاخیر پر کوئی جرمانہ لگایا جائے۔

اسی طرح مثال کے طور پر ایک شخص اپنی بھینس کسی کو ایک سال کے لئے تیس ہزار روپے کے عوض سپرد کر دیتا ہے، اگر یہ معاملہ اجارہ یا کرایہ کا ہے کہ کرایہ دار نے تیس ہزار روپے کرایہ کے عوض ایک سال کے لئے بھینس حاصل کی ہے تو اس کے لئے اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، وہ اس کا دودھ بیچ کر نفع حاصل کر سکتا ہے، اور اگر قرض لے کر بھینس کو بطور رہن کے رکھوایا ہے تو قرض خواہ کے لئے اس صورت میں اس کا دودھ بیچنا حلال ہوگا جب اس بھینس کے چارہ پانی کا بندوبست بھی اس کے سپرد ہو۔

حضورؐ کا ارشاد ہے: "الرِّهْنُ مَرْكُوْب وَمَحْلُوْب" [1]

ترجمہ: رہن اگر مویشی ہو تو اس پر سواری بھی کی جاسکتی ہے اور اس سے دودھ بھی لیا جاسکتا ہے۔

"أَجْمِعُوْا عَلَى أَنَّ الْمُسْلِفَ إِذَا شَرط عَلَى الْمستَسْلف زِيَادَة أَوْ هَدِيَّة فَأَسْلَفَ عَلَى ذٰلِكَ: أَن أخذ الزِّيَادَة عَلٰى ذٰلِكَ رِبَا" [2]

ترجمہ: " اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے، کہ جب ادھار دینے والا، ادھار لینے والے پر یہ شرط لگائے کہ وہ اسے زیادہ دے گا، یا کوئی تحفہ دے گا اور اس شرط پر وہ اسے ادھار دے تو اس کا یہ اضافی پیسے لینا سود ہے۔"

تاخیر کا خدشہ ہر دور میں رہا، لیکن کسی بھی عالم نے اس جرمانہ کو جائز قرار نہیں دیا، لہذا مالی جرمانہ کے علاوہ کوئی بھی سزا دی جاسکتی ہے۔ عصر حاضر میں کاروبار کی یہ شکل بھی سامنے آئی ہے کہ چند افراد ملکر ایک کاروباری اسکیم شروع کر دیتے ہیں اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ مثلاً وہ چالیس ممبر متعین کرتے ہیں ہر ممبر ہر مہینے دو دو ہزار روپے ادا کرتا ہے اور ہر ماہ ایک دفعہ قرعہ اندازی کی جاتی ہے جس میں ایک موٹر سائیکل نکال لی جاتی ہے جس کے نام نکل آئے اس سے بقیہ قسطیں معاف کر دی جاتی ہیں یہی سلسلہ ہر ماہ جاری رہتا ہے اور اگر کسی کا قرعہ اندازی میں نام نہ نکلے تو موٹر سائیکل کی قیمت کی معینہ قسطیں ادا کرنے کے بعد موٹر سائیکل اس کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ یہ صورت جائز نہیں کیونکہ اس میں جوا ہے، جوا کی تعریف علماء یوں کرتے ہیں کہ:

"ایسا معاہدہ جس میں دو یا دو سے زائد شریک ہوں، ایک کو نفع ہو باقی نقصان میں رہیں اور کسی کے علم میں نہ ہو کہ کون نقصان میں رہے گا اور کون نفع میں"، اس معاملہ میں بالکل یہی صورتحال ہے، سب سے پہلے جس شخص کا نام نکلے گا وہ سب سے زیادہ

---

1 سنن دار قطنی ۳: ۴۴۱، حدیث: ۲۹۳۰، ضعیف

2 ابو بکر محمد بن ابراھیم بن المنذر، الاجماع، دار الآثار للنشر والتوزیع، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۰۹۔ المغنی ابن قدامۃ ۴: ۲۴۰، مکتبۃ القاھرۃ، ۱۹۶۸ء

منافع میں رہے گا، اور جس کا نام نہ نکلے وہ سب سے زیادہ نقصان میں رہے گا اور جوا کو اللہ رب العزت نے حرام قرار دیا ہے چاہے کھیل میں ہو چاہے خرید و فروخت میں، فرمان الٰہی ہے:

{يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ} [1]

ترجمہ: "اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور فال کے تیر سب شیطان کے گندے کام ہیں سو ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پا سکو۔"

اسے خرید و فروخت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ خرید و فروخت کے لئے شرط ہے کہ چیز کی قیمت متعین ہو، جبکہ یہاں چیز کی قیمت کا تعین نصیب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جب قرعہ اندازی میں نام نکلے گا تو اس وقت تک جتنے پیسے ادا کئے گئے ہوں گے اسی کو قیمت شمار کر لیا جائے گا، اس طرح چیز کی قیمت معلوم نہیں ہے اور نامعلوم قیمت پر خرید و فروخت ناجائز ہے۔

اسی طرح مثلاً اگر کوئی کسی کمپنی کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں، اور اس کمپنی کے ملازم ہمارے ساتھ کام کرنے کے عوض رشوت لیتے ہیں اور اگر ہم اپنا ناقص مال سپلائی کرنے کے لئے رشوت دیں اس میں دو صورتیں ہیں:

(۱) اگر بندہ اپنا کام بخوبی انجام دیتا ہے اور کام کا حق ادا کرتا ہے لیکن اگر وہ کمپنی کے ملازمین کو رشوت نہ دے تو اس کا حق مارا جا سکتا ہے اور سائل کے لئے کوئی اور راہ نہیں بچتی تو اس صورت میں اپنا حق بچانے کے لئے اگر سائل مجبوراً کچھ رقم ادا کرتا ہے تو وہ اس کے لئے جائز ہے، البتہ کمپنی کے ملازمین یا ہر وہ بندہ جو اس رشوت خوری میں ملوث ہے وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

(۲) اگر بندہ اپنا کام بخوبی انجام نہیں دیتا، ناقص مال سپلائی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی حق والے کا حق مارنے کے لئے کمپنی کے ملازمین کو رشوت دیتا ہے تو رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونگے اور اس صورت میں سائل کی آمدنی بھی حرام شمار ہو گی۔ نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

"الرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ فِيْ النَّارِ" [2]

ترجمہ: رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں آگ میں ہوں گے۔

اسی طرح دار الحرب سے مراد وہ شہر یا ملک ہے جہاں شرعی احکامات نافذ نہ ہوں، جہاں حکمران کافر ہوں اور مسلمانوں کے پاس قوت و طاقت نہ ہو۔ دار الحرب کے سود کا مطلب یہ ہے کہ بعض علماء کے ہاں دار الحرب یا دار الکفر میں سودی لین دین جائز ہے اور وہ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

---

1 المائدۃ ۵ : ۹۰

2 المعجم الاوسط، طبرانی ۲: ۲۹۵، حدیث: ۲۰۲۶، امام البانی نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ، ناصر الدین البانی ۱۶: ۸۵۹ دار المعارف الریاض ۱۹۹۲ء

"لَا رِبَا بَيْنَ مُسْلِمٍ وَحَرْبِي فِيْ دَارِ الْحَرْبِ"[1]

ترجمہ: مسلمان اور کافر کے درمیان دار الحرب میں کوئی سود نہیں ہے۔ یعنی سودی لین دین جائز ہے۔

راجح بات یہ ہے کہ سودی لین دین کسی مومن کے لئے جائز نہیں چاہے وہ دار الاسلام میں ہو یا دار الکفر میں کیونکہ اللہ نے سود کو مطلقاً حرام کر دیا ہے اور اسے اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ کھلا اعلان جنگ قرار دیا، اور اس میں کسی قسم کا کوئی استثناء نہیں، جہاں تک مذکورہ حدیث کا ربط ہے تو یہ حدیث ضعیف ہے اور اگر اس حدیث کو صحیح فرض کر بھی لیا جائے تو اس سے مراد وہ نہیں ہے جو ذکر کیا جاتا ہے بلکہ اس کا ترجمہ اس آیت کی طرح ہو گا:

{فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ }[2]

ترجمہ: تو مباشرت کرنا، گناہ کرنا جھگڑا کرنا حج میں نہیں ہے۔

یعنی ایسے کام کرنا دوران حج جائز نہیں ہے، اس سے مراد یہ نہیں کہ دوران حج ایسے کام کر بھی لے تو حرج نہیں ہے، اسی طرح حدیث کا مطلب بھی یہی ہو گا کہ "مسلمان کے لئے دار الحرب میں کسی کافر سے بھی سودی لین دین جائز نہیں ہے"۔

اسٹاک ایکسچینج:

اسٹاک ایکسچینج میں شئیرز کی لین دین کا کاروبار جائز ہے جب اس میں چند شرائط کو مد نظر رکھا جائے:

۱۔ صرف شئیرز کی خرید فروخت ہو، بانڈز کی خرید و فروخت نہ ہو، کیونکہ بانڈز در اصل اس قرض کی دستاویز ہے جس پر سود ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بانڈز مختلف کمپنیوں کی جانب سے اور حکومت کی جانب سے جاری کئے جاتے ہیں۔ ان بانڈز کی خرید و فروخت جائز نہیں کیونکہ یہ بانڈز ایک مخصوص رقم کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کو بیچنا رقم کا رقم کے ساتھ تبادلہ کرنا ہے، اور رقوم کے تبادلہ میں کمی بیشی سود ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بانڈز بذات خود ایک سودی لین دین پر مشتمل دستاویز ہے۔

۲۔ صرف ان کمپنیز کے شئیرز خریدنا اور بیچنا جائز ہے جن کا کاروبار حلال ہو، کیونکہ شئیرز در اصل کمپنی میں شراکت داری کی نمائندگی کرتے ہیں، اور ایسی کمپنی جو حرام کاروبار کرتی ہو اس میں شراکت داری حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ }[3]

ترجمہ: گناہ اور زیادتی کے کام پر تعاون نہ کرو۔

---

1 معرفۃ السنن والآثار، ابو بکر البیہقی ۱۳، ص: ۲۷۶، حدیث: ۱۸۱۶۹، بلفظ آخر، دار الوفاء قاہرۃ ۱۹۹۱ء ھذا حدیث غریب لہ اصل (البنایۃ بدر الدین عینی ۷: ۳۸۵)

2 سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۹۷

3 سورۃ المائدۃ ۵ : ۲

3۔شئیرز کی خرید و فروخت ہاتھوں ہاتھ ہو، نقد ہو، مستقبل کا سودا نہ کیا جائے، نہ ہی ادھار کیا جائے، کیونکہ شئیرز کمپنی میں شراکت داری کی نمائندگی کرتے ہیں اور کمپنی کے اثاثوں میں ٹھوس اثاثہ جات بھی ہوتے ہیں اور نقدی بھی شامل ہوتے ہیں اس لئے شئیرز کو ایک الگ جنس تصور کرتے ہوئے بیچتے وقت اس کی اصل قیمت سے زیادہ بھی وصول کیا جاسکتا ہے، لیکن اس میں ادھار جائز نہیں، کیونکہ رقوم کے تبادلہ میں اگر جنس مختلف ہو، (یعنی مثلاً روپے کے بدلہ ڈالر، اسی طرح روپے کے بدلہ شئیرز تو اس میں کمی بیشی تو جائز ہے لیکن ادھار جائز نہیں، نبی ﷺ کا فرمان ہے:

"الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الْأَصْنَافُ ،فَبِيْعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ"[1]

ترجمہ: " سونے کے بدلہ سونا، چاندی کے بدلہ چاندی، جو کہ بدلہ جو کھجور کے بدلہ کھجور، نمک کے بدلہ نمک برابر ہو اور ہاتھوں ہاتھ اور جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جیسے چاہو بیچو جب یہ ہاتھوں ہاتھ ہوں۔"

لہٰذا شئیرز کی خرید و فروخت میں ادھار درست نہیں، خاص طور پر اس لئے بھی کہ مستقبل کے سودے کے ذریعہ شئیرز کے لین دین میں جوا بھی کھیلا جاتا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

"لَا تَبع مَا لَيْسَ عِنْدَكَ"[2] ترجمہ: جس چیز کے تم مالک نہیں ہو وہ مت بیچو۔

یعنی صرف وہی شئیرز بیچے جائیں جن کی ملکیت حاصل ہو، ایسا نہ کیا جائے کہ پہلے شئیرز کا سودا کر لیا پھر کہیں سے وہ شئیرز لے کر خریدار کو تھمادیئے۔

1 صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب بیع الصرف الذھب بالورق نقدا، حدیث:۱۵۸۷

2 سنن ابی داؤد، کتاب الاجارۃ، باب: فی الرجل یبیع مالیس عندہ، حدیث:۳۵۰۳۔ صحیح

فصل سوم: قرآن وسنت کی روشنی میں معاملات کے صحیح تصور کی وضاحت

معاملات کی درستگی دین کا اہم باب ہیں۔ جسے بد قسمتی سے ہم لوگوں نے اپنی زندگیوں سے خارج کر دیا ہے۔ اور دین صرف نماز، روزہ، حج و عمرہ اور اوراد و وظائف پر منحصر کر دیا ہے۔ روپے پیسے کے لین دین کو آزاد چھوڑ دیا جیسے اس سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں۔ حالاں کہ شریعت اسلامیہ پر روشنی ڈالی جائے تو پتا چل جاتا ہے کہ عبادات کے احکامات ایک چوتھائی جب کہ تین چوتھائی معاملات و معاشرت کے متعلق ہیں۔

معاملات کی کمزوری تمام طبقات میں پائی جاتی ہے۔ دینی فکر رکھنے والے لوگ بھی معاملات میں سستی برتتے ہیں۔ جس کا اثر جہاں ان کی شخصیت پر پڑتا ہے وہیں عبادات اور دین پر بھی پڑتا ہے۔ مقابل والے دین سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ جب کہ یہ تو اس شخص کا اپنا فعل ہے۔ دین تو وعدے کی پاسداری، معاملات کی درستگی کا حکم دیتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرمایا کرتے تھے "مجھے جب کسی مرید یا شاگرد کے متعلق پتا چلتا ہے کہ یہ عبادات میں سستی کرتا ہے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا جب پتا چلتا ہے کہ فلاں شخص معاملات میں سستی کرتا ہے۔ معاملات یہ مقام رکھتے ہیں کہ اگر انسان روپے پیسے کے معاملات میں کوتاہی برتتا ہے، حلال حرام، جائز ناجائز کا امتیاز نہیں رکھتا تو اس کا اثر عبادات پر پڑتا ہے کہ اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ عبادات میں کوتاہی ہو جائے تو اس کی تلافی قدرے آسان ہے فرض نماز چھوٹ گئی تو اب زندگی میں قضاء لوٹا لو، اگر زندگی میں ادا نہ کر سکے، تو وصیت کر لے کہ اگر میں مر جاؤں اور نمازیں ادا نہ ہوئی ہوں تو میرے مال میں سے فدیہ ادا کر دیا جائے، اور توبہ کر لے اللہ کریم کے ہاں تلافی ممکن ہے لیکن اگر کسی کا مال ناجائز طریقہ سے کھا لیا، ہڑپ کر لیا، تو اس کی تلافی اس وقت ممکن ہے جب صاحب حق آپکو خود معاف کر دے۔ چاہے ہزار بار توبہ کرے، ہزار نفلیں پڑھے، ہزار تسبیح پھیرے معافی نہیں ہو گی۔

معاملات کے شعبے میں مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کا سچا اور پکا ہوتا ہے۔ وہ کسی دھوکا دہی، فراڈ، فریب، بد عہدی کا معاملہ نہیں کرتا اور بے جا طریقے سے دوسرے کا حق غصب کرنے کی فکر میں نہیں رہتا۔ چناں چہ ارشاد ہے: "اور وہ مومن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا پاس کرنے والے ہوتے ہیں"۔ امانت کے لغوی معنی میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کی ذمہ داری کسی شخص نے اٹھائی ہو، اور اس کے معاملے میں اس پر بھروسہ کیا گیا ہو۔ لیکن آج الٹ ہو گیا ہے۔ معاملات کی درستگی میں کفار تو صاف ستھرے نکلتے ہیں۔ جو وعدہ کریں نبھاتے ہیں، بات کے سچے ثابت ہوتے ہیں، دیگر لین دین کے معاملات میں بھی کھرے نکلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کی تمام صفات پر وہ لوگ پورا اترتے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے۔ مگر افسوس ہم مسلمان بہت سستی برتتے ہیں۔ کھرا بول کے کھوٹا بیچتے ہیں۔ معاہدہ کر کے توڑ دیتے ہیں۔ اشیائے فروخت میں ملاوٹ یا ان کے عیب کو چھپا دیتے ہیں۔ معاملات کی صفائی، ایفائے عہد مومن کا وہ طرہ امتیاز رہا ہے جسے دیکھ کر بہت

سے کافر مسلمان ہوئے۔ مگر آج وعدہ خلافی کو ہم جرم ہی نہیں سمجھتے، معاملات کو دین سے بالکل ہی الگ سمجھتے ہیں۔ نماز تو پنج وقتہ پڑھیں گے، تسبیح بھی اہتمام سے پھیریں گے، لیکن جب معاملے کہ باری آئے گی تو ناپ تول میں کمی، وعدی خلافی، جھوٹ، فریب، دھوکا۔ جب کہ اس سب سے دین اسلام سختی سے منع کرتا ہے۔ معاملات میں ہم اگر صاف نہیں تو ہمارے بقیہ سارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ حضرت معاذ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا، کہ سب سے عمدہ پیشہ ان سوداگروں کا ہے جو بولتے ہیں تو سچ بولتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے اور اگر ان کے پاس امنانت رکھو تو وہ خیانت نہیں کرتے اور جب کسی سے وعدہ کرے تو وعدہ خلافی نہیں کرتے، جب کوئی چیز فروخت کرتے ہیں تو اس کی بے حد تعریف نہیں کرتے اور جب کوئی چیز خرید تے ہیں تو اس کی قیمت ادا کرنے میں دیر نہیں کرتے اور اگر ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو مقروض پر سختی نہیں کرتے۔

بعض مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام ایک محدود دین ہے جو صرف نماز روزہ اور دیگر عبادات سے متعلق راہ نمائی کرتا ہے، جبکہ تجارت، کاروبار، ملازمت اور معاملات سے متعلق کوئی راہ نمائی فراہم نہیں کرتا بھی ہے تو وہ اس جدید دور کے لیے ناکافی ہے۔ دوسری طرف بعض مسلمانوں کا یہ نظریہ تو نہیں البتہ ان کا عمل ان کے نظریے کی نفی کرتا ہے وہ معاملات سے متعلق احکامات سیکھنے اور عمل کرنے میں اتنی فکرمندی اور چستی کا مظاہرہ نہیں کرتے جس قدار عبادات سے متعلق ہے۔

اب ہم باہمی لین دین، خرید و فروخت کے معاملات پر قرآن و سنت کے تناظر میں روشنی ڈالتے ہیں۔ قرآن و سنت کے تناظر میں لین دین، خرید و فروخت، قرض وغیرہ کی کچھ اصول و ضوابط درج ذیل ہیں:

ا۔ معاملات کے سلسلے میں خلق خدا کے ساتھ نرمی کا رویہ رکھنا:

چند بنیادی باتیں ایسی ہیں کہ جن پر ہر مسلمان کو ہر معاملہ میں مد نظر رکھنا چاہیے۔ مثلاً لین دینی میں، خرید و فروخت میں، کاروبار میں اللہ کی مخلوق کے ساتھ بلند اخلاق سے پیش آنا ہے۔ لوگوں سے سہولت و رعایت کا معاملہ روا رکھنا، خندہ پیشانی سے پیش آنا، قربانی و سخاوت کا مظاہرہ کرنا اور اپنے بھائیوں کے لیے مجبوری و تنگی اختیار نہ کرنا، بالخصوص مجبور اور بے کس انسانوں سے محبت، شفقت اور نرمی کا رویہ رکھنا ضروری امر ہے۔ جب کسی کے ساتھ حق و قرض کا معاملہ ہو تو بے جا ٹال مٹول اور تاخیر سے کام نہ لو بلکہ پوری ایمانداری سے حقدار کو اس کا حق دو۔ "رسول کریمؐ کا فرمان ہے:

"اللہ تعالیٰ ایسے بندے ہر بہت رحم فرماتا ہے کہ جو چیز خرید تا ہے تو آسانی نرمی، سخاوت و رعایت کا معاملہ اختیار کرتا ہے اور جب کبھی اپنے حق کا تقاضا کرتا ہے تو بھی نرمی، رعایت اور سخاوت سے پیش آتا ہے۔[1]

1 صحیح بخاری: کتاب البیوع، باب السھولۃ والسماحۃ فی الشراء والبیع

۲۔ تجارت و کاروبار کے متعلق شرعی احکامات جاننا:

اسلام میں کوئی بھی اسلامی مملکت اس وقت تک فلاحی ریاست نہیں بن سکتی کہ جب تک اپنے بازاروں میں، کاروباری مراکز میں، اپنی منڈیوں میں اسلامی شرعی احکامات کا نفاذ نہ کرے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان جگہوں پر کام کرنے والے کاروباری حضرات، تاجر و دکاندار حرام وصول کرنے کے متعلق، ناجائز و جائز کے متعلق امور سے پوری طرح واقف ہوں۔ اسلامی تاریخ کی یہ روایت رہی ہے کہ مسلمان خلیفہ یا اس کے کارندے وقتاً فوقتاً کاروباری مراکز اور بازاروں، منڈیوں کا جائزہ لیتے رہے، اب اگر ان اسلامی شرعی اصولوں سے واقفیت نہ ہو گی، حلال و حرام، جائز و ناجائز کا فرق معلوم نہ ہو گا تو ہماری معیشت کا وہی حال ہو گا کہ جس کے آج ہم شکار ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"لَا بَیْعَ فِیْ سَوْقِنَا اِلَّا مَنْ تَفَقَّہَ فِیْ الدِّیْن"[1]

ترجمہ: " ہمارے بازاروں میں وہی کاروبار کرے کہ جسے دین کے احکامات کی واقفیت ہو۔"

۳۔ شک میں ڈالنے والے اور مشتبہ امور سے دور رہنا:

باہمی کاروبار و تجارت میں بہت سے امور ایسے بھی ہیں کہ جن کے حلال یا حرام ہونے میں شک پایا جاتا ہے، یعنی ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ امور جائز ہیں یا ناجائز ہے۔ مثلاً

- ایسے اداروں یا لوگوں کے ساتھ کام کرنا کہ جن کا زیادہ تر حصہ ناجائز دولت سے حاصل کیا گیا ہو۔
- ایسے ادارے کہ جن میں زیادہ تر حرام اور ناجائز کام ہو رہا ہو۔
- ایسے شخص کے ساتھ کام کرنا کہ جس کا زیادہ تر مال حرام ہو۔
- ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنا کہ جس کا زیادہ تر حصہ حرام مال پر ہو۔

رسول اللہ کا فرمان ہے:

"یقیناً حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور میں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے، جو ان مشتبہ امور سے دور رہا، اس نے اپنے آپ کو بچا لیا، اس نے اپنے دین کو بچا لیا اور جو شبہات میں مبتلا ہوا وہ حرام میں واقع ہوا۔"

ہر وہ چیز حلال ہے سوائے اس کے کہ جس چیز کا شرعی دلائل سے حرام ثابت ہو۔ اس ضابطہ کا مطلب یہ ہے کہ شرعی لین دین کے تمام معاملات جائز ہیں جب تک کہ ان میں شرعی لحاظ سے کوئی سبب موجود نہ ہو۔ مثلاً کوئی مسلمان اپنی کوئی چیز بیچنا چاہتا ہے ایک دوسرا مسلمان کہتا ہے کہ یہ چیز حرام ہے۔ اب حلال کہنے والا شرعی دلیل نہیں دے گا بلکہ حرام کہنے والا اس کی حرمت کی دلیل دے گا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

---

1 شرح السنۃ: کتاب البیوع باب الاتقاء عن الشبہات، حدیث: ۲۰۳۴، ص: ۱۰۸۷

{وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا}[1]

ترجمہ: "حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کا حرام کیا ہے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تجارت کو مطلقاً حلال اور سود کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ اس آیت کے مطابق زمین اور اس کے متعلقات اناج، حیوانات سب حلال ہیں، تاہم اگر ان میں کوئی شرعی سبب پایا جائے گا جیسے سود اور رباء تو ایسی صورت میں یہ خرید و فروخت حرام ہوئی۔ اسی طرح قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

{يَآاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةٍ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ}[2]

ترجمہ: " اے ایمان والوں تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤہاں سوائے باہمی رضامندی کے۔

اس آیت کے مطابق باہمی مشورے سے منافع خوری مناسب امر ہے تاہم وہ منافع جو حرام ہو، جائز نہیں ہے۔ اسی طرح وہ منافع جو ظلم و زیادتی اور ناانصافی اور حرام کاری پر مبنی ہو وہ بھی حرام ہے۔ کاروبار، تجارت میں ہر طرح کا شرط جائز ہے۔ رسولؐ کا فرمان ہے:

"اَلْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ اِلَّا شَرْطًا اَحَلَّ حَرَامًا اَوْ حَرَّمْ حَلَالًا "[3]

ترجمہ: " معاملات میں ہر قسم کی شرط جائز ہے سوائے ایسی شرط نہ ہو جو شرعی دلائل کی رو نا جائز ہو۔"

اس حدیث کے مطابق اگر شرط کا تعلق کسی مصلحت کے لحاظ سے ہو، کسی وصف کی وجہ سے ہو، تو جائز ہے جب تک کوئی ایسی شرعی دلیل و سبب نہ پایا جائے کہ جو اسے حرام قرار دے۔

۴۔ اسلامی معیشت کا ہر معاملہ سود سے پاک ہو:

دنیا کا کوئی بھی معاشرہ کہ جو اپنے نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھنا چاہتا ہو اس کے لیے سود ایک ناسور ہے۔ سود چاہے تجارتی لحاظ سے ہو، غیر تجارتی لحاظ سے ہو، ہر حوالے سے جائز نہیں اور بالخصوص اسلامی معیشت کے لیے تو یہ زہر قاتل ہے، کیونکہ اسلامی معیشت کی بنیاد عادلانہ، منصفانہ اور ترقی یافتہ ماحول کی ضمانت دیتی ہے۔ یہاں ظلم و زیادتی، ناانصافی، فتنہ و فساد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، لہٰذا یہاں سود اور سودی نظام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے سود کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ قرار دیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

{يٰاَيهاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ}[1]

---

1 سورۃ البقرۃ ۲ :۲۷۵

2 سورۃ النساء ۴ : ۲۹

3 سنن ابی داؤد، اول کتاب الاقضیۃ، باب: فی الصلح، حدیث: ۳۵۹۴ صحیح۔

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ باقی سود رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو۔ اگر تم نے نہ چھوڑا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے، اور اگر توبہ کر لو تو اصل مال تمھارا تمہارے واسطے ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔"[1]

۵۔ کسی بھی معاملہ میں جوا اور قمار بازی سے کام نہ لیا جائے:

قرآن میں ارشاد ہے:

{يَآيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ}[2]

ترجمہ: "اے ایمان والوں شراب اور جوا، بت اور فال کے تیر سب شیطان کے کام ہیں پس ان سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

اس لحاظ سے کوئی بھی ایسا معاملہ کہ جس سے مال و دولت مفت میں ہاتھ آجائے یا کسی کا مال و دولت ناجائز طریقے سے ہاتھ سے نکل جائے۔ دور حاضر میں جوئے کی بہت سی اقسام ہیں کہ جن کو حرام سمجھا ہی نہیں جاتا۔ بہت سی اسلامی ریاستوں میں حکومتی سرپرستی میں جوئے کی بہت سی اقسام پرورش پاتی ہے۔ اس کے علاوہ جوئے کی بہت سی اقسام سے لوگ ناواقف بھی ہیں مثلاً بیمہ، شطرنج، کرکٹ کار ریسنگ وغیرہ۔ یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ ضروری نہیں کہ جوا کی صورت میں ہزاروں، لاکھوں روپے لگائے جائیں بلکہ اس مد میں اگر ایک روپیہ بھی لگا یا جائے تو وہ جوا ہی کہلائے گا۔ ایک مقام پر آپؐ نے فرمایا ہے کہ یقیناً یوم آخرت کو تاجر گناہ گاروں اور فاسقوں کے زمرے میں اٹھائے جائیں گے سوائے وہ تاجر جو سچائی کو اپنائیں اور نیکی کریں۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے وہی پسند کرے جو اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرتا ہے، اگر اس کے ساتھ کوئی غلط معاملہ ہوتا اسے ناپسند ہوگا اور اسے ناگوار گزرے گا، اور اس کے لئے پریشانی اور تکلیف کا باعث ہوگا، یہی حال وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے کریں اور اس کے ساتھ کوئی غلط نہ کریں۔ رسول اللہؐ کا فرمان ہے: "تم میں سے کوئی اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا کہ جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔"[3]

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام ہر معاملہ میں چاہے وہ خرید و فروخت ہو، تجارت ہو دکانداری ہو، ہر معاملہ میں سچائی اور امانت داری اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور لوگوں کے ساتھ ہر قسم کی دھوکہ دہی، دھاندلی اور غلط بیانی کو حرام قرار دیتا ہے۔

---

1 سورۃالبقرۃ ۲ : ۲۷۸،۲۷۹

2 سورۃالمائدۃ۵: ۹۰

3 صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان آن یحب لآخیہ

٦۔ مفاسد اور نقصان دینے والے ذرائع کو روکنا:

معیشت میں کچھ اسباب ایسے بھی ہیں کہ جو بظاہر جائز اور حلال ہوں مگر نافرمانی، مفاسد اور نقصان کی طرف لے جانے والوں ہوں، فتنہ و فساد کا باعث بننے والے ہوں شریعت انہیں بھی حرام اور ناجائز قرار دیتا ہے۔ مالی معاملات میں بیع العینہ اس کی مثال ہے:

بیع العینہ کیا ہے:

کوئی بھی چیز زائد قیمت پر ادھار بیچی جائے اور وہی چیز اس سے کم قیمت پر خریدی جائے شریعت نے اس قسم کے معاملہ سے منع فرمایا ہے، کیونکہ یہ سود کے دروازے کھولتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو اگر ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہو اور وہ کسی سے ادھار لے مگر ادھار دینے والا اس شرط پر ادھار دے کہ اسے ایک لاکھ دس ہزار واپس کرے گا یا ایک سودا کرتا ہے کہ ضرورت منداسے ایک لاکھ دس ہزار کے برابر مال واپس کرے گا۔ ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے اور ادھار دینے والے کو دس ہزار اضافی مل جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شریعت میں بے شمار مسائل میں اس اصول سد الذرائع کو مد نظر رکھا گیا ہے، اور یہ قاعدہ ہمارے لیے عقائد، عبادات و معاملات وغیرہ میں بہت ضروری امر ہے، اور شریعت کے خلاف کاموں سے بچنے کا بنیادی ذریعہ ہے جسے سمجھنے اور اور اس کے مطابق عمل کرنے میں ہی خیر وعافیت ہے۔ قرآن میں سد الذرائع کے حوالے اللہ فرماتا ہے:

{وَلَا تَسُبُّوْ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوااللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ }[1]

ترجمہ: ” اے مسلمانوں! یہ لوگ اللہ کے علاوہ جن کو پکارتے ہیں انہیں گالی نہ دو، ورنہ یہ لوگ جہالت کی وجہ سے چڑ کر اللہ کو گالی دیں گے۔“

کافروں کا بتوں کی عبادت کرنا، غیر اللہ کو معبود ماننا باطل اور منکر ہے لیکن یہاں اللہ کی ذات نے کافروں کے ان باطل معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا ہے، تاکہ وہ نعوذ باللہ اللہ کو گالی دینے کا ذریعہ نہ بنے۔

---

1 سورۃ الأنعام ٦: ١٠٨

کچھ سازش اور کچھ ہماری کی کوتاہیاں:

جب سے دنیا پر مغربی استعمار کا غلبہ ہوا، اس وقت سے دین کو ایک منظم سازش کے تحت صرف عبادت گاہوں، تعلیم گاہوں اور زاتی زندگی تک محدود کر دیا گیا ہے۔ سیاسی اور معاشی سطح پر دین کی گرفت نہ صرف یہ کہ ڈھیلی پڑ گئی ہے بلکہ رفتہ رفتہ ختم ہو چکی ہے۔ آج سیکولرزم نظریے کا بڑا شور سنائی دیتا ہے کہ اجتماعی امور مثلاً معیشت اور سیاست وغیرہ مذہب سے آزاد ہیں اور کوئی مذہب بشمول اسلام اس سلسلے میں کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ جبکہ انفرادی اور ذاتی کام مثلاً: نماز روزہ عبادات کے سلسلے میں کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ جبکہ انفرادی اور ذاتی کام مثلاً نماز، روزہ عبادات کے سلسلے میں انسان جس مذہب میں سکون میں پائے اسے اختیار کر سکتا ہے، گویا عبادات کے شعبے میں مذہبی احکامات پر عمل، انسانی حق ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ راحت اور سکون کے لیے ہیں۔

جب مغربی استعمار نے اسلامی ملکوں پر اپنا تسلط جمایا تو اس نے سیکولرزم کا یہ نظریہ بھی خوب پھیلایا اور بروز شمشیر پھیلایا۔ انہوں نے سیاسی اور معاشی اداروں سے دین کا رابطہ توڑا۔ وہ اس رابطے کو توڑنے کے لیے ایسا تعلیمی نظام بھی رائج کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے دین کا رشتہ سیاست، معشیت اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے کاٹ دیا اور مذہب کو محدود کر کے رکھ دیا۔

ایک طرف دشمنوں کی یہ سازش تھی اور دوسری طرف اس سازش کے کامیاب ہونے میں کچھ حصہ ہمارے اپنے طرز عمل کا بھی ہے کہ ہم نے اپنی زندگی میں جتنی توجہ عبادات کے اوپر صرف کی اتنی توجہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرف نہیں دی۔ ہمارے عمل میں جتنا اہتمام اور عبادات کی درستگی کا تھا اتنا اہتمام معملات، معاشرت اور اخلاق کی درستگی کا نہیں تھا۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''لوگوں پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ انسان اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا کہ جو چیز اس نے حاصل کی ہے وہ حلال ہے یا حرام؟''

آج موجودہ زمانے میں بالکل یہی حالت ہے۔ لوگوں کو حلال حرام کی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ بس صرف پیسے سے مطلب ہے خواہ وہ کہیں سے بھی حاصل ہو اور کسی بھی طریقے سے حاصل ہو حالانکہ ایک مسلمان اور کافر میں رزق حاصل کرنے کے حوالے سے یہی فرق ہے کہ کافر محض پیسہ کمانے کی مشین ہوتا ہے۔ وہ رزق کے حصول کے لیے حلال حرام میں تمیز نہیں کرتا جبکہ مسلمان کو ایک ایک پیسے کے بارے میں یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ یہ پیسہ حلال طریقے سے آ رہا ہے یا حرام طریقے سے؟

ہمارے کرنے کے کام:

اس لیے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عبادات سے متعلق احکامات جاننے اور ان پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تجارت، پیسے اور ملازمت وغیرہ سے متعلق بھی اسلامی احکامات سے آگاہی حاصل کر کے ان پر عمل کریں !

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''علم کی طلب کرنا یعنی علم حاصل کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے''[1]

اس حدیث کے تحت علماء یہی فرماتے ہیں کہ زندگی کے جس شعبے سے مسلمان وابستہ ہو، اس کی حلال حرام کی صورتیں جاننا اس کے لیے نماز روزے کی ادائیگی کی طرح فرض ہے، اور روز قیامت اس کے متعلق اس باز پرس ہو گی۔

ہمیں چاہیے کہ کسی بھی ذریعہ معاش کو اختیار کرنے سے پہلے اس کی ناجائز صورتیں اہل علم سے معلوم کریں۔ اس کام کے دوران جو نئی نئی صورتیں پیش آتی ہیں ان کو حکم بھی علماء کرام سے معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کرتے رہیں۔ ایسا کرنا ابتداء میں ہمارے لیے باعث مشقت ہو مگر اس طرح کا تجارت و معاملات کے مسائل کا جاننا حدیث کی رو سے ہزاروں رکعت نفل سے بہتر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس طرح مسائل سیکھ کر عمل کرنے سے ہماری تجارت، ملازمت، زراعت و دیگر معاملات بھی عبادت بن جائیں گے اور ان پر ہمیں اجر بھی ملے گا جیسے نماز روزے وغیرہ پر ملتا ہے۔

اس وقت ہمارے مسلمان تاجروں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کی ہدایتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے ایک ایسا عملی نمونہ پیش کریں جو دوسروں کے لیے باعث کشش ہو۔ جو شخص ایسا کریگا تو وہ اس دور کی سب سے بڑی ذمہ داری پوری کریگا، اسی طرح یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر انسان اپنے اعمال کا جوابدہ ہے۔ اس لیے اس شیطانی دھوکے میں نہیں آنا چاہیے کہ جب تک سب لوگ نہ بدلیں میں بھی نہیں بدلوں گا۔ ہمیں اپنے حصے کا کام کرتے ہوئے اپنے طرز عمل کی اصلاح کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب ایک چراغ جلتا ہے تو اس ایک سے دوسرا چراغ جلتا ہے اور جلے گا۔

خلاصہ بحث :

درج بالا باب کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوں وہ اپنے تمام دنیاوی اور ابدی معاملات میں قانون محمدیؐ جو قرآن کے مطابق ہے اس پر عمل کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ}[2]

---

1 سنن ابن ماجہ، المقدمہ، باب: فضل العلماء، حدیث: ۲۲۴

2 سورۃ البقرۃ ۲:۲۰۸

ترجمہ: ” اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

اس لیے کسی بھی مسلمان کے لیے یہ بات درست اور جائز نہیں کہ وہ نماز، روزہ حج جیسی عبادات میں تو قرآن و سنت کی پیروی کریں لیکن دنیاوی اور معاشرتی معاملات میں اور حقوق العباد میں اپنی مرضی کرے اور ان معاملات میں اپنے آپ کو اسلامی اور دینی پابندیوں مبرّا تصور کرے۔ اسلام اس قدر وسیع اور مکمل ہے کہ اس میں ہر طرح کے معاملات مثلاً حقوق اللہ، حقوق العباد معاشرتی اور سماجی مسائل کا مکمل حل موجود ہے اور بہت جامعیت کے ساتھ ان معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے حتیٰ کہ ایک عام مسلمان بھی انہیں سمجھ کر باآسانی ان پر عمل کر سکتا ہے۔

باب چہارم: تجدید دین کے تہذیبی و تمدنی پہلو

فصل اول: معاصر طرز فکر اور اسلامی طرز فکر کا باہم موازنہ

فصل دوم: اسلامی اور غیر اسلامی تمدن میں فرق کی وضاحت

فصل سوم: تہذیب و تمدن کی جدید شکلوں کی اسلامائزیشن

فصل اول: معاصر طرز فکر اور اسلامی طرز فکر کا باہم موازنہ

جس طرح اسلامی طرز فکر کا ایک مخصوص ورلڈ ویو ہے، ان کا ایک خاص عقیدہ اور دین ہے اور اس پر مبنی ایک منفرد تہذیب ہے۔ اسی طرح معاصر طرز فکر کا بھی ایک خاص ورلڈ ویو ہے، ان کی بھی ایک مخصوص فکر ہے اور ان فکری اساسات کی بنیاد پر ان کی بھی ایک منفرد تہذیب ہے۔ ذیل میں معاصر اور اسلامی طرز فکر پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

موجودہ طرز فکر:

جب مسلمانوں کی ترقی کا دور تھا تو مغرب تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یورپ کے شہر گندے اور گلیاں تاریک ہوتی تھی، لوگوں کو غسل تک کرنے کی عادت نہ تھی۔ مسلمانوں سے شکست کھانے اور بیت المقدس اور قسطنطنیہ جیسے اہم مذہبی مقامات سے محروم ہونے کے بعد، ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت، بدلے کی آگ اور غصے کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ اسی جذبے نے ان کے ہاں بیداری کی لہر اٹھائی اور مغرب میں احیائے علوم کی تحریک چلی۔ عیسائی دینی قیادت یا پاپائیت جاگیر داروں اور حکمرانوں کے ساتھ مل کر ایک ظالم اور استبدادی طبقے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور غیر عقلی، غیر فطری اور بگڑی ہوئی دینی تعلیمات کی پشتیبان تھی۔ روشن خیالی، وسعت نظری، سائنسی فکر اور بحیثیت مجموعی تعمیری تبدیلی کی راہ میں مزاحم تھی لہٰذا احیائے علوم کے ساتھ ہی مذہبی اصلاح کی تحریک چلی جس نے اس دینی قیادت کو پہلے تو چیلنج کیا، پھر تقسیم اور کمزور کیا اور دینی نصوص کی عقلی اور عوامی تعبیر کا راستہ کھولا۔ پھر بعد میں چلنے والی فکری تحریکوں یعنی تحریک تنویر تحریک رومانویت اور تحریک جدیدیت نے مغرب میں مذہب کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ ان فکری تحریکوں نے ایک طرف تو مذہب کو فرد کا ذاتی اور نجی مسلہ قرار دے کر اسے اجتماعی زندگی کے وسیع میدان سے دیس نکال دیا تو دوسری طرف فرد کو کلی آزادی اور اختیار دے کر اللہ کے مقابلے میں مختار مطلق بنایا۔ آخرت کے تصور کو بے مقصد و غیر ضروری قرار دینے کے لیے صرف دنیا اور دنیاوی کامیابیوں کو منزل قرار دیا گیا۔ وحی کی بڑائی و برتری کا تو انکار کیا گیا ہے مگر عقل، حس، تجربہ و مشاہدہ کو حق و باطل کے درمیان فرق کا پیمانہ قرار دیا گیا ہے۔ جنسی میل جول، فحاشی و عریانیت، زناکاری کو عام کرنے کے لیے عورت کو آزادی کے سحر انگیز جال میں پھنسا دیا گیا اور اسی طرح خاندانی نظام، گھریلو زندگی اور معاشرہ کی اہمیت کا جنازہ نکال دیا گیا۔ فرائڈ نے جنسی جبلت کو مرکزی حیثیت دے کر اور ہر قیمت پر اس کی تسکین کو ذہنی صحت کے لیے ضروری قرار دے کر مغربی فرد کو جنس زدہ حیوان بنا دیا اور ڈارون نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہ انسان بھی دوسرے جانداروں کی طرح ایک حیوان ہی ہے اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے تصور کو برباد کر دیا۔ معاصر طرز فکر کی سیاسی فکر کے مطابق آزادی کا تقاضا ہے کہ اس کے نمائندے پارلیمنٹ میں جو قانون چاہیں بنائیں یعنی جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں اور جس کو چاہیں حرام کہہ دیں۔ معاصر طرز فکر والے ملکوں کی اسمبلیاں زنا، جوئے، شراب وغیرہ کو حلال قرار دے چکی ہیں۔ اسی طرح ان کے معاشی مفکرین کے مطابق جب دنیا کی

زندگی ہی سب کچھ ہے تو یہاں ہر قیمت پر خوشحالی آنی چاہیے اور پیسہ وافر ہونا چاہیے تاکہ آسائشوں اور نعمتوں کا سامان کیا جاسکے۔ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے سود، سٹہ اور ہر قسم کے ذرائع اختیار کرنے کا مسلک اپنایا گیا۔ گویا معاصر طرز فکر و تہذیب کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔انسان کو خدا اور مختار مطلق بنا دینا (یعنی اصل خدا کی چھٹی)

۲۔دنیا ہی سب کچھ سمجھنا (یعنی آخرت کی نفی)

۳۔تجربے اور مشاہدے کو معیار حق سمجھنا (یعنی وحی اور رسالت کا خاتمہ)

انہی فکری اساسات کی بنیاد پر مغربی علوم پروان چڑھے ہیں، سائنس و ٹیکنالوجی کو ترقی ہوئی ہے، انفرادی اور اجتماعی رویوں کی تشکیل ہوئی ہے اور وہاں ایک مخصوص تہذیب و ثقافت نے جنم لیا ہے[1]۔

اسلامی طرز فکر:

تمام دنیا کے مسلمان جو اللہ کی وحدانیت اور ختم نبوتؐ پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اسلامی فکر و سوچ کے حامل اپنے مخصوص عقائد اور اپنے منفرد انداز فکر کی وجہ سے دنیا میں ایک جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں جو انہیں پوری دنیا میں منفرد اور امتیازی نظریہ حیات عطا کرتا ہے انہیں مخصوص فکری خیالات اور عقائد کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے اور انہیں ایک الگ پہچان دیتا ہے۔ مسلمانوں کا طرز فکر ان کی تہذیب و ثقافت، رنگ و نسل کا امتیاز صرف اور صرف تقوی کی بنیاد پر ایک ایسی عظیم الشان عمارت وجود میں آتی ہے جو اس دنیا میں بسنے والے دوسرے اقوام اور ادیان سے الگ اپنا ایک منفرد مقام اور مخصوص پہچان رکھتے ہیں جس کے باعث مسلمان دنیا کے کسی بھی کونے یا خطے میں ہوں کسی دوسرے ایسے معاشرے میں نہ تو ضم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ایسے ملک میں رہ سکتے ہیں جن کا مذہب اور ان کے رسم و رواج اور فکری نظریات و عقائد اسلام کے منافی ہوں۔

آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے جب آپؐ نے کفار مکہ کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچایا تو انہوں نے آپؐ کی اس دعوت حق کو درخور اعتنانہ سمجھا بلکہ آپؐ کو اسلام کی اشاعت سے روکنے کے لیے مکہ کے جاہل اور فرسودہ نظام زندگی کی سرداری کی پیشکش کی جسے ٹھکراتے ہوئے حضرت محمدؐ نے اپنی تبلیغ جاری رکھی اور ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اسی حقیقت کا برصغیر پاک و ہند میں دو قومی نظریہ کی تحریک کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اس دو قومی نظریے کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ برصغیر کے رہنے والے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ اسلامی ملک کا مطالبہ کیا اور اکتالیس سال کی بھرپور جدوجہد کے بعد مسلمانان برصغیر کو انگریزوں کے تسلط سے آزادی حاصل ہوئی اور وہ علاقے جہاں پر مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی وہاں پاکستان کے نام سے ایک مسلم ریاست وجود میں آئی۔ اس تحریک کے

---

1 محمد امین 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش،، بیت الحکمت لاہور' اشاعت ۲۰۰۶، ص ۱۹۔ ۲۰

رہنا قائد اعظم محمد علی جناح نے بار کہا تھا کہ پاکستان کی بنیاد اسی دن رکھی گئی تھی جس دن پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ دو قومی نظریہ حقیقت میں نظریہ اسلام ہی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی عقیدے یعنی اسلام کی بنیاد پر ایک قوم ہیں اور ان کا نظریہ قومیت جبکہ کبھی کسی علاقے، کسی زبان، رنگت اور نسل کی بنیاد پر قوموں کی ترکیب کرتا ہے، جس کا اطلاق مسلمانوں پر نہیں ہوتا کیونکہ مسلمان رنگ و نسل، زبان اور تہذیب و ثقافت کی وجہ سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے جہاں بھی غیر مسلموں نے اسلامی ممالک پر قبضہ کیا وہاں ان کو شدید قسم کی جوابی کاروائیوں کا سامنا کرنا پڑا اور مسلمانوں نے اپنے بنیادی مذہبی نظریات کی حفاظت کی اور ان کی قیادت دینی اور اسلامی قوتوں نے کی اور اگر دینی قیادت سامنے نہیں آئی لیکن دوسرے رہنماؤں نے اپنی اس جدوجہد کی بنیاد اسلام پر ہی رکھی کیونکہ مسلمان اسلامی عقائد کی بنیاد پر اور مخصوص تہذیب کے خواہش مند ہونے کے ساتھ ساتھ کسی غیر مسلم حکومت میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتے جو ایک اسلامی معاشرے میں ممکن ہے۔

یہ وجہ ہے مسلمان علماء نے اشد مجبوری یا کوئی اسلامی اور دینی وجہ کے بغیر اسلامی ملک اور معاشرے کو چھوڑ کر غیر مسلموں اور پر دیس میں جا کر رہنے کو منع کیا ہے، ایسا نہ ہو کہ جب وہ ایک غیر مسلم معاشرے میں رہنے لگے تو ان کو وجود، ان کی پہچان اور ان کا دین خطرے میں پڑ جائے اور وہ غیر مسلم معاشرے میں اپنے عقائد و نظریات کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے عقیدے، اپنے دین اپنے نظریات اپنی عبادات کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک خاص اور منفرد مقام رکھتے ہیں اور رہتی دنیا تک مسلمان ہمیشہ قائم رہنے والی قوم ہے۔[1]

یہ بات بھی واضح ہے کہ مسلمانوں کا دین انہیں دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کا مقصود آخرت میں اللہ کی خوشنودی ہے۔ انسان اللہ کا عبد یعنی بندہ اور غلام ہے اور اسکی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اپنی ساری زندگی اللہ کے بتائے ہوئے احکامات پر گزارے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوگا اور اگر دنیا کی زندگی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی میں گزارے گا تو اس کی ناراضی مول لے گا اور سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ آپ ؐ کی جب رحلت ہوئی تو پورا عرب مسلمان ہو چکا تھا۔ خلفائے راشدین کے دور میں مسلمانوں نے اس وقت کی دو سپر پاور کو شکست دی اور اسلامی تعلیمات کو پھیلایا اور جب تک مسلمان مجموعی طور پر اسلام پر عمل کرتا رہا تو وہ دنیا پر چھایا رہا اس وقت کے مسلمانوں نے دنیا کے تمام شعبوں جن میں درس و تدریس، نئی نئی ایجادات کرنا، متمدن معاشرے کی تشکیل، طب، سائنس و ٹیکنالوجی، سود سے پاک معیشت کا تصور، خاندانی و عائلی نظام زندگی، آلات حرب غرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں دنیا کو رہنما اصول دیے اور دنیا پر چھائے رہے لیکن جیسے جیسے اسلامی اصولوں، تعلیمات اور تقاضوں پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو وہی مسلمان جس

---

[1] اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش، ص: ۱۴۔۱۵،

کے رعب و دبدبے سے بڑی بڑی سلطنتیں کانپا کرتی تھی، انہی کے آگے مسلمان زیر نگوں ہو گیا اور ان کی شکست کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مسلمانوں کا دین اور دین کے بنیادی مآخذان کے پاس محفوظ ہیں۔ ماضی کے علوم ان کے پاس محفوظ ہیں، اسلام کا سوانحی ریکارڈ محفوظ ہے، ان کے پاس امت کا تعامل بھی محفوظ ہے کہ مسلمان معاشرہ بڑی حد تک بلاانقطاع ان روایات واقدار کا تسلسل مہیا کرتا ہے لہٰذا مسلمان دوبارہ اٹھ سکتے ہیں وہ دوبارہ کامیاب ہو کر عظمت رفتہ حاصل کر سکتے ہیں۔ توانائی کا سرچشمہ ان کے داخلی ڈھانچے کے اندر موجود ہے لہٰذا ان کی نشاۃ ثانیہ بالکل ممکن ہے شرط بس یہ ہے کہ وہ اپنے نظریے، اپنی تہذیب سے پورے جذبے کے ساتھ جڑ جائے۔[1]

معاصر طرز فکر اور اسلامی طرز فکر کا باہم موازنہ

معاصر طرز فکر اور اسلامی طرز فکر کی مذکورہ بالا اساسات کا ایک مختصر سا مقارنہ درج ذیل ہے:

اسلامی طرز فکر:

1. انسان اللہ کا نمائندہ ہے اور اس کے مالک کا اس پر حق ہے کہ وہ اپنے مالک کی رضا کیلئے اسی کی عبادت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے۔
2. ہر قیمت ہر اخروی کامیابی کے لیے کوشش کرنی ہے اور آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دینی ہے۔
3. دنیا کی محبت گناہوں کی جڑ ہے۔
4. عفت و عصمت، حیا، نکاح اور خاندان کے اداروں کی حمایت کرنی ہے۔
5. عورت اور مرد کا الگ دائرہ کار نیز متقی اور فاجر میں فرق کرنا ہے۔
6. یہ اختیار صرف اللہ اور نبی ؐ کا ہے تاہم اسی کے قانون کے تحت قانون سازی کرنی ہے۔
7. رزق حلال، سادگی، قناعت، انفاق اور صلہ رحمی اختیار کرنی ہے۔
8. دنیا و آخرت دونوں میں ترقی و کامیابی کے لیے کوشش کرنی ہے۔
9. آخرت کی ترقی و کامیابی کو دنیاوی ترقی و کامیابی پر ترجیح دینی ہے۔
10. دنیاوی ترقی و کامیابی اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرتے ہوئے حاصل کرنی چاہیے۔

مغربی طرز فکر:

1. انسان اپنا خدا خود ہے اور جو فیصلے چاہے کر سکتا ہے۔

[1] اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش، ص ۱۶۔۱۷

2. دنیاوی ترقی کو ہی اصل کامیابی سمجھنا۔
3. مادہ پرستی اور دنیا سے محبت ترقی کی معراج ہے۔
4. عورت کی مادر پدر آزادی اور خاندان کا خاتمہ کرنا ہے۔
5. مساوات یعنی عورت و مرد ہر لحاظ سے برابر اور ہر فرد کی رائے برابر ہے۔
6. فرد اور اس کے نمائندوں یعنی ارکان پارلیمنٹ کو حلال و حرام کے تعین کا لا محدود حق ہے۔
7. ہر قیمت پر سرمائے کی بڑھوتری خواہ سود، سٹہ کے ذریعے ہو۔
8. صرف دنیاوی ترقی و کامیابی کے لیے کوشش کرنی ہے۔
9. دنیاوی ترقی کو آخرت کی ترقی و کامیابی پر ترجیح دینی ہے۔
10. دنیاوی ترقی و کامیابی اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کرتے ہوئے حاصل کرنی ہے۔[1]

خلاصہ یہ کہ اسلامی طرز فکر اور معاصر طرز فکر کا ورلڈ ویو اور تصور دین ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

اسلامی طرز فکر کے میں دین سے مراد یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہر معاملے میں مثلاً عبادات، اخلاق اور دنیا کے سارے معاملات میں غالب ہو گا۔ معاصر طرز فکر میں دین ہے ہی نہیں، ان کے ہاں صرف مذہب ہے اور جدید مغربی افکار نے اسے بھی کونے میں لگا دیا ہے، چنانچہ عیسائیت مغرب میں برائے نام رہ گئی ہے اور سیکولرزم، ہیومنزم، لبرلزم وغیرہ سے شکست کھا چکی ہے۔ اب عیسائیت کا مطلب ہے کبھی کبھار چرچ چلے جانا اور وہاں دیائیہ کلمات گا کر واپس آجانا۔ عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

معاصر طرز فکر کا اصل دین یعنی جس کے مطابق وہاں کے لوگ زندگی گزارتے ہیں، جن اصولوں کو مانتے ہیں جن پر روزمرہ زندگی میں عمل کرتے ہیں، وہ ہیں ہیومنزم، لبرلزم، سیکولرزم وغیرہ اور ان کی بنیاد پر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا ہے، یہی ان کا دین ہیں لیکن ان پر دین یا مذہب کی اصطلاح کا اطلاق دو وجوہ سے نہیں کرتے۔ ایک یہ کہ انہیں مذہب کے لفظ سے چڑ ہے اور جو مذہب ان کی اجتماعی زندگی میں دخل دے وہ اسے صدیوں پہلے سے رد کر چکے ہیں اور اس کا نام سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ دوسرے مذہب عام طور پر ان عقائد و نظریات کو کہا جاتا ہے جو منزل من السماء ہوں اور کسی بالاتر ہستی (اللہ) کی طرف سے آئیں جہاں تک انسان کے اپنے سوچے اور تشکیل دیے گئے نظریات کا تعلق ہے، خواہ ساری دنیا انہیں مقدس سمجھے اور ان پر عمل کرے، انہیں بہر حال مذہب نہیں کہا جا سکتا۔ جن معنوں میں ہم مسلمان، دین، کا لفظ استعمال کرتے ہیں (یعنی محض عبادات نہیں بلکہ نظام زندگی بھی) تو ان معنوں میں مغرب کا دین ہے ان کا ورلڈ ویو یعنی سیکولرزم، ہیومنزم وغیرہ سے مراد

---

[1] اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش، ص ۲۰۔۲۱

ہے، کہ خدا، رسول اور روز آخرت کی نفی اور ان کی بنیاد پر جو تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی اور قانون ڈھانچہ بنتا ہے اس کا مطلب ہے اسلامی افکار و اقدار کا خاتمہ کرنا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اسلامی اور مغربی تہذیب کی فکری اور عملی اساسات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں [1]۔

یونانی فلسفہ کے بعد حالات نے ایک نئی کروٹ لی اور سترھویں صدی عیسوی میں فلسفہ مغرب نے جو جنم لیا تھا پھیلنا شروع ہوا۔ سترھویں صدی کا فلسفہ یونانی فلسفے سے قدرے مختلف تھا اس کے نتیجے میں یورپ نے مادی ترقی کے نئے مظاہر و مناظر پیش کیے مغرب نے فلسفہ جدید اور سائنس میں قدم رکھا اگرچہ یہ دونوں چیزیں فلسفہ یونان ہی سے لی گئی تھی مگر انہوں نے اس یونانی فلسفہ میں کچھ اضافے کر لیے اور فلسفہ جدید پیش کیا۔ جس کے نتیجے میں ایک علمیت وجود میں آئی اور قدیم سائنس کی جگہ سوشل سائنس نے لے لی۔ یہی دو چیزیں مغرب کی ترقی کا باعث بنیں۔ پھر مغربی ترقی اور سائنسی انکشافات کا طلسم تمام دنیا پر تو چلتا ہی تھا مگر عالم اسلام کے خطے بھی اس کے گھیرے میں آ گئے۔ وہ بھی غیر محفوظ رہیں مسلمانوں میں جدیدیت پسند طبقہ دوبارہ پیدا ہونا شروع ہو گیا اکبر بادشاہ نے تو دین اکبری کی بنیاد رکھ لی یہ بھی جدت پسندی کی ایک شکل تھی [2]۔

امام غزالی کے نفیس کام کے نتیجے میں یونانی فلسفے کی علمی روایت نے دم توڑ دیا تو ساتھ ہی تمام جدت پسندوں اور عقل کے پجاریوں کے دلائل کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اٹھارھویں صدی عیسوی تک عالم اسلام میں جدیدیت کی لہر سر نہ اٹھا سکی ہر طرف اسلام کا غلبہ و دور دورہ تھا مسلمان علمیت میں بہت مضبوط رہے تمام فلسفی مل کر بھی امام غزالی کے اعتراضات کے من حیث الکل توڑنے سے قاصر تھے اور بالآخر یونانی فلسفے کا جنازہ نکل گیا۔

اسلامی طرز فکر کے بارے میں غلط نظریات

پہلا نظریہ:

زمانہ قدیم سے ہی تقریباً ہر قوم میں اپنی تہذیبی برتری کا زعم رہا ہے کسی میں کم تو کسی میں زیادہ اور کسی میں بہت زیادہ غرضیکہ دو متضاد تہذیبیں اپنا الگ الگ اثر رکھتی ہیں۔ اسلامی طرز فکر و اسلامی تہذیب ایک مستقل تہذیب ہے جس کے بنیادی عقائد و مسائل وحی الٰہی سے لوگوں کو سکھائے گئے ہیں اور اس کے علاوہ باقی اکثر تہذیبوں میں مختلف تہذیبوں سے روشنی لے کر اس کا ڈھانچہ تعمیر کیا گیا ہے۔

---

[1] اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش، ص ۲۲

2 تعارف تہذیب مغرب اور فلسفہ جدید۔ پروفیسر مفتی محمد احمد، صفحہ ۲۳۰، طبع الثانی جنوری ۲۰۱۴

اسلامی تہذیب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس طرح دوسری قدیم تہذیبیں خاص اثر کی وجہ سے وجود پذیر ہوئی ہیں اسی طرح اسلامی تہذیب نے بھی کئی دوسری مہذب تہذیبوں سے روشنی حاصل کر کے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر غلام جیلانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اسلام جہاں بھی پہنچا اس نے وہاں کی تہذیب سے کچھ نہ کچھ لے لیا آتش پرست کی مقدس آگ چراغ مسجد بن گئی اور ان کے کلس ہمارے مینار بن گئے یوں رفتہ رفتہ ایک ایسی حسین عظیم اور طاقت ور تہذیب وجود میں آگئی جس نے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہماری تہذیب کا اثر ورسوخ تمام ممالک کے فنون، لباس، تعمیرات وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔''[1]

اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی سوچ کسی غیر فکر و فلسفہ سے اخذ کردہ ہر گز نہیں ہے بلکہ یہ وحی الٰہی سے ماخوذ ہے اسی سے اس تہذیب نے رہنمائی پائی ہے اس تہذیب کے ظاہری برگ و بار بدائع وضائع دیکھ کر دوسروں کے مشابہ قرار دینا سراسر غلطی ہے۔

دوسرا نظریہ:

اسلامی طرز فکر کے بارے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اسلامی طرز فکر اور معاصر طرز فکر میں کوئی فرق نہیں ہے یہ دونوں ایک عالمگیر وجود رکھنے کی حامل ہیں کیونکہ دونوں میں سے ایک کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے تو دوسری کی بنیاد شعور انسانی پر ہے وحی الٰہی اور شعور انسانی اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے دونوں کی کوشش معاشرے کی اصلاح ہے لہٰذا ان میں کوئی مغایرت نہیں ہے افہام و تفہیم سے آپس کی کشیدگی دور ہو سکتی ہے اور بعض حضرات کا تو یہ نظریہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی شکل جدید کا نام ہی معاصری تہذیب ہے۔اس حوالے سے افضال ریحان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"عصر حاضر کی دنیا پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دو اعلیٰ ترین شاندار تہذیبیں اسلامک سولائزیشن اور ویسٹن سولائزیشن باہم مقابل آتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اگرچہ دونوں کی اپنی اپنی خصوصیات اور اپنا اپنا پس منظر ہے جس کی بناء پر کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں جن میں ٹکراو ناگزیر ہے لیکن ان پر جوش نعروں کے باوجود ہمارا مشاہدہ ہنوز دونوں کی قریب آتے بلکہ ایک یونیورسل کلچر کا حصہ بنتے دیکھ رہا ہے کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے تو دوسری کی شعور انسانی پر۔ وحی اور شعور انسانی چونکہ دونوں انسان کے لیے ایک ہی منبع حقیقی یعنی پروردگار کی طرف سے ودیعت کردہ تحفہ ہیں اس لیے ان میں مغایرت نہیں ہو سکتی گو مفادات کے کچھ بیوپاری مشرق و مغرب میں اسی کے لیے کوشاں ہیں لیکن

---

[1] ہماری عظیم تہذیب، ڈاکٹر غلام جیلانی، صفحہ ۲۳

عالمگیر انسانی فطرت پر نگاہ رکھنے والے صاحبان بصیرت دونوں کو حریف کی بجائے حلیف کی صورت اختیار کرتے دیکھ رہے ہیں" [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فکروں کو حریف نہیں بلکہ حلیف گردانتے ہیں حالانکہ خود وضاحت کر رہے ہیں کہ اسلامی فکر کی بنیاد وحی پر ہے اور مغربی فکر و فلسفہ کی بنیاد عقل انسانی، شعور انسانی پر ہے۔ شعور انسانی اور وحی الٰہی کو ایک ہی طرح کی حیثیت دے رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وحی الٰہی میں خطا کا امکان نہیں ہے اور شعور انسانی میں خطا نہ ہو بالکل حقیقت تک رسائی میں کامیابی ہو جائے اس کا امکان بہت کم ہے اگر وحی الٰہی کو نظر انداز کر کے شعور انسانی کو ہی رشد و ہدایت کا ماخذ تسلیم کر لیا جائے تو کئی اعتراضات اٹھیں گے۔

1. شعور انسانی رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو جانے کے بعد وحی الٰہی کی ضرورت نہ تھی اور وحی کا نازل کرنا ایک عبث کام قرار پائے گا۔ اس لیے کہ مقصد تک تو رسائی شعور انسانی سے کی جا سکتی تھی۔ پھر وحی کی کیا ضرورت تھی۔
2. بہت سارے عقل و شعور کے شہسوار فلسفیانہ بحثوں میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں آج تک عقلی طور پر یہ بیان نہیں کر سکے کہ انسان دنیا میں کیونکر آگیا اور مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ جب عقل و شعور کے مدعی اپنے ماضی اور مستقبل سے بے خبر ہیں تو ان کے ظنیات و قیاسات حال کی زندگی میں بھی قابل قبول نہیں ہونے چاہیے۔ الغرض وحی الٰہی کے بغیر رہنمائی ناممکن ہے [2]۔

دونوں نظریوں میں امر مشترک:

ان دونوں نظریوں میں اگرچہ بہت فرق ہے لیکن اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں وہ امر مشترک یہ ہے کہ اسلامی تہذیب باقی تہذیبوں سے ایک جداگانہ تصور نہیں ہے بلکہ انہی تہذیبوں سے ماخوذ ایک شکل ہے یا پھر ان ہی کی ارتقائی شکل وجود میں آکر ایک تہذیب عالمی ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے۔

پہلا نظریہ جو اسلامی تہذیب کے بارے میں پیش کیا جا چکا ہے، اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسلامی تہذیب جب باقی تہذیبوں سے ہی کچھ نہ کچھ لے کر تعمیر کی گئی ہے تو ان باقی تہذیبوں میں اور اسلامی تہذیب میں فرق نہ ہونا چاہیے۔

دوسرا نظریہ جو اسلامی تہذیب کے بارے میں پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کی شکل جدید مغربی فکر و فلسفہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے عقل و شعور سے یہ تیار شدہ تہذیب اسلامی تہذیب کے مقابل نہ ہونی چاہیے کیونکہ ان دونوں کا ماخذ و منبع ایک ہی رب کی طرف سے عطا کردہ ہے۔

---

[1] اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب، افضال ریحان، صفحہ ۲۱۔

[2] تعارف تہذیب مغرب اور فلسفہ جدید، صفحات ۲۳۵۔۲۳۷

دونوں نظریوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ اسلامی تہذیب ان کے مقابل اور حریف نہیں ہے بلکہ دونوں تہذیبوں کی حلیف ہے[1]۔

تیسرا نظریہ:

اسلامی طرز فکر کے بارے میں تیسرا نظریہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اسلامی فکر و فلسفہ، اسلامی نظریہ حیات، اسلامی طرز زندگی ایک نیا جداگانہ تصور ہے جو نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے جس تہذیب کا منبع و علمیت وحی سے ماخوذ ہے اور اس کا بہترین اور آئیڈیل دور نبوت ہے پھر وہ دور جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے غرض تمام گذشتہ و پیوستہ تہذیبوں سے الگ ایک تصور حیات ہے مغربی تہذیب کے اصول و مبادی اس سے یکسر مختلف ہیں ان دونوں میں ہم آہنگی ناممکن ہے۔ یہی نظریہ صحیح اور قرین قیاس ہے[2]۔

معاصر طرز فکر کی گمراہیاں:

1. معاصر طرز فکر نے محض اخلاقیات کو دین کا لازمی جز قرار دیا ہے باقی عقائد اور عبادات کو مکمل طور پر ترک کر دیا ہے۔
2. عبادات کو صرف ایک رسم سمجھ کر ادا کرنا اور ایک عبادت کو ایک رسم حیثیت دے کر اس کو رد یا قبول کرنا۔
3. عبادات کو دین سے الگ کر کے محض اخلاقیات کو ہی دین سمجھنا۔
4. مذہب کو صرف ایک معاشرتی ادارہ سمجھنا مذہب کو معاشرے کی تنظیم کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھنا۔
5. قدیم زمانہ کے لوگ عقائد اور مذہب کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اسی وجہ سے موجودہ طرز فکر ان کو ناپختہ ذہن سے تشبیہ دے رہے ہیں۔
6. خدا اور اس کا تصور بھی وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اس لیے کہ مذہب انسان کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔
7. حقیقی اور بالکل صحیح عقائد اور پھر غیر حقیقی اور باطل خیالات کو بھی آزاد خیالی کی وجہ سے ایک جیسی اہمیت دینا۔
8. اللہ کی طرف سے عطا کردہ معجزات و کرامات کو محض عقل کی بناپر رد کر دینا۔
9. دین کو انسانی اختراع سمجھنا اور اسے محض انسانی نکتہ نظر سے دیکھنا۔ جو امر انسانی ذہن سے بالاتر ہو اسے بھی انسانی ذہن کے مطابق بنانے یا سمجھنے کی کوشش کرنا۔
10. سائنس کو ہی اخری معیار مان کر دین کو سائنس کے تابع سمجھنا۔
11. احکام فقہ کو انسانی قوانین کی طرح سمجھنا۔

---

[1] تعارف تہذیب مغرب و فلسفہ جدید، ص ۲۳۸

[2] تعارف تہذیب مغرب و فلسفہ جدید، ص ۲۳۸

12. یہ دعویٰ کرنا کہ دین سیدھی سادی چیز ہے اور علماء امت نے اسے پیچیدہ بنا دیا ہے دین میں سادگی پیدا کرنے کا دعویٰ۔

13. علم کو صرف معلومات اور ایجادات کا ذریعہ ماننا بذات خود علم کی اصلیت، خالص پن اور اہمیت نہ ماننا۔

14. دین کی تشریح و تفسیر کے لیے محض اپنی رائے کو حرف آخر سمجھنا۔

15. ان دنوں عام فلسفہ یہ ہے کہ دین کو دنیا کے تابع کر لیا جائے یا پھر دین و دنیا مکمل طور پر الگ الگ سمجھے جائیں۔

16. سائنسی اصول کو مقدس کتابوں میں ڈھونڈنا۔

17. کسی نہ کسی نظریہ کائنات کو لازمی طور پر دین کا جزء شمار کرنا اور اس حیثیت کو نظر انداز کرنا کہ کسی بھی دین میں کائنات کے نظام کا تصور ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل اللہ کی بڑائی بیان کرنا مقصود ہے۔

18. ہر فرد کو دین کے معاملے میں رائے دینے کا حقدار سمجھنا اور انفرادیت پرستی کو ہوا دینا۔

19. دینی علوم کے بڑے بڑے اماموں کو محض افراد سمجھنا اور انہیں صرف اتنی اہمیت دینا جتنی کہ عام فرد کو دی جاتی ہے

20. ہر معاملے میں تحریری ثبوت تلاش کرنے کی فکر کرنا۔

21. علماء پر آزادی فکر چھیننے کا اور دوسری طرف مذہبی جمود کا الزام لگانا۔

22. صحت مند جانور کو انسانی زندگی کا معیار بنانا۔

23. جدیدیت الفاظ کے جادو سے کام لیتی ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کر کے سوچنے کی طاقت سے معطل کر دیتی ہے۔ کسی چیز کی تحسین کے لیے اسے جدید یا سائنٹفک کہہ دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔

24. انسان کی دنیاوی ترقی کو ہر چیز کا معیار بنانا۔

25. مذہب کے خلاف کام اس کی مخالفت کر کے کرنے کا رواج ختم ہو چکا ہے آج کل مذہب کی مخالفت اور مذہب کو نقصان پہنچانے کا طریقہ کار یہ ہے کہ اس میں ردوبدل کر کے لوگوں کو غلط تشریح سمجھائی جاتی ہے یعنی اصطلاح مذہبی رہے، مگر اس سے مراد لیا جانے والا معنی ملحدانہ ہو۔

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدن کا سکہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرز فکر اگر

پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے ، ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں. مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض اُن قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقتِ نظر سے لیا جائے ، جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف صف آراء ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

فصل دوم: اسلامی اور غیر اسلامی تمدن میں فرق

اسلامی تہذیب تصورات، اقدار، تفاعل اور وجود کی مالک ہونے کی وجہ سے تہذیبوں سے گفتگو کو قبول کرتی ہے اور ان سے ٹھوس حقائق اور پیمانوں کے ذریعہ بات کرتی ہے اور حق کے اعتراف تک پہنچانے کے لیے اچھے انداز میں بحث کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔

تمام تہذیبیں اور تمدن انسان کے زبان و مکان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں لیکن اسلامی تمدن کا معاملہ مختلف ہے وہ ان مشکلات و مسائل کے تئیں کوئی الجھن محسوس نہیں کرتی بلکہ بہت زیادہ لچکدار ہونے کے سبب سے ان تمام مسائل کا احاطہ کرتی ہے کیونکہ یہ اس انسان اول کی تمدن ہے جس کے اندر اسی وقت ادراک کی صلاحیت آگئی تھی جب اس کے اندر روح ڈالی گئی تھی، اسے اسماء کی تعلیم دی گئی تھی اور تمیز و انتخاب، ضبط و نظم اور مشاہدہ و تجربہ کی صلاحیتوں کا اس کے اندر الہام کیا گیا تھا گویا یہ تمام انبیاء اور تمام اقوام کے اندر مبعوث پیغمبروں کی تہذیب و تمدن ہے اور اسلام پر ایمان لانے والوں کی تہذیب ہے جسے محمدؐ لے کر تشریف لائے ہیں اس وجہ سے یہ وہ انسانی عالمی تہذیب ہے جو حدود نا آشنا ہے اور نسل و قوم کے درمیان امتیاز اور فضیلت تسلیم نہیں کرتی انسانوں میں ایک ہی وجہ امتیاز جو پسندیدہ ہے وہ ایمان واستقامت کی بنیاد پر قائم ہے۔

{قُوْلُوْآ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ االنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ}[1]

ترجمہ: ”کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور جو ابراھیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم کسی ایک میں ان میں سے فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں، اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ اچھا ہو سکتا ہے اور ہم تو اسی کی بندگی کرتے ہیں۔“

اسلام ہی عالمی تہذیب ہے جو دوسری تہذیبوں سے گفتگو کے میدان میں اپنے مکمل فکر کے ساتھ داخل ہوتی ہے اور وجود کے تمام ظواہر کی مخالفت کرتی ہے تاکہ آخر میں اس امر کا اثبات ہو جائے کہ کائنات انسان اور حیات سے متعلق اس کے تصورات اور مختلف طریقوں کے سلسلے میں اس کے خیالات ہی تنہا اور متوازن تصورات میں جو ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے موزوں ہیں اور انہی کے ذریعہ وہ انسانیت کی خوشحالی امن، عدل، سعادت اور کفایت کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔

---

[1] سورۃ البقرہ ۲ : ۱۳۶۔۱۳۸

اس وجہ سے تہذیب اسلامی کے مفاہیم و تصورات ہی دوسرے مفاہیم کے مقابلہ میں برحق ہیں اور مفاہیم کی بنیادوں اور اصولوں میں ان کے علاوہ جو کچھ ہے سب باطل ہے۔ اسلامی تہذیب ہی واحد عالمی تہذیب ہے جو کسی بھی غیر مسلم سے تہذیب کی تشکیل کی صلاحیت ساقط نہیں کرتی اس وجہ سے اسلامی تہذیب اپنی گفتگو میں غیر مسلموں کی تہذیب کا اعتراف کرتی ہے البتہ اس تہذیب کے بارے میں اس کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنے بہت سے گوشوں میں انسانی ضروریات اور امنگوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

1۔اسلامی تہذیب:

اسلامی تہذیب بھی انسانی معاشرے کا ایک اہم جز ہے۔اس سے پہلے بھی بہت سی تہذیبیں وجود میں آئی اور اس کے بعد بھی تا قیامت ابھرتی رہے گی۔اسلامی تہذیب کے ابھرنے، چمکنے اور عالم پر چھا جانے کے متعدد محرکات تھے اور اس کے گمنام و بے نشان ہونے کے بھی مختلف اسباب ہیں، جن کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے، میرے اس مقالے میں تحریر کرنے کا مقصد تو صرف انسانی ارتقاء کی تاریخ میں اسلامی تہذیب کے عظیم الشان کردار اور دنیا کے مختلف اقوام پر علوم وفنون، عقائد، اخلاقیات، فلسفہ وحکمت اور ادب کے باب میں اس کے ناقابلِ فراموش احسانات کو ذکر کرنا ہے۔

اسلامی تہذیب کے خصوصیات:

یوں تو اسلامی تہذیب میں ہزارہا خوبیاں اور خصوصیات ہیں مگر ہم صرف اس کی اہم، مرکزی اور بنیادی خصوصیات بیان کریں گے اور اسی سے تہذیبِ اسلامی کی تمام اگلی و پچھلی تہذیبوں پر برتری و بہتری عالم آشکارا ہو جائے گی۔

پہلی خصوصیت:

اسلامی تہذیب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس کامل وحدانیت پر ہے، یہی ایک ایسی تہذیب ہے، جو یہ تصور پیش کرتی ہے کہ کائنات کی ایک ایک شئ صرف اور صرف ایک ذات کی خلق کردہ ہے، اسی کے لیے عبادت اور پرستش ہے اور اسی سے اپنی حاجات وضروریات بیان کرنا چاہیے، وہی عزت عطا کرتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں کسی کو بھی ذلیل وخوار کردینا ہے، وہی دیتا ہے اور وہی محروم بھی رکھتا ہے اور زمین کی بے کراں وسعتوں اور آسمان کی بے پایاں بلندیوں پر جو کچھ ہے سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

عقیدے کے حوالے سے فکر کی اس بلند آہنگی کا طبقۂ انسانیت کو اونچا اٹھانے، عوام کو بادشاہوں، سربراہانِ مملکت، شہ زوروں اور مذہب کے اجارہ داروں کے جور و قہر سے نجات دلوانے، حاکم ومحکوم کے درمیان صدیوں سے پائی جانے والی خلا کو پاٹنے اور انسانی ذہنوں کو ایک مالک حقیقی، کائنات کے خالق اور عالمین کے حقیقی رب کی طرف پھیرنے میں زبردست اثر رہا، نیز اسی عقیدے کی وجہ سے اسلامی تہذیب گزشتہ تمام تہذیبوں میں نمایاں رہی اور آئندہ بھی اس کی انفرادیت باقی رہے گی کیونکہ اس کے عقیدے میں معاشرتِ انسانی کے ہر شعبے میں بت پرستی، اس کے آداب اور اس کی پیچیدہ روایات کی ادنی جھلک

بھی نہیں پائی جاتی۔اسلام ہی یکہ وتنہا ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی اور اس کے تمام تر مظاہر کے خلاف کھلے بندوں جنگ چھیڑی اور بت پرستی کی ہر جھلک اور اس کے باقیات پر خط نسخ پھیر ڈالا، مثلاً: انبیاء، اولیاء، اصحابِ علم وفضل اور فاتحین کی تصویریں بطور یادگار رکھنے کو منع کیا، واضح رہے کہ یہ رسم قدیم وجدید ہر دو تہذیب میں رواجِ عام رکھتا ہے؛ اس لیے کہ ان تہذیبوں میں خدائے واحد کے حوالے سے وہ تصور مفقود ہے جو اسلامی تہذیب نے پیش کیا ہے۔

پھر اسی عقیدۂ وحدانیت کے زیر اثر وہ تمام قواعد وضوابطِ حیات وجود پزیر ہوئے جن پر اسلامی تہذیب مشتمل ہے؛ چنانچہ اس کے پیغام اس کے قوانینِ تشریعی، اس کے مقاصد واہداف، اس کے ذرائعِ معیشت اور طرز ہائے فکر، ہر ایک میں وحدت کا رنگ غالب ہے۔

دوسری خصوصیت:

اسلامی تہذیب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اہداف اور پیغامات تمام آفاقی ہیں۔اللہ فرماتا ہے

{ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاكُمْ}[1]

قرآن کریم نے تمام عالم کے انسانوں کو حق، بھلائی اور خلقی شرافت وکرامت کی بنیاد پر ایک کنبہ قرار دیا، پھر اس نے اپنی لائی ہوئی تہذیب کو ایک قلادے کے درجہ میں رکھا، جس میں ان تمام قبائل واقوام کے عمدہ گراں مایہ جواہر کو پرودیا جنھوں نے مذہب اسلام قبول کیا، پھر اس کی اشاعت وترویج میں کوشاں رہے، یہی وجہ ہے کہ دیگر تمام تہذیبیں کسی ایک نسل اور قوم کے مردانِ کار پر ناز کرتی ہیں، مگر تہذیبِ اسلامی میں وہ تمام افراد مایۂ افتخار ہیں، جنھوں نے اس کے قصر عظمت کو بلند کیا؛ چنانچہ ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، واحمدؒ، خلیلؒ وسیبویہؒ، کندیؒ وغزالیؒ اور فارابی وابن رشدؒ (جن کی نسلیں بھی مختلف تھیں اور جائے سکونت بھی الگ) کے ذریعہ اسلامی تہذیب نے پورے عالم کو انسانی فکر سلیم کے عمدہ نتائج سے ہم کنار کیا۔

تیسری خصوصیت:

اسلامی تہذیب کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنے تمام ضابطہ ہائے حیات اور زندگی کی سرگرمیوں میں اولیت کا مقام عطا کیا اور ان قدروں سے کبھی بھی خالی نہ رہی؛ چنانچہ علم وحکمت، قوانین شرعیہ، جنگ، مصالحت، اقتصادیات اور خاندانی نظام، ہر ایک میں ان کی قانوناً بھی رعایت کی گئی اور عملاً بھی اور اس معاملے میں بھی اسلامی تہذیب کا پلڑا تمام جدید وقدیم تہذیبوں پر بھاری نظر آتا ہے؛ کیونکہ اس میدان میں ہماری تہذیب نے قابل فخر آثار چھوڑے ہیں اور دیگر تمام تہذیبوں سے انسانیت نوازی میں سبقت لے گئی ہے۔

---

1 سورۃ الحجرات ۴۹ :۱۳

چوتھی خصوصیت:

ہماری تہذیب کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سچے اصولوں پر مبنی علم کو خوش آمدید کہا اور پکے مبادیات پر مبنی عقائد کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا، چنانچہ عقل و قلب دونوں اس کے مخاطب ہیں اور فکر و شعور دونوں اس کی جولان گاہ اور یہ بھی تہذیبِ اسلامی کی ایسی خصوصیت ہے جس میں پوری انسانی تاریخ میں اس کا کوئی شریک نظر نہیں آتا، اس کے باعثِ افتخار ہونے کا راز یہ ہے کہ اسی کے ذریعہ سے اسلامی تہذیب نے ایسا نظام حکومت قائم کیا جو حق وانصاف پر مبنی ہو اور دین وعقیدے کی پختگی جس کا محور ہو، ایسا نہیں کیا کہ دین کو حکومت اور تہذیب کی ترقیات سے الگ رکھے، بلکہ ہر قسم کی ترقی میں دین کو اہم عامل کی حیثیت حاصل رہی چنانچہ بغداد، دمشق، قاہرہ، قرطبہ اور غرناطہ کے منارہ ہائے مسجد سے علم ودانش کی کرنیں پھوٹیں اور عالم کے گوشے گوشے کو منور کر گئیں، اسلامی تہذیب تنہا ایسی تہذیب ہے جس میں دین وسیاست کا امتزاج بھی رہا، مگر وہ اس امتزاج کی زیاں کاریوں سے یکسر محفوظ رہی، حکمراں، خلیفہ اور امیر المومنین ہوا کرتا تھا، لیکن فیصلہ ہمہ دم حق کے موافق ہوتا، شرعی فتاوے وہی لوگ صادر کرتے جو فقہ وفتاویٰ پر اتھارٹی ہوتے اور ہر قانون اور فیصلے کے سامنے برابر ہوتا، کسی کو کسی پر وجہ امتیاز حاصل نہ ہوتی سوائے تقویٰ اور لوگوں کی عام نفع رسانی کے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"وَاللهِ لَوْ انَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرِقَتْ لَقَطَعَ محمدٌ يدَها"[1]

دوسری جگہ فرمایا:

"الخلقُ كلُّهم عِيالُ اللهِ فأحبهم إليه أنفعُهم لِعِياله" [2]

اس مذہب پر ہماری تہذیب کی اساس ہے، جس میں عام طبقۂ انسانی پر نہ تو کسی حکمراں کو کوئی برتری حاصل ہے، نہ کسی عالمِ شریعت کو، نہ کسی اعلیٰ نسب والے کو اور نا ہی تونگر وزور آور کو (قُل إنَّما أنا بشرٌ مِثْلُكُمْ)۔

پانچویں خصوصیت:

اسلامی تہذیب کی ایک اور اہم ترین خصوصیت اس کی کشادہ ظرفی اور انتہا سے زیادہ مسامحت ہے، جو مذہب کی بنیاد پر قائم کسی بھی تہذیب میں ناپید ہے۔ کسی ایسے شخص کا جو نہ کسی مذہب کا پیروکار ہو اور نہ کسی معبود کی پرستش کرتا ہو، تمام مذاہبِ عالم کو ایک نگاہ سے دیکھنا اور ان کے اتباع کے ساتھ معاملۂ عدل کرنا، کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے؛ لیکن ایک ایسا شخص جس کو اپنے دین کے برحق اور اپنے عقیدے کے مبنی بر صحت ہونے کا کامل یقین ہو، پھر اسے اقطارِ عالم کو فتح کرنے، ان پر حکومت کرنے اور وہاں کے باشندوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا بھی موقع ملے مگر اپنے دین کی حقانیت وصحت اسے فیصلے میں ظلم

---

1 صحیح البخاری، کتاب: الحدود، باب: کراھیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان، حدیث: ۶۷۸۸

2 مرقاۃ المفاتیح، ملا علی قاری، ، دار الفکر بیروت لبنان، ا، ۲۰۰۲ / ۲۸۶

وجور کرنے، یا عدالت کی راہوں سے منحرف ہونے یا لوگوں کو اپنے دین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور نہ کرے، تاریخ میں ایسا شخص یقینا عجیب و غریب ہی شمار کیا جائے گا۔

یہ تو کسی ایک شخص کی بات ہے مگر ہماری تو پوری تہذیب کی بنیاد ہی مذہب اور اس کے وضع کردہ اصولوں پر ہے لیکن یہ ایک ناقابل انکار سچائی ہے کہ تاریخ میں سب سے زیادہ مسامحت، انصاف، رحم و کرم اور انسانیت کی علمبردار صرف اور صرف ہماری تہذیب ہے اور ہمارے لیے یہ موجبِ صد افتخار ہے کہ ہماری تہذیب کا قوام صرف ایک مذہب پر ہے؛ مگر اس کی لا محدود وسعتوں میں مذاہبِ عالم کی تہذیب کی سمائی ممکن ہے۔ [1]

2۔ غیر اسلامی تہذیب:

غیر اسلامی تہذیب مغرب کی نو بیداری کے بعد ہونے والے مختلف خوشگوار و ناخوشگوار تغیرات پر منحصر ہے۔ جو ہمیشہ سے علمی و فکری بحرانوں کا شکار رہا ہے، جسے نہ تو کبھی کوئی معقول بنیاد فراہم ہو سکی اور نہ ہی وہ کسی متعین نظریہٴ زندگی پر قائم رہ سکا، بلکہ اس کی تشکیل میں مغربی مفکرین ہمیشہ ہچکولیاں کھاتے رہے، متضاد افکار و نظریات اور منتشر تخیلات پر نظریہ زندگی کی بنیاد رکھتے رہے۔ سترہویں صدی سے قبل مغرب میں چرچ کی حکمرانی تھی، اس وقت پادریوں کا بول بالا تھا، اٹلی سے لے کر اسکاٹ لینڈ تک تمام ممالک زیر اثر تھے۔ عیسائی عوام سخت ترین جہالت میں مبتلا تھے، اربابِ کلیسا انہیں سیکڑوں خرافات میں الجھا کر بڑے بڑے نذرانے وصول کر رہے تھے، یہاں تک کہ جنت میں جانے کا اجازت نامہ اور سرٹیفیکیٹ بھی بڑی بڑی رشوتوں کے عوض بانٹ رہے تھے۔ دوسری طرف معاشرہ کے بااختیار لوگوں کو عوام پر ظلم و زیادتی کی کھلی آزادی تھی اور یہ سب کچھ مسخ شدہ مذہب کے سایہ میں انجام دیا جا رہا تھا، چنانچہ عوامی مخالفت و بغاوت کا خطرناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ غیر اسلامی تہذیب جس نے عالمی قیادت کے علاقوں میں حکمرانی کی اس کی تصویر کشی کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس نے نصف صدی سے کم عرصے میں دو عالمگیر جنگیں پھڑکائیں جنہوں نے پوری انسانیت کو تباہ کر دیا قطع نظر اس سے کہ اس نے بہت سے ممالک کو اپنا غلام بنایا وہاں اپنی نو آبادیات قائم کیں اور قوموں کے وسائل و ذرائع کی لوٹ کھسوٹ کو اپنے لیے مباح کیا جبکہ کالوں پر عرصہٴ حیات تنگ کر دی اور سرخوں کا صفایا کر دیا اور اس کے کارناموں کو بیان کرنے کیلئے اس امر کی جانب اشارہ کافی ہے کہ آج تک اجتماعی اور بین الاقوامی سیاسیات میں نسل و رنگ کے بنیاد کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ [2]

اِس تاریک دور کے رد عمل میں عقلیت کی تحریک نمودار ہوئی اور پادریوں کے ذریعے پھیلائے گئے اوہام و خرافات پر سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، جس سے پادریوں اور مذہبی حلقوں کے حقائق کھل کر عوام کے سامنے آنے لگے، کلیسا کی طرف سے

---

1 اسلامی تہذیب حقائق اور خصوصیات، از نایاب حسن سیتامڑھی، دار العلوم دیوبند، ۱۴۳۲ ہجری بمطابق ۲۰۱۱ء، ص: ۴۲

2 اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید، ڈاکٹر محمد علی ضناوی، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۶ء،، ص: ۹۷

ان ناقدین اوران کے ہمنواؤں پر سخت مظالم ڈھا کر انہیں باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی، مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ تقریباً تین لاکھ لوگوں کا بہیمانہ قتل کیا گیا اور بڑی تعداد کو زندہ جلا دیا گیا۔[1] اس طرح کے مظالم کی وجہ سے نفرت وعناد اور عداوت و دشمنی میں شدید اضافہ ہو گیا، جس کی وجہ سے ایک اور فکر روشن خیالی کی تحریک کی شکل میں وجود میں آگئی، اور ایک جدید معاشرہ کا قیام عمل میں آیا جسے جدیدیت اور لادینیت جیسی مذہب مخالف بنیادوں پر کھڑا کیا گیا، اس کے بعد انسانیت کی آزادی اور مساوات کا پُر فریب نعرہ دے کر ہیومنزم اور لبرل ازم اخلاق سوز افکار کو ترقی دی گئی۔ یہاں پر ہم کچھ غیر اسلامی تہذیب کی خامیوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

پہلی خامی:

غیر اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی تہذیب وتمدن میں غیر اخلاقی خیالات اور نظریات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ایسے معاشرے میں نفس کی تسکین کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے نظریات میں خدا کا تصور موجود نہیں ہوتا لہذا ایسے معاشرے میں اخلاقی اقدار اور اخلاقی معیار کا کوئی وجود نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کسی رہنما، کسی حقیقی خالق کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ایک نظریہ ساز مغربی مفکر جیک گراسی ہیومنزم کے بارے میں لکھتا ہے: ''ہیومنزم کے پیروکاروں کی ابتدا ہی یہی سے ہوتی ہے کہ یہاں نہ کوئی خدا ہے نہ روح اور نہ کوئی غیر مادی قوتیں جن تک رسائی کی ضرورت ہو، یہاں ایسی کوئی غیبی طاقت نہیں ہے جو ہماری رہنمائی کر سکے اور اپنی خبروں اور احکام سے ہمیں واقف کرائے، اور نہ ہی ایسی کوئی ہستی ہے جس سے ہمیں پُرسکون زندگی، یا اس کی حمایت ونصرت حاصل ہو سکتی ہے''۔

دوسری خامی:

ایک مغربی ناول نگار ڈین کونٹز اپنی کتاب میں ''ہیومنزم'' کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہتا کہ ''ہمارے وجود کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم صرف اپنے نفس اور اپنے ہیجان کی تسکین کا خیال رکھیں۔ ہم میں اخلاقیات کی کوئی اہمیت نہیں ہونا چاہیے۔ نیکی وبدی، غلط ودرست کسی جذبے کی ہم میں کوئی گنجائش نہیں ہونا چاہیے''۔ مارکس اور انگلس نے واضح طور پر قانون، اخلاق اور مذہب کو فریب قرار دیا ہے۔

تیسری خامی:

عیسائیت کے عروج کے دوڑ میں جب ہیومنزم اور اس کے خیالات وتصورات غالب آئے تو ۱۹۴۵ میں جنگ عظیم دوم کے بعد جدیدیت کی ایک تحریک سامنے آئی۔ اس جدیدیت کی تحریک میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کی گئی کہ جس میں روحانی زندگی کو سراسر مسترد کر دیا اور مادی زندگی، مادی خواہشات، نفسانفسی کو خدا، آخرت پر ایمان، اخلاقی اقدار سے

---

1 تاریخ اخلاق یورپ، پول لیکی ایدورٹ ہارٹ، مترجم عبدالماجد دریاآبادی، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۳

بالاتر اور بہتر خیال کیا جانے لگا۔ یوں معاشرہ کی تشکیل کے لیے عقل اور سائنس کو سب سے اہم قرار دیا گیا۔ جدیدیت کا آغاز ۱۹۸۰ سے مانا جاتا ہے، جدیدیت دراصل نہایت کمزور اور غیر مستحکم بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے بعد معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور ذہنی تبدیلی کا دور شروع ہوا۔ یہ تبدیلی جدیدیت کے بعد ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ اسے مابعد جدیدیت کہا جاتا ہے [1] مابعد جدیدیت نے جدیدیت کی بھرپور تردید کی اور معاشرہ میں پیدا ہونے والے سنگین معاشرتی اور معاشی بحرانوں کا ذمہ دار جدیدیت کو ہی قرار دیا گیا، بلکہ ہیومنزم کی بھی شدید مخالفت کی گئی اور مابعد جدیدیت کے مفکرین نے تو اسے فکروفریب قرار دے کر رد کرنا شروع کر دیا۔ یعنی لیوی اسٹرس، بارتھس، فوالٹ اور لے کین وغیرہ مغربی فلسفیوں نے ہیومنزم کو فلسفیانہ فراڈ کہہ کر رد کر دیا۔

پوسٹ ماڈرن ازم نے ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جس میں ہر طرح کے تصورات وخیالات کو یکساں اہمیت حاصل ہے، کسی کو کسی کے خیالات کی تردید کی ضرورت نہیں، مابعد جدیدیت کے علمبرداروں کا متفقہ طور پر ماننا ہے کہ: ''تمام خیالات وتصورات اور تمام اقدار کو یکساں اہمیت حاصل ہے، اس لیے وہ ہر ایک پر ایمان رکھتے ہیں''۔

خلاصہ یہ کہ مغربی معاشرہ کے تشکیلی ادوار ہمیشہ متضاد مراحل سے گزرتے رہے، اس لیے اسے کبھی کوئی ایسا متعین معیار اور مستحکم اصول فراہم نہ ہوسکے، جن کی روشنی میں زندگی گزارنے کے حسین اقدار مرتب کیے جاسکیں اور فطرت کے مطابق پرسکون اور ہم آہنگ زندگی کے اصول وضوابط اخذ کیے جاسکیں۔ ایک جرمن ماہر نفسیات ''کارل جنگ'' نے ان متضاد نظریات زندگی کے ذریعے آنے والی خوفناک تباہی کا قوی امکان ظاہر کرتے ہوئے یہ پیشگوئی کی تھی:

''میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ دنیا کو معقول نظم وانتظام پر مبنی معاشرہ کے امکانات سے مایوسی ہی ہاتھ لگے گی، اور مجھے امن و ہم آہنگی اور خوبصورت طرزِ زندگی کا سیکڑوں سالہ خواب چکنا چور ہوتا ہی نظر آرہا ہے''۔

غیر اسلامی تہذیب کے متضاد و تغیراتی بنیادوں پر قائم ہونے کی وجہ سے اس میں وہ تمام تباہ کاریاں درآئیں جنہوں نے انسانی زندگی کو بے چینی ومایوسی اور اضطرار وانتشار میں جکڑ دیا ہے، اور آج اس بھیانک خواب کی تعبیر ہر جگہ نظر آرہی ہے جو بہت پہلے خود مغربی مفکرین نے دیکھے تھے۔ چنانچہ ایک برطانوی مصنف چارلس لے گے ایٹن اپنی کتاب میں مغربی معاشرہ کی افراتفری اور اخلاقی اقدار کی بربادی پر رونا روتے ہوئے لکھتا ہے:

''انیسویں اور بیسویں صدی کے لوگوں کو طویل انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ تہذیب ومعاشرت کی تخلیق اور اس کی تعبیر کا موقع ملا۔ صنعتی دور سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے، لیکن بھیانک خواب کے مانند خوفناک ماحول بھی برپا ہوگیا۔ [2]

---

1 Postmodernity, Lyon David, Open University press, Buckingam, Britain, 1994

2 King of castle, Gai Eaton, Neew Edn. Cambridge Islamic text society, 1991.

ان غیر مستحکم افکار و نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے بعض ایسی تحریکات وجود میں آئیں جنہوں نے معاشرہ سے بچی کھچی روحِ انسانی کو ختم کرکے اسے حیوانیت اور شہوت پرستی کی ایسی دلدل میں لا چھوڑا جن سے نکلنے کے لیے مغربی مصلحین کی طرف سے ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کے باوجود کوئی کامیاب نتیجہ برآمد نہ ہو سکا، اور یہ تحریکات پوری توانائی کے ساتھ روز بروز معاشرہ پر چھاتی رہیں، جن کے سنگین اثرات سے پورا معاشرہ شر و فساد تباہی و بربادی، جنسی انارکی اور مختلف قسم کے جرائم کی آماجگاہ بن گیا۔[1]

3۔اسلامی و غیر اسلامی تہذیب و تمدن کا موازنہ:

غیر اسلامی تہذیب تازہ دم اور طاقتور ترین تہذیب ہے۔انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ مؤثر اور ہمہ گیر تہذیب دیکھنے میں نہیں آئی، ہمارے یہاں جب دجالی تہذیب کی زبان استعمال کی جاتی ہے تو اس سے غیر اسلامی یعنی مغربی تہذیب مراد ہوتی ہے، دجال جو ہے دجل سے ماخوذ ہے اور دجل دھوکے کو کہا جاتا ہے، دجال کا مفہوم دھوکہ دینے والا ہے اور دھوکہ کی سب سے اعلیٰ مقام یہ ہے کہ کوئی شخص، کوئی جماعت یا کوئی قوم ناحق پر کھڑی ہوئی ہو اور اپنے آپ حق پر سمجھتا ہو، تو جب ہم مغربی تہذیب کو دجالی تہذیب کہتے ہیں، تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کی تمام بنیاد باطل ہے، لیکن مغربی تہذیب نے اپنے غلط نظریات کو دنیا کی نظر میں صحیح ثابت کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا ہوا ہے، اور پوری دنیا انکی غلط نظریات کو صحیح سمجھ کر زندگی بسر کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ مغربی تہذیب کو شیطانی تہذیب بھی کہتے ہیں، کیونکہ شیطان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کی نقل کرتا ہے، اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے، کہ وہ انسانوں کے اذہان اور ان کے قلوب پر باطل خیالات کو القا کرتا ہے، اور ان کو باور کراتا ہے، کہ یہی حق ہے، یہی معاملہ غیر اسلامی تہذیب یعنی جدید مغربی تہذیب کا بھی ہے۔

ہم تہذیب کی اصطلاح کو بہت سطحی معنی میں استعمال کرنے لگ گئے ہیں، یعنی جب ہمارے سامنے مغربی تہذیب کا ذکر کیا جاتا ہے تو مغرب سے متعلق بعض تصورات ہمارے ذہن پر حاوی ہو جاتے ہیں، بعض لوگ مغربی تہذیب کی علامت مغربی لباس کو سمجھتے ہیں، ایسا آدمی جو پینٹ شرٹ پہنے ہوئے ہو، ٹائی لگائے ہو، کلین شیو ہو، ہم سمجھتے ہیں یہ مغربی تہذیب کا نمائندہ اور اس کا علمبردار ہے، یا فحاشی و عریانی کا پورا سلسلہ جو مغرب سے برآمد ہوا ہے، اس سے متشخص کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب صرف یہ ہے، بلاشبہ ہم تہذیبوں کو لباس، وضع قطع، تراش خراش کو لے کر بھی تہذیبوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن تہذیب کو جس سطح پر بیان ہونا چاہیے، وہ لباس اور وضع قطع نہیں بلکہ کسی بھی تہذیب کی تعریف کو متعین کرنے کی بنیاد چند باتیں ہیں:

---

1 ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی۔ جولائی ۲۰۱۶

اسلامی وغیر اسلامی تہذیب کا تصور الہ اور تصور خدا:

اسلام کا تصور خدا یہ ہے کہ خدا ایک صاحب شعور ہستی ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا. مسلمان ایک خالق ومالک کے ماننے والے ہیں، اسی نے انہیں اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے،

جبکہ اس کے برعکس غیر اسلامی تہذیب نے خدا اور مذہب کے انکار کے بعد مادہ کو اپنا الٰہ بنالیا ہے، اس کے نزدیک مادہ ازل سے ہے اور ہمیشہ رہے گا لیکن یہ شکل بدل لیتا ہے، کبھی برف بن جاتا ہے، کبھی لکڑی بن جاتا ہے وہ لوگ مادہ کو صاحب شعور مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مادہ اپنے شعور کی بنیاد پر اشیاء کو تخلیق کرتا ہے۔

اسلامی وغیر اسلامی تہذیب کا تصور علم:

اسلامی تہذیب کا تصور علم وحی ہے. مسلمان وحی کے مقابلے میں انسان کے تخلیق کردہ کسی علم کو فوقیت نہیں دیتے جبکہ جدید مغربی تہذیب کا تصور علم عقل ہے. تین ساڑھے تین سو سال انہوں نے اس طرح گزارے اور اب اس کی جگہ سائنس نے لی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ جو چیز ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے، ہم صرف اس کے قائل ہیں اور جو بھی اس نظریہ کا قائل ہو جائے، مذہب اس کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے، اس لیے کہ مذہب کو سائنس سے ثابت کیا ہی نہیں جا سکتا، کوئی شخص لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعہ خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا، ممکن ہی نہیں ہے جنت جہنم کا وجود، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا اور پھر نیکوں کو ان کی نیکی کا اجر جنت کی صورت میں ملنا اور بروں کو ان کی برائی کی سزا جہنم کی صورت میں ملنا، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کو محض عقل سے سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے، یہ باتیں صرف وحی کے علم کے ذریعے سے ہی سمجھ آسکتی ہیں۔

اسلامی وغیر اسلامی تہذیب کا تصور تخلیق:

اسلامی تہذیب والوں کا عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات اللہ کی تخلیق کردہ ہے اور خدا تعالی کے لفظ کن کہنے سے یہ کائنات اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ وجود میں آگئی. جبکہ غیر اسلامی تہذیب کا تصور تخلیق ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہے، جس طرح کبڑا چاہتا ہے کہ ساری دنیا کبڑی ہو جائے، اس طرح اس یہودی دانش ورنے چاہا اور دیگر یہودیوں نے اس نظریے کو پھیلایا کہ ہمارے آباؤ اجداد بندر اور خنزیر بنائے گئے تھے اور اس کا ہمیں طعنہ دیا جاتا ہے، تو کیوں نہ ساری دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالا جائے کہ ان کے آباؤ اجداد بھی دراصل بوزنے تھے اور یہ اتنا مضحکہ خیز نظریہ ہے کہ مسلمان تو شروع دن سے ہی اس کے قائل نہیں تھے لیکن سیکولر لوگ محض مسلمانوں سے بغض اور عناد کی بنا پر اس نظریہ کے قائل تھے اور اب خود اس کے فکری پیروکاروں کے ہاں بھی یہ اس قابل نہیں رہا کہ اس کا تذکرہ کیا جائے۔

اسلامی وغیر اسلامی تہذیب کا تصور نجات:

مسلمانوں کے لیے کامیابی کا تصور آخرت میں کامیابی اور جنت کا حصول ہے، خواہ دنیا میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو جبکہ غیر اسلامی تہذیب کا تصور کامیابی مادی ترقی ہے، جس نے دنیا میں جتنی زیادہ مادی ترقی کی وہی کامیاب ترین انسان ہے، اور یہ تصور اس قدر عام ہو چکا ہے کہ عام لوگوں کو تو چھوڑیے، خواص بھی صاحب توقیر اس شخص کو سمجھتے ہیں جو زیادہ مال و زر والا ہے

اسلامی وغیر اسلامی تہذیب کا تصور انسان:

اسلامی تہذیب انسان کو اس زمین پر اللہ کا نائب مانتی ہے، انسان کو اشرف المخلوقات گردانتی ہے، انسان پوری کائنات کا خلاصہ ہے، ایک مؤمن مسلمان کی حرمت کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے جبکہ غیر اسلامی تہذیب انسان کو حیوان سے زیادہ پہچانتی ہی نہیں ہے، غیر اسلامی تہذیب کے علم سیاسیات میں انسان ایک سیاسی حیوان ہے، علم معاشیات میں ایک معاشی حیوان ہے، علم نفسیات میں انسان مخصوص جبلتوں کے مجموعہ کا نام ہے، علم حیاتیات میں انسان محض ایک حیاتیاتی وجود ہے، اس تہذیب نے انسان کو مادیت سے آگے پہچانا ہی نہیں، اسی نقطہ نظر کی خرابی نے پوری انسانیت کو مادیت پرستی کی آگ میں جھونک دیا ہے۔

اسلامی تہذیب کا تصور انسان حق پر مبنی ہے اور انسان کو ایک ایسی فضیلت حاصل ہے جس کے آگے فرشتے بھی کچھ نہیں ہیں، مغربی تہذیب کے بارے میں ہمارا رویہ عقل و شعور پر مبنی ہونا چاہیے، اگر ہم مسلم ممالک میں اسلامی مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں تو ہمیں اس تہذیب سے کسی درجے میں سمجھوتہ کرتے ہوئے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ہمیں کس چیز کی مخالفت کرنی ہے اور کس چیز کو قبول کرنا ہے، محض اندھی مخالفت سے ہم انتہائی مطلوب چیزوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور بالکلیہ قبول کرنے سے ہم اس کے مضر اثرات سے بچ نہیں پائیں گے۔[1]

خلاصہ یہ کہ امریکہ کے سیاہ فام نگیرور ہنما ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو کتنی بے دردی سے قتل کیا گیا، اس لیے کہ اسے خدا نے سیاہ فام پیدا کیا تھا اور وہ اپنے اور اپنے ہم رنگ و ہم نسل انسانوں کے حقوق کا تحفظ چاہتا تھا، ان سیاہ فام انسانوں کے حقوق جنہیں یورپ کے ''سفید بندوں'' نے حیوانات سے بھی بدتر اور حقیر سمجھ رکھا ہے، جن پر ملک کی معاشی راہیں مسدود رہیں جن کے لیے نصاب تعلیم، تعلیم گاہیں، ہوٹل، بسیں اور گاڑیاں تک علیحدہ ہیں، یہاں تک کہ کارخانوں میں ان کے آنے جانے کے راستے تک الگ ہیں اور جن کے ساتھ رشتہ ناطہ بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا ہے۔ یہ سیاہ فام انسان بدترین طبقاتی تفاوت، استحصال، ظلم و جبر اور حقوق کی حق تلفی کا شکار ہیں۔ اس امریکہ اور یورپ میں جو "تہذیب و تمدن" کی امامت کا مدعی ہے، اس امریکہ میں جو اقوام متحدہ کا چوہدری ہے جو انسانی حقوق کی حفاظت کا دعویدار ہے، اس امریکہ میں جو ہمیشہ انسانی حقوق کے چارٹر کا ڈھنڈورا پیٹ کر اپنے ظلم، سفاکی اور ذلت کے داغ چھپانا چاہتا ہے، اپنے ملک کے باشندوں کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک، اس دعویدار

---

1 عادل لطیف، اسلام اور مغربی تہذیب میں فرق، اشاعت ۲۰۱۷ء، ص: ۵۲

تہذیب ملک میں ہو رہا ہے جہاں کے سب سے بڑے شہر نیو یارک کی بندرگاہ میں ''آزادی کا مجسمہ'' دنیا سے آنے والوں کا استقبال ان الفاظ سے کرتا ہے:

''اپنے بے کس مصیبت زدہ اور غلام عوام کو ہمارے سپرد کیجئے تاکہ وہ آزادی کی زندگی بسر کر سکیں وہ لوگ جن کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ کوئی وطن لیجئے میں حاضر ہوں اور سنہری دروازہ کے قریب اپنی مشعل لیے کھڑا ہوں۔''

مگر قول و عمل کے تضاد کی ایسی مثال تاریخ کے کسی دوسرے حصہ میں بھی نہیں مل سکتی۔ تاریخ میں پہلی بار دھوکہ، فریب، دجل و تلبیس اور عالمی پیمانے کی یہ ''بدمعاشی'' صرف یورپ اور مغربی تہذیب ہی کو نصیب ہو سکی ہے جس کے نسلی، علاقائی اور قومی امتیازات سے خود امریکہ اور برطانیہ جل رہا ہے۔ رہوڈیشیا مظلوم انسانوں کے خون سے لالہ زار ہے، کینیا نالاں ہے اور جنوبی افریقہ پوری انسانیت پر ماتم کناں ہے جہاں انسانی خون کی وقعت بول و براز کے برابر بھی نہیں رہی۔ یہ تہذیب اور کتنے جری ہیں اس کے علمبردار جنہیں اب بھی اپنے آپ پر ناز ہے کتنی کورچشمی اور دیدہ دلیری ہے ان گستاخ نگاہوں کی جو اپنی اس ساری شقاوت درندگی اور ذلت ورسوائی کو تہذیب و تمدن اخلاق اور انسانی حقوق کی رعایت کا نام دے کر بار بار اٹھتی ہیں، تو اس مذہب پر جو حقیقی مساوات کا علمبردار، انسانی حقوق کا نقیب اور پوری کائنات کے لیے رحمت بن کر آیا ہے اور جو ابتداء سے لے کر آج تک احترام انسانیت کا عملی نمونہ پیش کر رہا ہے جس کے بھیجنے والے کا اعلان ہے:

{اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللهِ اَتْقٰكُمْ }[1]

ترجمہ: ''بے شک اللہ کے ہاں آپ میں سے عزت والا وہ ہے جس میں تقوی ہو۔'' جس کے پیغمبرؐ کا وداعی پیغام تھا:

''اَلنَّاسُ مِنْ آدَمَ وَ آدَمَ مِنْ تُرَابٍ''[2]

ترجمہ: ''تمام لوگ اولاد آدمؑ ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے ہیں۔''

اسلامی تہذیب میں ایک سیاہ فام حبشی غلام بلالؓ کو انسانیت کی معراج سے نوازا، نبی ﷺ نے جنت میں اپنے سے آگے چلنے کی بشارت دی ایک صحابی نے انہیں ''او حبش کے بیٹے'' کہہ کر پکارا، تو حضورؐ نے اسے ڈانٹ کر فرمایا تم میں اب بھی جاہلیت کی بو باس باقی ہے۔ اسلامی تہذیب میں اس سیاہ فام حضر بلالؓ کو امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ ''یاسیدنا'' ''اے ہمارے سردار'' سے پکارا کرتے تھے۔

اسلامی تہذیب کے اوصاف میں سے یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ والئ مصر کے ساتھ ملنے والے وفد کی قیادت ایک ایسے سیاہ فام صحابی حضرت عبادہؓ بن صامت کو سونپ دی تھی جسے دیکھ کر بادشاہ لرز گیا اور اصرار کرنے لگا کہ دوسرے شخص کو میرے

---

1 سورۃ الحجرات ۴۹ : ۱۳

2 علامہ حافظ ابوالفداء عمادالدین ابن کثیر، البدایہ والنھایہ، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۷ء، ۳۰۱/۴

ساتھ گفتگو کے لیے مقرر کردو مگر مسلمانوں نے والئ مصر کی یہ خواہش ٹھکراتے ہوئے کہا کہ چونکہ یہ شخص علم وفضل اور تقویٰ میں ہم سب سے بڑھ کر ہے، اس لیے یہی ہمارا امیر ہے اور یہ بھی فرمایا کہ ہماری فوج میں تو ایک ہزار سے زیادہ ایسے سیاہ فام شخص ہیں[1]۔

اسلام کی نظر میں انسان کی زندگی شروع سے اختتام تک ایک ہے، اس کے حصے اور اجزا نہیں کیے جا سکتے بلکہ تمام زندگی ایک وجود ہے اور اللہ پوری کائنات کا رب اور خالق ہے۔ وہ انسان کا بھی رب اور خالق ہے۔ اسلام میں آسمان وزمین کی ہر شے اللہ تعالیٰ کے لیے ہے چنانچہ اسلام میں اس امر کی کوئی جگہ نہیں کہ اللہ کی بندگی سے ہٹ کر کسی اور کی مرضی سے اپنی زندگی گزاری جائے۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی ساری حیات اسلامی تعلیمات کے مطابق بسر ہو اور اللہ کے رنگ میں رنگی جائے۔

{صِبغَةَ اللهِ وَمَن اَحسَنُ مِنَ اللهِ صِبغة}[2]

ترجمہ: "اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ اس کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہوگا"

اسلام کی نظر میں یہ بات لازمی ہے کہ مسلمانوں پر اللہ کا رنگ غالب رہے۔ وہ اسی رنگ میں رنگے رہیں اور یہی روح ان پر چھائی رہے، اسلامی تمدن کا مرکز اخلاق اور اس کا مضمون انسانیت ہے۔ اسلام زندگی کے آغاز سے لے کر اخری دم تک ہر مرحلے کے لیے ہدایت اور قانون مہیا کرتا ہے بلکہ پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد پیش آنے والے امور کے بارے میں بھی تفصیلی احکام عطا کر دیتا ہے۔

اسلام اس صورت کو قبول نہیں کر سکتا، کہ زندگی میں اس کی حیثیت ایک زائد اور ذیلی امر کی ہو اور غیر اسلامی امور کو اہم اور بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ اسلام تابع اور خادم کی حیثیت میں رہے اور غیر اسلام کو قیادت اور حکمرانی کا درجہ حاصل ہو۔

اسلام ایک دین فطرت ہے اور اس کی فطرت میں یہ شامل ہے کہ اسلام ہمیشہ حاکم کی حیثیت سے رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا دین ہے اور اللہ ہی کا دین بلند اور عالی رہتا ہے، جبکہ لادینیت کی یہ تمنا ہے کہ اسلام اپنا فطری طرز عمل اختیار نہ کرے اور اسلام ہمیشہ کے لیے محکوم رہے، لادینیت ایسے اسلام کو لانا چاہتی ہے جو محض رسوم تک محدود ہو، جس کے فرمانبردار پیروں اور درویشوں کے پھیلائے ہوئے توہمات اور بے بنیاد قصے کہانیوں میں پھنسا ہوا ہو، لیکن اگر اسلام اپنے ماننے والوں کی تربیت کریں، معاشرے کو حق کے ساتھ مظبوط کریں، معاشرے میں عدل وانصاف کا نظام لائے، دستور، تہذیب وثقافت کی ہر ممکن رہنمائی کریں، لوگوں کو اچھے کاموں کی تلقین اور برے کاموں سے روکے، حتیٰ کہ فساد پھیلانے والوں کے لیے اسلام ڈھال کے طور پر پیش آئے تو ایسا اسلام لادینیت کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

---

[1] مولانا سمیع الحق، اسلام اور عصر حاضر، دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور، ۱۹۷۶ء، ص: ۴۸-۵۱

[2] سورۃ البقرۃ ۲ : ۱۳۸

لادینیت کی یہ خواہش ہے کہ اگر اسلام موجود بھی ہو تو اس کا انسانی زندگی سے کوئی ربط نہ ہو وہ کسی کونے میں پڑا رہے، لوگوں کا اسلام سے تعلق اتنا ہو کہ ٹی وی یا ریڈیو پر کبھی کبھی اسلام کے حوالے سے گفتگو نشر ہو، نظام تعلیم میں اس کے لیے ایک پیریڈ مختص ہو، اسلام میں شخصی آزادی اور شخصی قوانین کو سرکاری قوانین کے مجموعہ میں بھی اہمیت دی جائے، سرکار کی طرف سے ایک وزارت اوقاف اور معاشرے کے لیے بے شمار مساجد بھی مختلف اداروں میں قائم کی جائے۔

لادینیت کے پرستاروں کا کہنا ہے کہ اسلام کو منبر و محراب سے سر اٹھا کر باہر کی دنیا میں اور کام کرنے کی اجازت دینے پر لادینیت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، مگر اسلام کی فطرت یہ ہے کہ وہ زندگی کے محض ایک حصہ پر صبر نہیں کر سکتا بلکہ اسلام کی نظر میں لادینیت کی حیثیت ایسی ہے جیسے گھر میں مہمان کی ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلامی و غیر اسلامی تہذیب و تمدن میں ٹکراؤ کا آغاز ہوتا ہے، اور زندگی کے ہر شعبے بالخصوص عقائد و عبادات، اخلاقیات اور دستور سازی کے شعبوں کو متاثر کرتا ہے کیونکہ اسلام کے آنے کا اصل مقصد ہی یہی ہے کہ ان شعبوں کو صحیح راستوں پر استوار کیا جائے اور لوگوں کے سامنے اس سے متعلق تمام ضروری احکام و ہدایات رکھ دی جائیں [1]

4۔اسلامی و غیر اسلامی تمدن میں فرق:

انسان جوں جوں ترقی کرتا چلا جا رہا ہے یہ پوری کائنات ایک گلوبل ویلج بن کر رہ گئی ہے۔ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک پوری دنیا میں مختلف تہذیبیں اور رسم و رواج رائج رہے ہیں جو کہ وہاں کے رہنے والوں کے نظریات و خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ بالعموم مختلف تہذیبوں کے درمیان کچھ مشترکہ مفاد بھی ہوتے ہیں اور تضاد بھی ہوتے ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں لیکن اس کے باوجود کچھ اقدار ایسی ہیں جو موجودہ دور میں تقریباً پوری دنیا کے درمیان یکساں ہیں۔ مثلاً ہر تہذیب، عدل و انصاف، سچائی، امانت داری، ہر انسان تک انصاف کی رسائی کو یقینی بنانا چاہتی ہے کم از کم نظریاتی طور پر ہی صحیح مانتی ہے، اس کے علاوہ تمام تہذیبیں اس بات پر بھی اتفاق کرتی ہیں کہ قاتل، چور، ڈاکو، جرم کرنے والے لوگ، دھوکہ کرنے والے، رشوت لینے اور دینے والے، بددیانتی کرنے والے، دوسروں کے حقوق کا استحصال کرنے والے، اغواء اور زیادتی کرنے والے جرائم پیشہ انسانوں کو سزا ملنی چاہیے لیکن کئی معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں مختلف ممالک کے درمیان آپس میں اختلاف ہے مثلاً اسلام میں چور کا ہاتھ کاٹ دینے کی سزا ہے جبکہ غیر اسلامی معاشرے میں چوری کی یہ سزا نہیں دی جاتی۔ یہ مثال اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن اور اقدار کو واضح کرنے کے لیے بہت ہے۔ اسلامی رسم و رواج اور تہذیب و تمدن پر عمل کرنے والے مسلمان کی زندگی میں اللہ کی عبادت اور اللہ پر اس کا یقین اور توکل اسے دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتا ہے۔

---

1 یوسف القرضاوی، اسلام اور سیکولرزم، مطبع ادارہ تحقیقاتی اسلامی،۱۹۹۷، ص:۱۰۹

جب وہ کسی سے ملتا ہے تو السلام علیکم کہتا ہے۔ مکالمے کے درمیان میں مسلسل انشاءاللہ، ماشاءاللہ اور الحمد للہ کا استعمال کرتا ہے۔ وہ دن میں پانچ مرتبہ نماز میں اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور اگر وہ کسی جگہ پر غیر مسلموں کے ساتھ ہو تو اس کی نماز اور کھانے کی میز پر اس کا حلال و حرام میں تمیز اس کو فوراً دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ یہی حال ایک مسلمان کی پوری زندگی کا ہوتا ہے۔ وہ رمضان کے روزے رکھتا ہے، قرآن مجید سے ایک زندہ تعلق رکھتا ہے اور وہ جانتے بوجھتے یا انجانے میں اپنی زندگی کے بہت سے امور سنت کے مطابق انجام دیتا ہے۔ مثلاً اگر وہ بچہ ہے تو اس کا ختنہ ہو چکا ہوتا ہے، اگر وہ بالغ مرد و عورت ہے تو وہ اپنے بدن کی صفائی کرتا ہے، جنابت کے وقت نہاتا ہے، نماز سے پہلے وضو کرتا ہے اور رمضان کے موقعے پر تو دوسروں سے اس کا فرق و امتیاز اتنا واضح ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں دوسری بات نہیں کی جا سکتی۔

اسلامی تہذیب کا دوسرا بڑا وصف حیا اور خاندانی نظام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مرد و عورت کے درمیان میں جنسی تعلق صرف اور صرف اسی وقت جائز ہے جب یہ دونوں قانونی طریقے سے رشتہ ازدواج میں بندھ جائیں۔ مرد و زن کے باہمی روابط سے متعلق باقی تمام ہدایات دراصل اسی ایک بات کی تشریح ہیں۔

اسلامی تہذیب کا تیسرا نمایاں وصف شراب جوئے اور سود سے اجتناب ہے۔ ایک مسلمان کو ہر اُس چیز سے اجتناب کرنا چاہیے جس میں ان چیزوں کی آمیزش ہو۔[1]

اسلامی تہذیب کا چوتھا وصف 'حفظِ مراتب' ہے۔ اسلامی تہذیب آزادیٔ رائے پر پورا یقین رکھتی ہے لیکن اس میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ آزادیٔ رائے کے نام پر کسی مقدس ہستی کا مذاق اڑایا جائے اور چھوٹے بڑے کی تمیز مٹ جائے۔ اس تہذیب کے اندر بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان احترام اور محبت کا ایک خاص رشتہ ہوتا ہے جس سے تجاوز کرنا غلط اور خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ کئی دوسرے نکات بھی بیان کیے جا سکتے ہیں لیکن اصل اہمیت انہی چار نکات کو حاصل ہے۔

اس کے برعکس غیر اسلامی تہذیب کی بنیاد 'آزادی' پر ہے۔ اگرچہ مغربی تہذیب کے اندر بھی اس آزادی پر کئی جگہ قدغنیں لگ جاتی ہیں، لیکن وہ قدغنیں جو اسلامی تہذیب ایک مسلمان پر بحیثیتِ تہذیب لگاتی ہے، اس کا مغربی تہذیب کے اندر نشان نہیں ملتا۔ مثلاً مغربی تہذیب میں عبادت ہر فرد کا ذاتی مسئلہ ہے۔ وہ چاہے تو عبادت کرے یا نہ کرے اور جس طرح سے چاہے عبادت کرے۔ اسی طرح حیا بھی اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر اس کی مرضی ہو تو اس کا خیال رکھے اور مرضی نہ ہو تو اس کا خیال نہ رکھے۔ اسی طرح الکوحل کا استعمال بھی اس کی ذات پر منحصر ہے۔ قانون اُس کو صرف اُس وقت روک سکتا ہے جب وہ شراب کے نشے میں گاڑی چلائے یا لوگوں کو نقصان پہنچائے، لیکن اس کے علاوہ ایک فرد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ یہی حال 'حفظِ مراتب' کا ہے۔ وہ چاہے تو ذاتی طور پر کسی کی عزت کرے یا نہ کرے۔ یہ اس کا حق ہے ، کہ کسی بھی شخص کا خاکہ

---

1 یوسف القرضاوی، اسلام اور سیکولرزم، مطبع ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، ۱۹۹۷ء، ص:۱۱۱

اڑائے، اُس کے متعلق کارٹون بنائے یا طنز آمیز کلمات کہے۔ ان چیزوں پر پابندی مغربی تہذیب کے خیال میں آزادیٔ رائے کے حق کے خلاف ہے، اس لیے ان چیزوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔

جب ہم دونوں تہذیبوں کا موازنہ کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر جرائم اور ان کی سزا ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتی جیسے کہ انصاف کی رسائی لین دین میں امانت و دیانت سے کام لینا محنت پر یقین کسی کا حق غضب نہ کرنا، محروم اور کمزور طبقات کی خدمت پر یقین، رشوت اور سفارش کو ناجائز سمجھنا، فراڈ کرنا، ڈاکہ ڈالنا، دوسروں کے مال پر قبضہ کرنا، کسی معصوم پر ظلم اور ظالم کا ساتھ دینا یہ تمام ایسی چیزیں ہیں جو اسلام میں ظلم سمجھی جاتی ہیں اور مغربی تہذیب بھی ان کاموں کو ظلم سمجھتی ہے۔ چند جرائم ایسے ہیں جو کہ اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان فرق کو نمایاں کرتے ہیں مثلاً مغربی تہذیب کے مطابق باہمی رضامندی سے کیا جانے والا زنا، حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھنا جیسے شراب پینا، سور کھانا، جوا کھیلنا اور سود وغیرہ جرائم کے فہرست میں نہیں آتے جبکہ اسلامی معاشرے کے مطابق یہ کام جرم ہیں اور ان پر سزا بھی بتائی گئی ہے۔[1]

کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کے متعلق غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان پہلوؤں کے حوالے سے بھی اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان ایک بڑا فرق ہے۔ حالانکہ ان پہلوؤں میں اختلاف سے کہیں زیادہ اتفاق موجود ہے۔ ان میں سے ایک پہلو جمہوریت ہے۔ کسی بھی معاشرے کی جمہوری بنیادوں کے متعلق دونوں تہذیبوں کے درمیان بنیادی اتفاق ہے۔ عالم اسلام میں یہ سوچ عام ہے کہ کسی مسلمان معاشرے کے اندر جمہوریت پر بہت ساری قانونی پابندیاں عائد ہونی چاہئیں۔ اس راقم کے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی جگہ جمہوری کلچر جاری و ساری ہو تو اس ملک کی معاشرتی اقدار کے حوالے سے وہاں کی جمہوری روایات پر خود بخود ایسی قدغنیں لگ جاتی ہیں جن کو قانون کی کتابوں میں تحریر نہیں کیا گیا ہوتا، لیکن وہ روایات کا حصہ ہوتی ہیں۔ یہی حال ایک مسلمان معاشرے کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک مسلمان معاشرے میں جمہوری کلچر موجود ہو تو پارلیمنٹ کے اندر ارکان کی ایک بڑی تعداد مسلمان ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ پورا معاشرہ جس حد تک اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہوگا، اسی حد تک ارکانِ پارلیمنٹ بھی اسلام کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے، اور قانون سازی کے وقت وہ لازماً قرآن وحدیث کی ہدایات کا خیال رکھیں گے۔ اگر اس بارے میں آئین میں کوئی خاص پابندیاں نہ بھی لگائی جائیں، تو پھر بھی ایک جمہوری معاشرے میں ایسا ہی ہوگا۔ ایسی جگہ میں قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کا کوئی سوچ بھی نہ سکے گا، اس لیے کہ اگلی دفعہ بھی وہ عوام کے ووٹوں کا محتاج رہے گا۔ یہی حال سارے مغربی ممالک کا ہے۔ اگرچہ وہاں نظری طور پر پارلیمنٹ بالکل خود مختار ہے اور وہ ہر طرح کی قانون سازی کرنے کی مجاز ہے لیکن جس ملک کی جو بھی اقدار ہوتی ہیں، عملاً انہی کے مطابق قانون سازی ہوتی ہے۔ مغربی تہذیب کی طرح اسلامی تہذیب بھی آزادیٔ رائے کی قائل ہے، مگر احترام اور شائستگی کے اصول کے

---

1 اسلام اور سیکولرزم، ص: ۱۱۱

ساتھ۔ مسلمان معاشرے میں بھی ہر فرد کو یہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات کا دلیل کے ساتھ اظہار کرے، چاہے اس کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے۔ یہ دراصل مسلمانوں کا اجتماعی شعور ہوتا ہے جو کسی بات کے ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس شعور کی زندگی دانش وروں اور مصلحین کے کام پر اپنی بنیاد رکھتی ہے۔ جس مسلمان معاشرے میں دانش ور بیدار مغز اور ہوش مند ہوں اور مصلحین دلیل کے ساتھ سوسائٹی میں اثر و نفوذ کریں، اُس سوسائٹی کا اجتماعی شعور اُتنا ہی زندہ و بیدار ہوتا ہے۔ جس کا اظہار سوسائٹی کے نظمِ اجتماعی اور حکومت و ریاست کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔[1]

کسی بھی معاشرے کے لئے قانون ضروری ہے۔ کوئی بھی معاشرہ قانون اور ضابطوں سے خالی نہیں ہو سکتا جہاں تک ایک غیر اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے اُس کی کوئی مستقل اور پائیدار بنیاد نہیں ہوتی۔ اس کے اصول و ضوابط وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس معاشرت کے قوانین خود انسان کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو بہت سی کوتاہیوں اور کمیوں کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ عموماً ایسے معاشرے کی سرگرمیوں کا مرکز محض دنیاوی مفاد ہوتا ہے۔ فرد کے قلب و ضمیر کی اصلاح و تربیت اور اعلیٰ انسانی اقدار کو پروان چڑھانے کے لیے عموماً کوئی کوشش نہیں ہوتی۔ غیر اسلامی معاشرہ میں مادیت اور نفس پرستی کا غلبہ ہوتا ہے زندگی کی فوری ضروریات کی تکمیل کے علاوہ اعلیٰ مقاصد کی جانب سوچ نہیں جاتی۔ عدل و انصاف، آزادی اور مساوات جیسے معیارات تو ہوتے ہیں لیکن عملاً ان کا حصول شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ عموماً انصاف اپنی معنویت کھو بیٹھتا ہے۔ آج کے دور میں اقلیتوں کے حقوق پر دست درازی ہوتی ہے۔ رنگ، نسل اور قومیت کی بناء پر ناروا امتیاز اور ناانصافی اس معاشرت کا خاصہ ہے۔

غیر اسلامی معاشرے کی نمایاں خامی یہ بھی ہے کہ جرم و سزا کے قوانین زیادتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ عدل و انصاف میں اپنے اور پرائے کے درمیان تفریق برتی جاتی ہے۔ عدالتوں میں سالہا سال تک مقدمے چلتے رہتے ہیں اور بسا اوقات مجرموں کو کچھ معاوضہ لے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بارسوخ لوگوں کے ساتھ رعایت برتی جاتی ہے۔ کمزور طبقے کے افراد پر زیادتیاں ہوتی ہیں، بے گناہوں کو تعذیب کا شکار بنایا جاتا ہے عدالتی کاروائی میں تاخیر کی وجہ سے اکثر وہ اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال جیل کی تاریکیوں میں گزار دیتے ہیں۔

غیر اسلامی معاشرے کا اہم مظہر بے حیائی و بے پردگی ہے، یہ خرابی تیزی سے آج سماج کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ مذہب سے دوری کی بِنا پر اور خوف خدا نہ ہونے کی وجہ سے مردوں عورتوں کے بیجا اور غیر مناسب اختلاط کو مساوات کا نام دے دیا گیا ہے۔ نکاح کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور زنا کو فروغ ملا ہے۔ اس سے خاندانی نظام کی بنیاد ہل گئی ہے اور اس کی افادیت مجروح ہوگئی ہے۔

---

[1] https://www.javedahmedghamidi.org/#!/books/5aa6719d5e891e8f44a44352?chapterNo=31

غیر اسلامی معاشرے میں عورت کے کردار اور حقوق کے سلسلے میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ یا تو قید و بند میں رکھا گیا یا مساوات کے نام پر عورت کو بازاروں اور عریاں محفلوں کا حصہ بنا دیا۔ اس کی صلاحیتوں، خوبیوں اور گھریلو ذمہ داریوں کو کمتر سمجھا گیا۔ مال و زر کی ہوس غیر اسلامی معاشرت کا خاصّہ ہوتی ہے جس کے سبب حلال و حرام کی تمیز کم ہو جاتی ہے۔

جماعت کا وجود لوگوں پر قائم ہے۔ ان تمام لوگوں میں ہر بندے کا نفع و نقصان جماعت کے مستقبل پر اثر ڈالتا ہے۔ لیکن بے خدا معاشرے میں خود غرض فرد صرف اپنے نفع و نقصان کو مد نظر رکھتا ہے۔ جماعت کی فلاح کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس رویے کے محرک افراط و تفریط پر مبنی نظریات ہوتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت، آخرت اور جزاء سزاء کے تصورات سے بے گانگی کی وجہ سے خلوص، عفو و درگزر، انسانیت، سچائی، ایمانداری اور عدل جیسے اوصاف خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

اسلامی معاشرتی نظام ایک مستحکم اور فائدہ مند نظام ہے اور اس کے اصول و ضوابط واضح اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اسلامی نظام ہمیشہ سے عدل و انصاف پر قائم ہیں اور اس کے اجزاء کے مابین ہم آہنگی ہیں۔ اسلامی نظام ایک جامع نظام ہے جو زندگی کے تمام شعبے اس کے حدود میں آتی ہیں۔ اسلامی نظام زندگی کے معاملات، انسان کی ضمیر کی تربیت اور اس کی ہدایات کے لیے بہترین انداز میں قانون سازی کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ اسلامی عقائد و نظریات کی اطاعت کرتا ہے اسی لیے اسلامی معاشرہ توحید، اسلامی عقائد اور روز آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ معاشرہ لوگوں کے مجموعے کا نام ہے اس لیے اسلام جہاں اجتماعی نظام کی اصلاح کرتا ہے وہی فرداً فرداً اصلاح کو بھی مد نظر رکھتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں کی تربیت کو ضروری سمجھتا ہے۔

فصل سوم: تہذیب و تمدن کی جدید شکلوں کی اسلامائزیشن

بحیثیت ایک اصطلاح کے تہذیب کی تعریف کی روشنی میں امر کائنات انسان اور حیات سے متعلق اسلامی تصورات و مفاہیم کی روشنی میں ہمارے لیے "اسلامی تہذیب" کی تعریف و تعین ممکن ہے، وہ یہ کہ اسلامی تہذیب حیات و کائنات سے متعلق اسلامی مفاہیم کے تحت ایک انسانی جماعت کی سرگرمیوں کے تفاعل کا نام ہے جو روئے زمین میں اللہ کی خلافت کو وجود میں لاتی ہے۔

یہ تعریف تہذیب کی عام اصطلاح کو اور تہذیبی رنگ کے لیے تشکیل شدہ اسلامی مفاہیم کو احاطہ کرنے والی مختلف اشیاء انسان، حیوانات، نباتات، جمادات اور کئی جہاں کے ساتھ روئے زمین میں خلافت الٰہی کے قیام کے لیے تفاعل کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

پھر یہ تعریف اتنی وسیع ہے کہ اس میں تہذیب اسلامی کی متعدد کڑیاں شامل ہو سکتی ہیں۔ ابتدا تاریخ سے انبیاء و رسل اور ان پر ایمان لانے والوں کے وسیع ترین حلقے بھی اس میں شامل ہیں، حتیٰ کہ وہ کڑی جس کی ابتدا محمد ﷺ کے زمانے سے ہوئی اور اس کے بعد جو واقعات اور مظاہر تفاعل رونما ہوئے وہ سب اس میں شامل ہیں۔

اسی طرح عالمی اسلامی تہذیب اس پوزیشن میں ہو گئی کہ تمام انسانی قوموں اور قبیلوں کے تفاعل اور تعامل کو اپنے جلو میں سمیٹ سکے، اور سیاہ، سفید عرب و عجم یوروپ و امریکہ کے تمام باشندوں کو اندر داخل کر سکے، اور انسانی خدمت و سعادت کے لیے کام کر سکے تاکہ اس کا احاطہ کرنے والی تمام کائنات کے ساتھ موجودات کے خالق کی بنیادی تسبیح میں ان کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

قرآن پاک میں ایک سورۃ ہے جو اپنے معانی کے اعتبار سے صحابہ کرام کی سورۃ ہے صحابہ آپس میں ایک دوسرے کو اس کی نگہداشت کرنے اور ملاقات اور جدائی کے وقت اسے پڑھنے کی تاکید کرتے تھے اور امام شافعی نے تو اس کے بارے میں فرمایا ہے "اگر قرآن میں صرف یہی ایک سورۃ ہوتی تو بھی لوگوں کے لیے کافی ہوتی"۔

یہ "سورۃ العصر" ہے۔

{وَالْعَصْرِ ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ، اِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْاوَعَمِلُواالصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ، وَ تَوَاصَوْ بِالصَّبْرِ} [1]

ترجمہ: " زمانے کی قسم ہے کہ بے شک انسان خسارے میں ہے، لیکن وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کیے اور حق پر ڈٹے رہے اور صبر کرنے کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے رہے۔"

---

[1] سورۃ العصر ۱۰۳: ۱-۳

یہ سورۃ تہذیب کے تمام عناصر کا پوری وضاحت سے احاطہ کرتی ہے،انسان،اجتماعیت زمانہ،رنگ۔اس طرح یہ سورۃ مسلسل تہذیبی عمل پر بھی مشتمل ہے۔اس سورۃ میں بڑے عمیق اشارات بتاتے ہیں کہ نفاذ کا تعطل تہذیب کا تعطل ہے اور اس سے جمود لازماً پیدا ہو جاتا ہے اور از سر نو نفاذ کامل اور تیاری امت کے انتظار میں تہذیب کو ڈال دیتا ہے[1]۔

تہذیب و تمدن کی کچھ جدید شکلیں:

عصر حاضر میں تہذیب و تمدن میں کچھ ایسی جدید شکلیں سامنے آئی جن کو رد کر کے ہمیں اسلامی تہذیب و تمدن کے دائرے میں رہ کر اسلامی تہوار اور رسم و رواج کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ان جدید شکلوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ویلنٹائن ڈے: Valentine Day

قوموں کی غلامی میں سب سے خطرناک قسم ذہنی غلامی ہے۔آج ہمارے معاشرے میں مغرب کی ذہنی غلامی کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی علم کے ان کے تہواروں کو جوش و خروش سے مناتے ہیں کہ رسم ویلنٹائن ڈے پچھلے پانچ سالوں میں طاعون اور ہیضے کی وبا کی طرح تیزی سے پھیلی ہے۔ٹی وی،ڈراموں،میوزک شو،کیبل،ڈش انٹرنیٹ،گپ شپ اور سیل فونوں کی بدولت ویلنٹائن ڈے کی بیماری نے پاکستان کے بڑے شہروں سے نکل کر قصبوں اور دیہاتوں تک کے نوجوانوں لڑکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔[2]

ویلنٹائن ڈے ہر سال ۱۴ فروری کو منایا جاتا ہے۔اس دن لوگ دوسرے لوگوں (یعنی صنف مخالف) کو کارڈز، پھول یا چاکلیٹس بھجوا کر اپنے جذبات اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔[3]

پاکستان میں ویلنٹائن ڈے منانے کا انداز:

پاکستان میں اس دن کو عالمی یوم محبت کا نام دیا گیا ہے جس میں سرخ رنگ کے کپڑے پہنے جاتے ہیں ویلنٹائن کارڈ اور چاکلیٹس دی جاتی ہیں لہذا اس موقع کے ذریعے معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میلاپ کے کلچر کو عام کیا جا رہا ہے جس میں اخبار بھی اپنا بھرپور حق ادا کر رہا ہے، جس میں ایسے اشتہارات دیے جاتے ہیں کہ اگر کسی کو اپنی محبت کا اظہار کرنا ہو تو وہ اخبار میں اپنا پیغام چھپوا سکتا ہے۔

---

1 ڈاکٹر محمد علی ضناوی، اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید،اسلامک پبلیکیشنزلاہور،۱۹۸۶ء،ص:۵۲

2 http://www.news .bbc.co.uk/cbbcnews/hi/find ماہنامہ تعمیر افکار، کراچی فروری ۲۰۰۷

3 محمد متین خالد، پادریوں کے کرتوت، جوہر رحمانیہ پرنٹرز لاہور،۲۰۰۳ء،ص: ۲۸۵

اسی طرح اس دن پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں میوزکل کنسٹرٹس منعقد کیے جاتے ہیں جو بے حیائی کا مرقع ہوتے ہیں اور اس میں شمولیت اختیار کرنے والے لڑکوں لڑکیوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ سب سرخ رنگ کے لباس میں آئیں اور ایک دوسرے کے جذبات کو بھڑکائیں۔[1]

پاکستان میں ویلنٹائن ڈے منانے میں سب سے پیش پیش فلمی ستارے ہوتے ہیں جو اس دن کو بہت جوش خروش سے مناتے ہیں بلکہ سرکاری سطح پر بھی اس دن کی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔

ویلنٹائن ڈے منانے کے حوالے سے جنگ اخبار نے طلباء کا ایک سروے کیا جس میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں ویلنٹائن ڈے منانے کا کوئی جواز نہیں جیسے کہ طلباء نے کہا کہ :

"پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔اس لیے ہمیں مغربی رسم ورواج کی بجائے اسلامی اصولوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ویلنٹائن ڈے جیسی غیر معقول رسمیں نوجوان نسل کے حق میں اچھی نہیں ہیں" [2]

یہ جاننے کے باوجود کہ یہ یہودیوں کا تہوار ہے ہم اس کو پرجوش طریقے سے مناتے ہیں بلکہ ایران جو کہ صحیح معنوں میں اسلامی ملک ہے وہاں بھی ویلنٹائن ڈے کے موقع پر اجتماعی شادی کی تقریبات منعقد کی گئی۔لگتا ہے کہ ایران نے اپنے خلاف پروپیگنڈا کے اثر کو کم کرنے کے لیے ایسی تقریبات منانے کی اجازت دی حالانکہ اسلام میں تو نہ اجتماعی شادی پر پابندی ہے اور نہ اس کے لیے ایک ایسے دن کا انتخاب کرنا جائز ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم سوچیں کیا ہماری محبت اتنی ناپائیدار ہے کہ اس کو اظہار کے لیے ایک دن چاہیے۔کیا ہماری اس کے لیے (یعنی اللہ تعالی) نہیں ہے ؟ جس نے ہمیں دنیا میں بھیجا جس نے یہ جذبہ پہچاننے اور محسوس کرنے کے لیے دل دیا۔اور یہ کہ ہم اس سے اور اسکے محبوب سے کتنی محبت کرتے ہیں مگر آج ہم یہ سوچنے کی بجائے مادی محبت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور جس نے ہمیں یہ جان عطا کی اس کی محبت کا حق ادا نہیں کر رہے۔

بسنت:(Basant)

ہمارے معاشرے میں سرکاری سطح پر ویلنٹائن ڈے کی طرح جو تہوار یا رسم سب سے زیادہ منائی جاتی ہے وہ بسنت ہے کیونکہ جس جوش وجذبے سے منایا جاتا ہے اس لحاظ سے اسلامی تہواروں کو نہیں منایا جاتا ہے لہذا بحیثیت مسلمان ضروری ہے کہ ہم جانیں کہ بسنت ہے کیا ہے اور یہ کن کا تہوار ہے۔

"بسنت موسم بہار کا ایک تہوار ہے جو وسط مارچ سے آخر مئی تک ہوتا ہے،اس میں بہار کی آمد کے گیت گائے جاتے ہیں۔

---

[1] ماہنامہ تعمیر افکار، کراچی فروری ۲۰۰۷، ص ۳۳

[2] روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۵ فروری ۲۰۰۷

بسنت کے خالص ہندووانہ تہوار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہندو اس روز کالی یا کالا دیوی کے چرنوں میں سرسوں کے پھول کا ایک ڈھیر لگا دیتے ہیں اور خاص پوجا کرتے ہیں۔ بلکہ بسنتی رنگ کے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔[1]

جس کے متعلق یونس ادیب یوں لکھتا ہے۔

"ہندو مکانوں کی چھتوں پر بسنتی اوڑھنیوں والی عورتیں اور لڑکیاں آجائیں اور شہر کی چھت پر جیسے بسنتی پھولوں کی کیاریاں اگ گئی ہو اور اس روز سکھ لڑکے بھی بسنتی پگڑیاں باندھتے تھے۔

اور نیلے آسمان کے سمندر میں رنگ برنگی پتنگیں کشتیوں کی طرح تیرتی ہوئی نظر آتی تھی"

ہندووانہ رسم و رواج پہ لکھی جانے والی قدیم کتاب جو محمود غزنوی کے دور لکھی گئی اس میں لکھا ہے کہ اور برہمنوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ جیٹھ کے پہلے دن جو اجتماع کا دن ہے عید کرتے ہیں اور نیا گلہ تبرکا پانی میں ڈالتے ہیں۔[2]

استواء ربیع کا مطلب موسم بہار ہے ہندو لوگ بہار کی آمد پر جشن منایا کرتے تھے جو آہستہ آہستہ پتنگ بازی کو بھی اپنے ساتھ شامل کرتا چلا گیا۔ اسی بسنت کی کی جھلک ذرا سکھ دور میں دیکھئے۔[3]

لوگوں کو ابھی تک یاد ہے کہ اس جگہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دور میں بسنت پر کس قدر جشن ہوتا تھا جب دیش پسند مہاراجہ اس کے سردار اور فوجی دستوں کے علاوہ ہر کوئی زرد پوشاک میں ملبوس ہوتا تھا اور مہاراجہ اس خانقاہ پر حاضری کے وقت ۱۰۰ا روپیہ اور دو زرد شالوں کا جوڑا عطیہ نذرانہ پیش کرتا تھا۔[4]

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بسنت خالصتاً ہندووانہ رسم ہے۔ اس کا منانا مسلمانوں کے لیے ناجائز ہے، اس لیے کہ اس میں تشبیہ بالھنود ہے۔ اس میں مال و جان کا ضیاع ہے اخلاقیات کا بگاڑ ہے اور اس کی ابتداء پیغمبر کائنات کی گستاخی سے ہوتی ہے لیکن افسوس کہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں بسنت کو جس جذبے سے منایا جا رہا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

پاکستان میں بسنت منانے کا انداز:

پاکستان میں آج بسنت کو جشن بہاراں کا نام دیا ہے، اس لیے کہ جب لوگوں کو اس کے پس منظر معلوم نہ ہو، اور یہ کہ یہ کس نوعیت کا تہوار ہے تو اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس پر اہل سرکار و دربار نے اسے ''جشن بہاراں'' قرار دے دیا تاکہ لوگ اس پر اعتراضات نہ کریں۔[1]

---

[1] ماہنامہ محلۃ الدعوۃ لاہور، فروری ۲۰۰۳

[2] البیرونی، کتاب الہند، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۳۴۷،

[3] تفضیل احمد ضیغم ایم۔اے، غیر مسلم تہوار بے حیائی کا بازار، دارالاندلس لاہور ۲۰۰۹ء، ص: ۲۵

[4] سید عبدالطیف، تاریخ لاہور، ص ۲۶۰

اگر دیکھا جائے تو نام تبدیل کرنے سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ ہے تو ہندوؤں کا ہی تہوار اور پھر اس میں جس قسم کی بے حیائی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کی اسلام تو اجازت نہیں دیتا لہذا اس کا مطلب ہے ہم جشن بہاراں کے نام پر اللہ اور اسکے رسول کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس چیز کو ایک ہندو نے یوں بیان کیا ہے کہ ''اب ہماری بسنت کو ''جشن بہاراں'' کا نام دے کر جائز ثابت کرنے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہو۔ میں پوچھتا ہوں یہ ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہو یا اپنے مسلمان بھائیوں کو؟ سچ پوچھو تو تم لوگ اپنے اللہ اور اسکے پاک رسول کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہو جس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے یا نام تبدیل کر کے جس وقت چاہو آسانی سے اپنے لیے حلال کر لیتے ہو۔'' [2]

لہذا آج جشن بہاراں کے نام پر جو تہوار پاکستان جیسے اسلامی ملک میں منایا جاتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ پاکستان میں جشن بہاراں کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے بلکہ حکمران خود اسکی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں اور جس میں رقص موسیقی اور شاید شراب کی محفلیں بھی منعقد کی جاتی ہیں۔

ایک جریدے میں حکومت کی سرپرستی میں جشن بہاراں کے منعقد ہونے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اس سال ستم بالائے طاق یہ ہے کہ بسنت کا فریضہ حکومت کی سربراہی میں سرانجام دیا جا رہا ہے۔ کامران لاشاری ریس کورس میں ہفتہ بھر بسنت منانے کی تیریاں کر رہے ہیں جسے جشن بہاراں کا نام دیا ہے۔ اس ٹورنامنٹ میں سب سے زیادہ پتنگیں لوٹنے والے کو ''مسٹر لٹیرا'' ۲۰۰۰ کا خطاب دیا جائیگا لاہور کے بارونق چوکوں میں بڑی بڑی پتنگیں نصب کی جائیں گی۔''

آج بھی حکومت اس پر کروڑوں روپے خرچ بغیر کسی مقصد کے خرچ کر رہی ہے۔ شوبز کے حلقوں میں بھی جشن بہاراں بہت جوش و خروش اور بے حیائی کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ایک جریدے کے مطابق:

''شوبز حلقوں میں اس موقع پر مختلف ہوٹلوں، پلازوں اور فارم ہاوسز پر مجرا پارٹیاں عروج پر رہیں اور شراب کی لاتعداد محافل منعقد ہوئیں اور اس دن ڈور کے مقابلے میں شراب زیادہ مقدار میں فروخت ہوئی۔ بسنت نائٹ آغاز ہوتے ہی عام رقصاؤں سمیت تھیٹر اور فلم سے تعلق رکھنے والی اداکاروؤں کی مصروفیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا اور 10 ہزار کا مجرا 50 ہزار اور لاکھ والے مجرے کا ریٹ 2 سے ڈھائی لاکھ تک پہنچ گیا''۔

جشن بہاراں کے موقع پر جس فضول خرچی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ ایک مسلمان کا شیوہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ ظلم تو یہ ہے کہ آج ہم بسنت کا آغاز جمعہ کے دن کرتے ہیں۔ پھر ایک دین مخصوص نہیں کرتے بلکہ اس سے اگلے جمعہ کسی اور شہر میں اسکو

---

[1] ہفت روزہ القلم، پشاور ۲تا۸ مارچ ۲۰۰۷

[2] سلیم روف، واہ رے مسلمان، صفہ دعوۃ اصلاح، گوجرانوالہ، ۲۰۱۰ء، ص: ۴

منعقد کراتے ہیں اور پھر اس موقع پر نمازوں کا بھی فراموش کر دیا جاتا ہے بلکہ ڈانس گانوں اور فائرنگ کی آواز میں تواذان کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔[1]

آج ہم صرف نام کے مسلمان رہ چکے بلکہ ہمارے اعمال تو ہندوؤں جیسے ہو چکے ہیں کہ ان کے تہوار کو ہم اپنے مذہبی تہواروں سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہندو اس تہوار کو گستاخ رسول کی یاد میں مناتے ہیں کہ جس کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

اپریل فول:(April Fool)

ویلنٹائن ڈے اور بسنت کی طرح اپریل فول کی رسم بھی پاکستان میں کافی مشہور ہے۔

اس کا لفظی معنی "اپریل کا احمق" ہے۔ انگریزوں میں دستور ہے کہ اپریل کی پہلی تاریخ دوستوں کے نام مذاقاً بیرنگ خط خالی یا دل لگی کی چیزیں لفافے میں ہیں یا اس قسم کی خبروں کو معتبر سمجھ لیتے ہیں وہ اپریل فول قرار پاتے ہیں۔[2]

اپریل فول کی تاریخ حیثیت:

اپریل فول کے آغاز کے بارے میں مختلف بیانات ہیں، اس رسم کے بابت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ 21 مارچ سے موسم تبدیلیاں آنی شروع ہوتی ہے۔ ان تبدیلیوں کو بعض لوگوں نے اس طرح تعبیر کیا کہ (معاذ اللہ) قدرت ہمارے ساتھ مذاق کر کے ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے لہذا لوگوں نے بھی اس زمانے میں ایک دوسرے کو بے وقوف بنانا شروع کر دیا۔[3]

اپریل فول کی تاریخ کے بارے میں مختلف آراء ہیں لیکن ایک خیال ہے کہ یہ تہوار یا رسم فرانس میں 1582 میں شروع ہوئی جب شاہ ول نہم نے نئے سال کے پہلے دن کو یکم اپریل سے یکم جنوری کو منتقل کر دیا اور اس کلینڈر کو Gregorian Calander کا نام دیا گیا۔ ان دنوں چونکہ آمدورفت کے ذرائع بہت محدود تھے اور لوگوں کو بہت سی تبدیلیوں کے بارے میں سالوں بعد پتہ چلتا تھا اور بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس تبدیلی کو قبول نہیں کیا اور وہ نئے سال کا دن یکم اپریل کو مناتے تھے۔ ان لوگوں کو سرکاری طور پر بے وقوف کا نام دیا گیا ان کا مذاق اڑایا گیا۔ ہر سال یکم اپریل کو یہ دن منایا جاتا تھا۔ اس طرح یہ روایت سولہویں صدی میں برطانیہ، سکاٹ لینڈ تک پہنچی۔[4]

---

[1] اقبال حسین صابری، پتنگ بازی اور بسنت کی شرعی حیثیت، ص: ۱۵

[2] امیر مینائی، امیر اللغات، حصہ اول، ص: ۲۰

[3] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، ناشر دائرۃ المعارف، بریطانیکا انکارپوریشن، ۲۰۱۰ء، ۱ / ۴۹۶

[4] http://www.april—fools.us/history-april-fools.htm

چونکہ یہ واقعہ یکم اپریل کو پیش آیا تھا اس لیے اپریل فول کی رسم در حقیقت اسی شرمناک واقعے کی یادگار ہے۔[1]

ڈاکٹر عبداللہ القریونی کے مطابق ایک انگریزی اخبار ایفنج سٹار نے ۳۱ مارچ ۱۸۴۶ء کو اعلان کیا کہ کل یکم اپریل کو فلاں شہر کے زراعتی فارم میں گدھوں کی نمائش اور میلہ ہوگا لوگ یکم اپریل کو اس زراعتی فارم پر پہنچے بہت بڑا ہجوم ہوا۔ لوگ نمائش کا انتظار کرنے لگے جب وہ انتظار کر کے تھک گئے تو پوچھنا شروع کیا میلہ کب ہوگا تب انہیں بتایا گیا کہ آج چونکہ یکم اپریل ہے اس لیے جو لوگ اس میلہ کو دیکھنے آئے ہیں اور گدھوں کی نمائش دیکھنا چاہتے ہیں وہ خود ہی گدھے ہیں خود کو دیکھ لیں۔[2]

اپریل فول کے آغاز کے حوالے سے پروفیسر جوزف بوسکن جو کہ بوسٹن یونیورسٹی میں ہسٹری کے پروفیسر ہیں نے بتایا کہ اس کا سلسلہ کونسٹنٹائن (Constantine) کے دور حکومت میں شروع ہوا۔ جب بیوقوفوں اور مسخروں کے ایک گروہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ ملک کی بھاگ دوڑ زیادہ بہتر طور پر سنبھال سکتے ہیں۔ کوسٹنٹائن نے ایک مسخرے جس کا نام kygel تھا اسے ایک دن کے لیے بادشاہ بنا دیا۔ اس نے اس روز حماقتیں کرنے کا قانون پاس کیا۔ اس دن سے یہ ایک سالانہ تہوار بن گیا[3]

اپریل فول منانے کے نتیجے میں جس شخص کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اسے فرانسیسی زبان میں poisson d’avril کہا جاتا ہے جسکا انگریزی ترجمہ April Fish ہے یعنی اپریل کی مچھلی۔[4]

جس شخص کو بیوقوف بنایا گیا ہے وہ پہلی مچھلی ہے جو اپریل کے آغاز میں شکار کی گئی ہے۔ ایک اور موقف ہے کہ poisson کا لفظ جسکا ترجمہ "مچھلی" کہا گیا ہے در حقیقت اسی سے ملتے جلتے ایک اور فرانسیسی لفظ passion کی بگڑی ہوئی شکل ہے کس کے معنی تکلیف پہنچانے اور عذاب دینے کے ہوتے ہیں لہذا یہ رسم در حقیقت اس عذاب اور ازیت کی یاد دلانے کے لیے تقرری کی گئی ہے جو عیسائی روایات کے مطابق حضر عیسیٰؑ کو پہنچائی گئی تھی۔[5]

سب سے پہلا اپریل فول اخبار ڈریک نیوز لیٹر میں ملتا ہے۔ 2 اپریل 1998ء کی اشاعت میں لکھا گیا کہ کچھ لوگوں نے یکم اپریل کو لندن ٹاور میں شیروں کے غسل کا عملی مظاہرہ کرانے کا اعلان کیا مگر لوگ وہاں پہنچے تو کچھ نہیں تھا۔[6]

---

[1] ذکر و فکر، ص:۶۸

[2] روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۱ اپریل ۲۰۰۱

[3] http://www.infoplease.com/spot/aprilfools1.htm

[4] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا۔ ج:۱ص،۴۶۹

[5] ذکر و فکر، ص:۶۸

[6] روزنامہ پاکستان لاہور، یکم اپریل ۲۰۰۱ء

فرانس میں آج کل اپریل فول کے روز فرانسیسی بچے کاغذ کی مچھلیاں اپنے دوستوں کے پیچھے چپکا کر انہیں بے وقوف بناتے ہیں۔امریکہ میں اپریل کی پہلی تاریخ کو استاد شاگردوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کہتے ہیں وہ دیکھ !ہنسوں کا گروہ اس جانب نشاندہی بھی کرتے ہیں اسی طرح طلباء اپنے کلاس فیلوز کو یہ کہتے ہوئے بے وقوف بناتے ہیں کہ آج سکول بند ہیں اس طرح جو اس پر یقین کرلیتا ہے اسے اپریل فول پکارتے ہیں۔[1]

روم میں اس تعطیل کا نام Hilaria کا تہوار ہے۔

درج بالا تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خواہ اپریل فول کی رسم موسم کی تبدیلی سے موسوم ہو خواہ نئے سال کی آمد سے اسے (معاذاللہ) قدرت کے مذاق کا ردعمل کہا جائے یا حضرت عیسیٰؑ کے مذاق اڑانے کی یادگار۔ ہر صورت میں یہ رسم کسی نہ کسی توہم پرستی یا کسی گستاخانہ نظریے سے جڑی ہے لہذا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ایسی رسم جس کی بنیاد جھوٹ پر ہو یا جس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا ہو وہ ہمیں زیب دیتی ہے مگر اس کے باوجود پاکستان جیسے ملک میں اس رسم کو منایا جاتا ہے بلکہ اس روز اکثر اوقات ایسے جھوٹ اور مذاق کیے جاتے ہیں جس سے دوسرے کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ اگر لوگ سنجیدگی سے اس رسم کی حقیقت، اصلیت اور اس کے نتائج کو سمجھ لیں تو شاید وہ اس سے پرہیز کریں۔

ہیپی نیو ائیر: (Happy New Year)

مغرب ایک اور رسم جو کہ ہمارے ہاں کافی رواج پا چکی ہے وہ ہیپی ائیر کی ہے جو یکم جنوری کو نئے سال کی آمد کے سلسلے میں منائی جاتی ہے۔ اس دن لوگ ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارک باد دیتے ہیں۔ ہیپی نیو ائیر کہا جاتا ہے اور اس سلسلے میں مختلف تقریبات منعقد کی جاتی ہے تاہم یہ جانتے ہیں کہ نیو ائیر اور نیو ائیر نائٹ کی تقریبات کا آغاز کب ہوا اور یہ رسم کیسے منائی جاتی ہے۔

ہیپی نیو ائیر منانے کے مختلف انداز:

دنیا کی دیگر رسومات کی طرح اس رسم کو منانے کے بھی مختلف طریقے رہے ہیں۔

1۔ جنوبی ایشیا میں پرندے اور فاختائیں آزاد کردیتے ہیں اور یہ عقائد رکھتے ہیں کہ آئندہ مہینے ان کے لیے اچھے ہوں گے۔

2۔ یہودی لوگ مخصوص کھانوں کے ساتھ مذہبی تقریبات منعقد کرتے ہیں۔

3۔ جاپانی چاولوں کا کیک تیار کرتے ہیں۔

---

[1] غیر مسلم تہوار بے حیائی کا بازار، ص: ۴۲

4۔امریکی لوگ ۳۱ دسمبر سے ہی اس کا آغاز کر دیتے ہیں اور بسا اوقات بہروپ بھرتے ہوئے نئے کپڑے پہن کر منہ پر ماسک چڑھاتے ہیں۔[1]

اس کے علاوہ اس دن اسرائیل کے علاوہ باقی تمام ملکوں میں قومی چھٹی ہوتی ہے۔[2]

اس دن خاص طور پر ریڈیو اور اخباروں میں گزرے ہوئے سال کے دوران ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔[3]

پاکستان میں نیو ائیر نائٹ کا آغاز اور منانے کا انداز:

۱۹۴۰ء تک نیو ائیر نائٹ کی تقریبات یورپ تک محدود تھی لیکن اس کے بعد مشرق میں بھی اس کا آغاز ہوا۔ یہ مشرق بعید میں آیا اور پھر یہ برصغیر میں بھی جڑیں پکڑنے لگا۔ ۱۹۹۲ء میں کراچی کی فائیو سٹار ہوٹل میں پہلی نیو ائیر نائٹ منائی گئی۔ یہ تقریب کڑے پہرے میں منائی گئی جس میں کراچی کے تاجروں، زمینداروں اور اداکاروں نے شرکت کی۔[4]

پاکستان جیسے اسلامی ملک میں نیو ائیر نائٹ منانے کا انداز مغرب سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس دن شراب اور رقص کا خصوصی انتظام کی جاتا ہے۔ پہلے تو نیو ائیر نائٹ صرف اونچے طبقوں میں منائی جاتی تھی مگر اب متوسط اور چھوٹے طبقے میں بھی یہ فریضہ انجام دیا جانے لگا ہے۔ نیو ائیر نائٹ پر رنگ برنگی محفلیں ہوتی ہیں۔ جام سے ٹکراتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں، پلازوں اور امراء کے ایوانوں میں ناچ گانے اور عیش و عشرت کے محافل پوری رات جاری رہتے ہیں۔ پاکستان میں نیو ائیر نائٹ پر ہونے والی فحاشی کا اندازہ اس خبر سے ہوتا ہے کہ[5]

گزشتہ رات شدید سردی کے باوجود نئے سال کے آغاز کی خصوصی محفلوں کا اہتمام ہوا جہاں ناچ گانے کے پروگراموں کے علاوہ شراب بھی پیتے رہے، جوں جوں رات بڑھتی گئی پروگرام عروج پر پہنچ گئے۔ ہوٹلوں اور امراء کے گھروں پر بھی خفیہ محفلیں رات بھر عروج پر رہیں۔ ۳۱ دسمبر کی رات شدید سردی کے باوجود ٹھیک بارہ بجے نوجوان سڑکوں پر آکر نئے سال کا خیر مقدم کرتے رہے، لاہور میں مال روڈ پر فوڈ سٹریٹس سٹیڈیم کے علاقوں میں نوجوان نعرے بازی کرتے رہے، دوسری طرف نیو ائیر نائٹ پر صوبائی دار الحکومت کے کسی بھی اہم اور غیر اہم ہوٹل میں کمرہ دستیاب نہ تھا۔ مختلف تنظیموں اور امراء نے

---

1 علمی تحقیقی مجلہ فقہ اسلامی (کراچی)، دسمبر ۲۰۰۶ء، ص: ۵۹

2 http://www.suite101.com/references/new-year-history

3 http://www.theholidayspot.com/newyear/history.htm

4 یاسر محمد خان، سازشیں بے نقاب، ص: ۵۹۴

5 غیر مسلم تہوار بے حیائی کا بازار، ص ۷۲

اپنی خفیہ محفلیں سجانے کے لیے کئی روز پہلے ہی کمرے بک کروا لیے تھے جن میں رات بھر محفلیں جاری رہیں۔ مسیحی برادری نے بھی اپنے روایتی انداز میں نئے سال کا جشن منایا۔ پولیس اہلکار مختلف علاقوں میں جمع نوجوانوں کو چیک کرتے رہے دن بھر پولیس نے درجنوں شرابی گرفتار کر کے ان سے بوتلیں برآمد کیں۔[1]

پاکستان جو کہ اسلامی ملک کہلاتا ہے اس کو اس قسم کے تقریبات تو زیب نہیں دیتیں مگر جب سرکار ہی ایسا کر رہی ہو تو پھر عوام پر تو اس کا اثر پڑتا ہے اور اس رات بہت سے لوگ اپنے دامن کو داغ دار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں نئے سال کی ابتداء پر یوں مادر پدر آزاد ہو جانے کی کوئی اجازت نہیں اور المیہ یہ ہے کہ آج ہم پر مغربی ثقافت کا ایسا رنگ چھایا ہے کہ ہم بھول گئے کہ اسلامی سال کی ابتداء محرم کے مہینہ سے ہوتی ہے اور اختتام ذوالحجہ کے مہینہ پر ہوتا ہے مگر آج ہمارے کیلنڈروں اور ڈائریوں پر انگریزی تاریخ درج ہوتی ہے اور تنخواہیں بھی اسی کیلنڈر کے تحت دی جاتی ہیں۔ لہذا آج ہم نے عیسائی ثقافت کو اسلامی ثقافت پر ترجیح دی اور پھر ان کی نقالی نے ہم سے غیرت و حیا بھی چھین لی کہ ہم ان کے پیچھے چلتے ہوئے ان ہی کے انداز میں ہیپی نیو ائیر کا نعرے لگاتے ہوئے بدن سے کپڑے نوچ کر پھینکنے اور برہنہ ناچ گانوں میں فخر محسوس کرنے لگے۔

آج نیو ائیر کی وجہ سے مسلمانوں کے گھر سے عزت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ یہ خالص مغربی تہوار ہے جس کے پیچھے بھاگ کر انہوں نے اپنی تہذیب کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے مار ڈالا ہے۔

جدید شکلوں کی اسلامائزیشن:

ہر قوم اور مذہب اپنے تہواروں اور رسومات سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح اسلام بھی اپنے تہواروں اور رسومات کی وجہ سے تمام مذاہب عالم میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام جب تک عرب کی سرزمین تک محدود رہا اس وقت تک اسلامی رسومات و تہوار نہایت سادہ تھے مگر جب اسلام عرب سے باہر دوسرے ملکوں میں پہنچا تو دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کے میل جول اور ان کے ماحول کا اسلامی رسومات و تہواروں پر اس قدر برا اثر پڑا کہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی بہت سی غلط رسومات ان میں شامل ہو گئی جس کی وجہ سے اسلامی رسومات و تہواروں کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا بلکہ اسلامی رسومات و تہواروں کو غیر شرعی امور سے الگ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ویلنٹائن ڈے، بسنت، اپریل فول اور نیو ائیر نائٹ جیسے تہواروں کی بجائے ہمیں اسلامی تہواروں اور رسومات کو اپنانا چاہیے۔ اسلامی تہواروں میں عیدین اور رسومات میں عقیقہ کی رسم، ختنہ کی رسم اور شادی بیاہ کی شرعی رسومات شامل ہیں۔

اب مذہبی رسومات و تہواروں اور ان میں شامل غیر شرعی امور بیان کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون سے امور ہیں جو اسلامی رسومات و تہواروں میں شامل ہو چکے ہیں۔

---

[1] روزنامہ پاکستان لاہور یکم جنوری ۲۰۰۲ء

مذہبی تہوار:

ہر قوم وملت میں سال کے کچھ دن جشن مسرت منانے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں جنہیں عرف عام کہا جاتا ہے۔ چونکہ انسان کی طبیعت ہے کہ وہ معمولات زندگی کی یکسانی سے کبھی کبھی گھبرا اٹھتا ہے۔اس لیے وہ ایسے شب وروز کا خواہش مند ہوتا ہے جن میں وہ اپنے روزمرہ کے معمولات سے ذرا ہٹ کر اپنے ذہن ودل کو فارغ کرلے اور کچھ وقت بے فکری کے ساتھ ہنس بول کر گزارے۔انسان کی یہی طبیعت تہواروں کو جنم دی ہے جو بالآخر کسی قوم کا اجتماعی شعار بن جاتے ہیں۔[1]

اسلام نے بھی امت مسلمہ کے لیے خوشی کے دو دن مقرر کیے ہیں جیسے کہ حدیث میں ہے کہ

''رسول ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو مدینہ والے دو مخصوص دنوں میں کھیل کود اور خوشیوں کا مظاہرہ کرتے تھے آپ ﷺ نے پوچھا کہ ''یہ کون سے دو دن ہیں ؟انہوں نے کہا! ہم زمانہ جاہلیت میں ان دو دنوں میں کھیلتے کودنے اور خوشیاں مناتے تھے تو رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''بے شک اللہ نے ان کے بدلے تمھیں دو بہترین دن دے دیے ہیں،ایک عیدالفطر اور دوسرا عیدالاضحیٰ۔[2]امت مسلمہ کے لیے بھی سال میں دو دن خوشی منانے کے لیے مقرر کردیئے گئے ہیں۔

عیدالفطر:

عیدالفطر خوشی کا وہ دن ہے جو ہر سال یکم شوال کو آتا ہے جس میں مسلمان اظہار تشکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ماہ مبارک میں روزہ رکھنے اور عبادت واطاعت کی توفیق دی۔اس دن کو عیدالفطر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ افطار اور فطر ہم معنی ہیں۔ جس طرح روزے کا افطار غروب آفتاب کے بعد کیا جاتا ہے اسی طرح رمضان المبارک کو پورے مہینے کا افطار عید سعید کے روز ہوتا ہے اسی لیے اس دن کو عیدالفطر کہتے ہیں۔اس کے علاوہ اس دن کو عیدالفطر اس وجہ سے بھی کہتے ہیں کہ اس دن صدقہ فطر ادا کیا جاتا ہے تاکہ روزوں میں اگر کسی بھی قسم کو کوئی خامی رہ گئی ہو تو اسکا کفارہ ادا ہوجائے۔[3]

اس دن کو ''یوم الجائزہ'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس دن جائزہ لیا جاتا ہے کہ ماہ رمضان میں ہم نے جو اعمال واخلاق کا تربیتی کورس کیا ہے اس میں واقعی کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں۔عیدالفطر کو عید صغیر بھی کہتے ہیں۔ترکیہ میں اسے رمضان بیرام کا نام دیا گیا ہے۔[4]

---

[1] روزنامہ جنگ،۱۳مارچ ۱۹۹۴،

[2] سنن ابی داؤد،کتاب الصلوۃ،باب صلاۃ العیدین، ۱۱۳۴، صحیح

[3] روزنامہ جنگ راولپنڈی،۲۵اکتوبر ۲۰۰۶ء سپیشل ایڈیشن

[4] علی عباس جلالپوری،رسوم اقوام،جلال پور شریف،۱۹۳۸ء، ص:۱۵۵

عید الفطر پر خوشی منانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے ماہ رمضان میں تقویٰ، عبادت و اطاعت کا درس حاصل کرنے کی توفیق دی۔ صدقہ اور فطر کے ذریعے اس کے قلب میں دوسروں کے لیے محبت اور ہمدردی کا ذوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ غریبوں کا درد محسوس کرتے ہوئے ان کی مدد کرے تاکہ وہ بھی عید کو پر مسرت طریقے سے منا سکیں یعنی عید الفطر منانے کا مقصد یہ کہ دوسروں کے لیے جیا جائے۔[1]

آج کے دور میں ان اسلامی تہواروں میں کچھ غیر شرعی امور وافعال بھی داخل ہو چکی ہیں جو سنت نبویؐ سے ثابت نہیں ہیں مثلاً اگر لوگ نماز عید کے بعد گلے ملتے ہیں اور اس کو نماز عید کے لوازمات میں سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بدعت ہے کیونکہ سنت نبویؐ سے یہ ثابت نہیں ہے۔[2]

اسی طرح ہاتھ ملانا بھی بدعت میں شامل ہے۔اس کے بارے میں محمد کفایت اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ "عیدین میں معانقہ کرنا یا عید کی تخصیص سمجھ کر مصافحہ کرنا شرعی نہیں ہے بلکہ محض ایک رسم ہے"۔[3]

اس کے علاوہ عید الفطر کو منانے کے سلسلے میں بھی ایسے غیر شرعی امور انجام دیے جاتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔آج مسلمان خاص طور پر پاکستان کے لوگ جس طرح عید مناتے ہیں اس کے بارے میں اخبار لکھتا ہے کہ:

"آج مسلمانوں میں خوشی کے اس عظیم دن میں بے شمار فضول باتیں مسخ ہو چکی ہیں کہ یہ تسبیح و تہلیل میں گزارنے کے بجائے لہو و لعب میں گزارا جاتا ہے۔ تھیٹروں اور سینما گھروں میں سپیشل شو دکھاتے ہیں۔اس طرح یہ اسلام کی عید نہیں بلکہ جہالت کی عید کا روپ دھار لیتی ہے جیسا کہ حضورؐ کی مدینہ آمد سے پہلے رائج تھی۔تعلیمات نبویؐ کے مطابق عید الفطر کی خوشی تب ہی حقیقی ہو سکتی ہے جب تمام مسلمان مل کر عید منائیں۔[4]

یہ وہ تمام غیر شرعی امور ہیں جن کا شریعت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اسلام تو کوئی بھی خوشی یا عید کو شرعی حدود کے اندر رہ کر منانے کا حکم دیتا ہے کہ جس میں کسی بھی قسم کی بے حیائی فضول خرچی نہ ہو اور جس سے انسان ذکر الٰہی سے دور نہ ہو مگر آج عید الفطر میں شامل ان تمام امور کی بناء پر مسلمان بے حیائی اور فضول خرچی میں بڑھ گئے ہیں کہ سنت نبویؐ کو بھی فراموش کر چکے ہیں حالانکہ مسلمانوں کے لیے تو آپؐ کی زندگی بہترین نمونے کی حیثیت رکھتی ہے کہ مسلمان آپؐ کی سنت

---

[1] روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۶ء، سپیشل عید الفطر ایڈیشن

[2] مفتی شیخ محمد عمر فاروق، بدعات عیدین، ص: ۳

[3] مولانا مفتی محمد کفایت اللہ، کفایت المفتی، ج:۳،ص: ۲۵۴

[4] روزنامہ جنگ لاہور، ۲۱ فروری ۱۹۹۶

کے مطابق اس کو سادگی سے مناتے اور اس دن کھیل و تفریح کا اہتمام کرے (جو شرعی حدود کے اندر رہ کر کھیلا جاتا ہو) اور خوشی کے اظہار گانا گا کر اور دف بجا کر کرتے مگر آج یہ سب نہیں ہوتا۔

آج سے کئی سو سال پہلے مغلیہ دور میں بھی عید بڑے جوش و خروش سے منائی جاتی تھی مگر وہ روایتی انداز سے مناتے تھے جیسے کہ صباح الدین عبد الرحمٰن لکھتے ہیں:

"مغل بادشاہ بھی جشن عید اسی روایتی انداز سے مناتے تھے گھروں کو سجاتے تھے گولے چھوڑے جاتے تھے لیکن اب جشن منانے میں دنیاوی نمود و نمائش بڑھتی جا رہی ہے جو عید جیسے تہوار کے منافی ہے۔[1]

آج عید الفطر میں لوگ دکھاوے کے لیے بھی غیر شرعی رسومات سرانجام دیتے ہیں تاکہ ان کی شان لوگوں کے سامنے مزید اونچی ہو جائے اور وہ سمجھیں کہ ان کے پاس مال و دولت کی بھرمار ہے حالانکہ اسلام نے تو دکھاوے سے منع کیا ہے چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہو جیسے کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

{یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ}[2]

ترجمہ: " اے لوگوں جو ایمان لائے ہو لوگوں کو تکلیف اور احسان جتا کر اپنے خیرات ضائع مت کرو، اس بندے کی طرح جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

اس حکم کے باوجود آج عید الفطر کے موقع پر دکھاوے کی خاطر بڑی بڑی اور شاندار قسم کی پارٹیاں دی جاتی ہیں جنہیں عید ملن پارٹی کہا جاتا ہے حالانکہ اسلام اس قسم کی فضول خرچیوں کے خلاف ہے۔ آج لوگ عید کے مذہبی تقاضوں کو بھی فراموش کر دیتا ہے کہ عید کے دن ان غیر شرعی رسومات کی انجام دہی میں نمازوں سے بھی غافل ہو جاتے ہیں اس لیے اسلام ان تمام غیر شرعی امور سے نجات حاصل کر کے صحیح معنوں میں عید الفطر کو منانے کا حق ادا کرنا چاہیے یعنی کہ اس میں موجود شریعت کے تمام امور بخوبی سرانجام دیں۔

عید الاضحیٰ:

عید الاضحیٰ خوشی کو وہ دن ہے جو 10 ذی الحجہ کو منایا جاتا ہے اور جس میں تمام صاحب حیثیت مسلمان اللہ کی راہ میں جانور قربان کرتے ہیں۔ عید الاضحیٰ کا عربی نام بقرہ عید نہیں ہے بلکہ عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔[3]

---

[1] صباح الدین عبد الرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۴۴۷۔۴۵۰

[2] سورۃ البقرہ ۲: ۲۶۴

[3] شمش الرحمٰن فاروقی، لغات روزمرہ، ص: ۱۹۳

قربانی کی ابتداء حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی تھی۔ آپؑ نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ نبیوں کے خواب چونکہ سچے ہوتے تھے اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے اس خواب کو اللہ کا حکم سمجھتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے تمہاری رائے کیا ہے؟ بیٹے نے جواب دیا۔

''اے ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے اس پر عمل کیجیے آپ مجھے ان شاءاللہ صبر کرنے والوں میں پائیں گے''

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو مکہ سے لے کر منیٰ لے گئے اور وہاں آپؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو پیشانی کے بل لٹا دیا ابھی ذبح کرنے لگے تھے کہ اللہ کی جانب سے ندا آئی ''اے ابراہیمؑ تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا''[1] پھر اللہ تعالیٰ نے ایک مینڈھا بھیجا جسے اپنے بیٹے کی جانب سے حضرت ابراہیمؑ نے ذبح کر دیا۔[2]

یہ واقعہ قربانی کی ابتداء ہے۔ اس کے بعد اللہ نے حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے صبر و استقامت کو اس قدر پسند کیا کہ جانوروں کی قربانی کو حج جیسی عبادت میں شمار کر دیا تاکہ لوگ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کر سکیں۔

اسلام سے قبل عرب میں دین ابراہیمی رائج تھا اس لیے اس کے مطابق لوگ قربانی کیا کرتے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی خرافات شامل ہو گئی کہ قربانی کا طریقہ تبدیل ہو گیا۔ مشرکین عرب اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے جانوروں کو لا کر مردے کی قبر سے باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ نہ ڈالتے تھے وہ اسی طرح بھوک اور پیاس تڑپ تڑپ کر مر جاتا تو اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذر سے خوش ہوتا ہے چنانچہ قربانی کے معبد کی دیوار پر خون کے چھینٹے چھاپ دیتے تھے۔[3]

اس کے علاوہ عرب کی سرزمین میں بسنے والے مختلف مذاہب میں بھی قربانی کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ مثلاً یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور کی قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے ان کا یہ ایمان تھا کہ یہ قربانی اللہ کی غذا ہے۔ بعض مذاہب میں تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے۔

مگر اسلام نے ان تمام غلط طریقوں کو ختم کیا اور دین ابراہیمی کے اصل طریقے کو دوبارہ رائج کیا کیونکہ اسلام دین ابراہیمی ہی ہے اور یہ واضح کیا کہ قربانی کا اصل مقصد تو اللہ کی اطاعت اور رضا ہے جو کہ تقوٰی اور پرہیزگاری سے حاصل ہو سکتی ہے اور یہ بھی واضح کیا کہ اللہ کو قربانی کے خون اور گوشت سے کچھ غرض نہیں، بلکہ اسے انسان کا تقوٰی مطلوب ہوتا ہے جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورۃ الصف: ۱۰۲

[2] مولانا عبدالعزیز ہزاروی، قصص الانبیاء، مکتبہ عزیز کراچی، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۹۹

[3] غلام احمد حریری، اسلامی دستورِ حیات، لاہور پولیمر پبلیکیشنز، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۵۸

{لَنْ يَّنَا لَ اللّٰهُ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ }[1]

''خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقوٰی اس کو پہنچتا ہے''

اس آیت سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ عیدالاضحیٰ پر جو قربانی اللہ کے حضور پیش کی جاتی ہے، اس کا اجر اور اللہ کی رضا اسی صورت میں مل سکتے ہیں اگر اس میں تقوٰی ہو یعنی اس میں کسی بھی قسم کا دکھاوا اور نمود و نمائش نہ ہو اور محتاجوں اور مسکینوں کی حق تلفی نہ ہو۔ چنانچہ اگر قربانی کرتے ہوئے اس میں انسان کا تقوٰی شامل ہو تو پھر اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے بلکہ اللہ اسکے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

آج عیدالاضحیٰ کے مسنون اعمال کے علاوہ اس میں ایسے غیر شرعی اعمال شامل ہو چکے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مثلاً آج لوگوں نے عیدالاضحیٰ میں جانور کی قربانی کو نمود و نمائش کا ذریعہ بنالیا ہے یعنی کہ اس قدر مہنگے جانور خریدے جاتے ہیں تاکہ لوگوں نے عیدالاضحیٰ میں جانور کی قربانی کو نمود و نمائش کا ذریعہ بنالیا ہے یعنی کہ اس قدر مہنگے جانور خریدے جاتے ہیں تاکہ لوگوں میں ان کی شان و شوکت اونچی ہو اور لوگ ان کی دولت پر رشک کریں۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اسلام نے دکھاوے اور نمود و نمائش سے منع کیا ہے کیونکہ اسی طرح سے انسان کی نیکی ضائع ہوتی ہے، اور اس کا ثواب ملنے کی بجائے گناہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دن بعض لوگ اس لیے قربانی نہیں دیتے کہ جانور خریدنے سے ان کی دولت میں کمی ہو جائے گی اور یہ دوسروں پر ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس اس قدر پیسے نہیں ہیں کہ ہم جانور خرید سکیں حالانکہ اگر اسلام کی تعلیمات پر روشنی ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قربانی کرنے یا مال خرچ کرنے سے انسان کے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ اس صدقے یا قربانی کو اپنے اوپر قرض سمجھتا ہے لہذا جب کسی کو قرض دیا جاتا ہے تو وہ واپس بھی کرتا ہے، اس طرح اللہ بھی اس کو قرض سمجھتے ہوئے سود کے ساتھ انسان کو واپس کرتا ہے جیسے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ ''کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے تاکہ اللہ اسے بڑھا کر اسے کئی گناہ کر دے''[2]

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

''اور تم اللہ راہ میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہاری طرف پلٹا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہر گز ظلم نہیں ہوگا۔''[3]

لہذا ان آیات سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قربانی دینے سے ان کے مال میں کمی ہو گی تو وہ سراسر غلط سمجھتے ہے اور حدیث میں قربانی نہ دینے والے کے بارے میں ہے کہ:

---

[1] سورۃ الحج ۲۲ : ۳۷

[2] البقرۃ ۲ : ۲۴۵

[3] انفال ۸ : ۶۰

"جو شخص وسعت مال ہوتے ہوئے قربانی نہ کرے وہ ہماری عید گاہ میں نہ آئے۔"[1]

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب استطاعت کا قربانی دینا واجب ہے۔

آج کل لوگ عید الاضحیٰ ہو یا عید الفطر دونوں عیدوں پر نماز عید کے بعد لوگ ہمیشہ اپنے گھر کے مرے ہوئے لوگوں کی قبروں کی زیارت پابندی سے کرتے ہیں اور عید کی خوشی میں اس کے ساتھ شریک ہو سکنے پر مردوں کے لیے رنج و غم ظاہر کرتے ہیں، اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ عید کے دن ایسا کرنا سنت ہے حالانکہ یہ عقیدہ درحقیقت غیر شرعی ہے بلکہ اس میں سنت کی مخالفت ہے کیونکہ سنت یہ ہے کہ نماز عید سے فارغ ہو کر آدمی اپنے گھر والوں کے پاس جلد واپس جائے تاکہ گھر کے لوگ جو قربانی کیے جانے کے منتظر ہوتے ہیں ان کے لیے قربانی کی جائے مگر شیطان نے زیار قبور کے عمل کو لوگوں کے لیے مزین و آراستہ کر دیا ہے تاکہ لوگ سنت پر جلد عمل کرنے کی بجائے دیر سے عمل کریں۔

آج کل لوگ عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے گوشت کو متعین مقدار میں پکا ڈالتے ہیں فقراء کو بلا کر یہ پکا ہوا گوشت تقسیم کر دیتے ہیں یہ خلاف سنت ہے کیونکہ امام رویانی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ صدقہ کیا جانے والا گوشت فقراء کو کچا ہی تقسیم کر دیا جائے۔ اسے پکا کر نہ دیا جائے اور بعض لوگ قربانی کا سادہ گوشت صدقہ کر دیتے ہیں اس میں خود کچھ نہیں کھاتے، یہ خلاف سنت ہے۔[2]

آج بہت سے علاقوں میں یہ امر رواج پا چکا ہے کہ اماموں کو قربانی کی کھالیں یا ان کی قیمت امامت کی اجرت میں دے دیتے ہیں جس صورت یہ ہوتی ہے کہ اماموں کی تنخواہ معمولی ہوتی وہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ محلہ کا صدقہ فطر اور قربانی کی کھالیں سب ان کے سپرد کر دی جاتی ہیں اور وہاں کو اپنی امامت کو عوض سمجھ کر سالانہ خدمت کے بدلے میں سب وصول کر لیتے ہیں یہ بالکل ناجائز ہے۔ کیونکہ صدقہ فطر اور قربانی کی کھالیں کسی معاوضے میں دینا درست نہیں امامت کی اجرت بھی ایک معاوضہ ہے قربانی کھالیں زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کو دینی چاہیے۔[3]

عید الاضحیٰ کے دنوں میں اللہ کو یاد اور کھانے پینے کا حکم حدیث میں دیا گیا ہے جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"خبردار یہ دن کھانے پینے اور اللہ ذکر کرنے کے ہیں"[4] مگر اس حدیث کے پہلے حصے کو تو لوگوں نے آج یاد رکھا اور آخری حصے کو فراموش کر دیا ہے۔ ان دنوں میں تو کھانے پینے کو خوب اہتمام کیا جاتا ہے مگر نماز اور ذکر الٰہی کو بھولا دیا جاتا ہے۔ ان تمام غیر

---

[1] مختصر الترغیب الترہیب، حافظ شہاب الدین حمد بن علی بن حجر عسقلانی، ج: ۲، ص: ۱۰۳، دار العلم ممبئی، ۲۰۰۷ء

[2] بدعات اور ان کا شرعی پوسٹ مارٹم، شیخ احمد بن حجر، ص ۴۹۹، دار الکتب السلفیۃ لاہور، ۲۰۱۰ء

[3] تحفہ خواتین، مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری، ص: ۲۲۲،

[4] سنن ابی داؤد، ج: 2، ص: 388

شرعی امور کے علاوہ عید الاضحیٰ کو منانے کے سلسلے میں بھی ایسے غیر شرعی امور سرانجام دیے جاتے ہیں جو عید الفطر میں انجام دیے جاتے ہیں جو بے حیائی اور فضول خرچی کے زمرے میں آتے ہیں اور ذکر و عبادت کے امور فراموش کر دیے جاتے ہیں۔[1]

عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور ان میں شامل غیر شرعی امور پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے، کہ آج ہم نے ان تہواروں کے مذہبی تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا ہے کیونکہ ہم ان تہواروں کے موقع پر دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے اور جذبہ ایثار کا مظاہرہ کرنے کی بجائے آج اپنی خوشی کو ملحوظ نظر رکھتے ہیں بلکہ ان تہواروں کو اپنی آنکھ، پیٹ اور نفس کی بھوک مٹانے کا ذریعہ بنالیا ہے لہذا آج ہم نے اپنے مذہبی تہوار کو گناہوں سے ملوث کر دیا ہے تو پھر سوچنا چاہیے کہ یہ عید کہاں رہی کیونکہ عید تو ایک اسلامی تہوار ہے کہ جس کے دن کا ہر کام خصوصیت کے ساتھ اچھا اور نیک ہوتا ہے اور اس دن گناہ سے بچنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور طبیعت کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ کبھی گناہ نہ کریں گے لیکن اگر ہم اپنے گریبان میں جھانکیں تو معلوم ہو گا کہ ہم نے عید کے اس مقصد کو فراموش کر دیا ہے اور گناہ کئے جا رہے ہیں۔

بحیثیت مسلمان ہمیں اپنے مذہبی تہوار کو ان تمام غیر شرعی امور سے پاک کرنا ہو گا تاکہ ہماری مذہبی پہچان برقرار رہے۔

حج ایک عظیم قومی کانفرنس جو ایک وقت میں واضح عباداتی اعمال میں متحرک ہے جو انسانوں کو ایک جگہ اور ایک ہی خطاب میں جمع کر دیتا ہے یہ وہ بلند تہذیبی صورت ہے جو اسلامی تہذیب کو غذا فراہم کرتا ہے اور اسے دوسری قومی انفرادیت سے نوازتا ہے اور ہر قسم کے انحطاط و زوال سے ان کا تحفظ کرتا ہے اور علمی ادارے اسلام کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسے طبقوں اور گروہوں کی تخریج کا کام کرتے ہیں جس سے وہ صحت مند قیادت نمایاں ہوتی ہے جو مسلمانوں کے مختلف علاقوں میں از سر نو اسلامی زندگی کے آغاز کے لیے مسلم جماعتوں کے قیام و اہتمام اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔

عقیقہ:

عقیقہ کا لفظ ''عق'' سے لیا گیا ہے۔ ''عق'' عربی لغت کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے چیرنے کاٹنے کہ ہیں اس لیے شرع کی بال چال میں عقیقہ اس قربانی کو کہتے ہیں جو کہ ساتویں دن بچے کی پیدائش سے ذبح کی جاتی ہے۔[2]

کبھی عقیقہ بچے کی پیدائشی بالوں کو بھی کہا جاتا ہے جن کو ساتویں دن کاٹا جاتا ہے اور ان کے بابت رسولؐ نے ارشاد فرمایا اس گندگی کو دور کرو۔[3]

---

[1] مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری، تحفہ خواتین، ص: ۲۲۴

[2] نواب شاہجہان بیگم صاحبہ، تہذیب النسواں، ص: ۶۰

[3] عبد القیوم ناطق، اسلامی تہذیب و تمدن، ص: ۱۲۳

اسلام سے قبل عرب میں مختلف قسم کی قربانیاں کی جاتی تھی، ان میں عقیقہ بھی ہے جس کی پابندی لازمی خیال کرتے تھے۔[1] یہ ما قبل الاسلام عمل ہے اس لیے اسلام نے بھی عقیقہ کو باقی رکھا اور آپؐ نے اپنے نواسوں کو عقیقہ فرمایا۔[2]

چنانچہ اسلام میں عقیقہ کی اہمیت عیاں ہو جاتی ہے، کہ اس کے کرنے سے بچے کی نشو نما دینی اصولوں پر ہوتی ہے اور پھر آپؐ نے اپنے نواسوں کا بھی عقیقہ کیا تھا۔

عیسائیوں کے ہاں زرد رنگ عیسائیت کی علامت قرار دی جاتی ہے۔ جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ بچے پر زرد رنگ کا پانی چھڑکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بچہ عیسائی ہو گیا ہے جبکہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ بچے کو دین ابراہیمی کے رنگ میں رنگا جائے۔اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ امت اسلامیہ کے لیے ایک ہی رسم ہونی چاہیے جس کو عمل میں لانے سے ظاہر ہو کہ بچہ دین ابراہیمی پر قائم ہے اس لیے بچے کی ولادت پر جانور ذبح کیا جاتا ہے کیونکہ حج دین ابراہیمی کی خاص نشانی ہے اور پھر سر منڈادینا بھی حج کی علامت ہے لہذا اس رسم کی عمل میں لانے میں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بچے نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا ہے یہی بہتر رنگ ہے۔[3] اور قرآن میں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ:

"ہم نے قبول کر لیا اللہ کا رنگ اور کس کا رنگ اچھا ہے"[4]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقیقہ کا مقصد یہ ہے کہ ظاہر کیا جائے کہ وہ بچہ دین ابراہیمی پر قائم ہو گا اور یہ کہ وہ مسلمان ہے۔اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حلال اور مباح کو علانیہ کیا جانا چاہیے اور اس کا پوری طرح اظہار واعلان ہو جانا چاہیے، نکاح حلال ہے اور اس کے ذریعے ایک مرد وزن کا علاقہ باہمی پاکبازی پر مبنی ہے اس لیے وہمہ کے ذریعے اس کی تشہیر کی گئی اسی طرح ایک جائز رشتہ کے ذریعہ جب بچہ کی تولید ہو تو اس سے مطلع ہو سکیں غالباً اسی مقصد کے لیے مشریعت نے عقیقہ کی سنت رکھی۔[5]

آج کل کے دور میں بھی عقیقہ کی رسم میں بے شمار فضولیات شامل ہو چکی ہے۔ مثلاً یہ دستور ہے کہ جس وقت بچے کے سر پر استر رکھا جائے اور نائی سر مونڈنا شروع کر دے فوراً اسی وقت بکری ذبح ہو، شرعاً اس کی حیثیت نہیں ہے اور یہ محض جاہلانہ رسم ہے۔[6]

---

[1] امام ابو بکر الاؤالدین الکاسانی، بدائع الضائع، ج:۵، ص ۴۹

[2] مولانا سیف اللہ رحمانی، حلال وحرام، ص: ۴۵۰

[3] مولانا سید محمد صاحب، اسلامی زندگی، ص: ۱۲۱

[4] سورۃ البقرہ ۲: ۱۳۸

[5] مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، حلال وحرام، ص ۴۵۰

[6] مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری، تحفہ خواتین، ص: ۵۳۷

اس کے سوا عقیقے کے موقع پر برادری اور کنبہ کے لوگ جمع ہو کر مونڈلانے کے بعد کٹوری کچھ نقد ڈالتے ہیں اس کو نائی کا حق سمجھا جاتا ہے اور یہ اس گھر والے کے ذمہ قرض سمجھا جاتا ہے کس کو ایسے ہی موقع پر ادا کرنا ضروری ہوتا ہے کہ اگر پاس کچھ نہ ہو تو بھی قرض لے کر ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ شریعت کے خلاف ہے کیونکہ شریعت میں بلا ضرورت قرض لینا منع ہے اور پھر نمود و نمائش کے لیے یا برادری میں طعن والزام کا نستانہ بننے سے بچنے کے لیے لینا بھی حرام ہے اور پھر قرض کی ادائیگی کو تو یہ حکم ہے کہ جب پاس ہو تو ادا کر دیا جائے مگر یہاں تو اسی موقع پر ادا کرنا ضروری سمجھا جاتا اور اگر کوئی اگلے دن دینے آئے تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے کیا آج کے دن لینے کے واسطے رہا تھا لہذا جب امور سے شریعت کی مخالفت ہوتی ہو وہ کیسے جائز ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض جگہوں یہ یہ بھی دستور ہے کہ عقیقہ کی ہڈیاں توڑنے کو برا جانتے ہیں۔ دفن کر دینے کو ضروری جانتے ہیں یہ بھی محض بے اصل بات ہے کیونکہ اگر ہڈیاں توڑ دی جائیں تو اس سے عقیقہ میں کوئی فرق نہیں آنا۔ اس کے علاوہ عقیقے کے موقع پر بڑی بڑی دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ نمود و نمائش ہو سکے یہ بھی شریعت کے خلاف ہے اگرچہ عقیقہ میں دعوت دینا سنت ہے مگر وہ شرعی حدود کے اندر رہ دینے کی اجازت ہے نہ کہ فضول خرچی کی جائے اور نمود نمائش کی جائے۔ [1]

ختنہ:

مسلمانوں میں حضرت ابراہیمؑ کی قائم کی ہوئی رسم جس میں بچے کے عضو تناسل کا زائد چمڑا کاٹ دیا جاتا ہے۔ [2]

ختنہ امور فطرت میں سے ایک ہے جیسے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

''وہ چیزیں جن کو فطرت مسلم ضروری قرار دیتی ہے وہ پانچ ہیں۔ ختنہ موئے زہر ناف کو صاف کرنا، مونچھیں کٹوانا، ناخن تراشنا اور بغلوں کے بال نوچ دینا۔'' [3]

اس حدیث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ختنہ کی رسم کو تمام انبیاءؑ نے ادا کیا تھا اس لیے اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اسلام میں اسے شعار کی حیثیت حاصل ہے۔ ختنہ اسلام کا ایک شعار ہے اور ان چیزوں میں سے ایک ہے جو اسلام کی خصوصیتوں میں قرار دی جاتی ہیں۔ پس اگر کسی شہر کے باشندے اس کے چھوڑ دینے پر اتفاق کر لیں تو اسلام کا سربراہ ان سے جنگ کرے گا اور فوجی قوت سے ان کو اس شعار کے جاری کرنے پر مجبور کرے گا۔ [4]

---

[1] بہشتی زیور، مولانا اشرف علی تھانوی، حصہ ششم (۶)، ص: ۳۳۶

[2] وارث سرہندی، علمی اردو لغت، ص: ۴۸۵

[3] خواتین اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ابوالفضل نور احمد، ص: ۴۸۴

[4] ابن عابد شامی، الدر المختار علی ہامش رد المختار، ج: ۵، ص: ۳۴۷

لہذا ختنہ شعار اسلام ہونے کے سبب کرانا سنت ہے اور بغیر کسی خاص مجبوری کہ نہ کرانا جائز نہیں ہے۔ ختنہ سے مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز ہوتا ہے اس لیے عرف عام میں اس کو مسلمانی بھی کہتے ہیں۔[1]

آج ختنے کی رسم الٰہی میں خرافات شامل ہوگئی ہیں جو سنت کے خلاف ہیں۔ بزرگوں کی موجودگی میں ختنہ ہوتا ہے جب بچہ ٹھیک ہو جاتا ہے تو سہرا باندھ کر گھوڑے پر بٹھاتے ہیں اس موقعے پر بھی بہت سے مسلمان مدعو کیا جاتا ہے پر تکلف کھانا پیش کیا جاتا ہے۔[2] حالانکہ اگر دیکھا جائے تو لوگوں کی موجودگی میں ختنہ کرنا حرام ہے کیونکہ سب لوگ دیکھتے ہیں جو کہ بے حیائی کے ذمرے میں آتا ہے اور پھر ختنے کی دعوت دینا بھی حکاف سنت ہے اور اس موقع پر پر تکلف کھانے پیش کرنا فضول خرچی کے زمرے میں آتا ہے جس کی اسلام نے مخالفت کی ہے اور پھر دعوتوں کا مقصد نمود و نمائش کرنا بھی ہے جو کہ شریعت میں منع ہے

اس موقع پر ننھیال کی طرف سے کچھ نقد و یا پیہ دیا جاتا ہے جس کو عرف عام میں بھات کہتے ہیں جس کی اصل فاسد یہ ہے کہ کفار ہنہ اولاد ختری کو میراث نہیں دیتے جاہل مسلمانوں نے ان کی دیکھا دیکھی یہ شیوہ اختیار کیا اور اگر فرضاً ان کی تقلید نہیں کی تو خود ہی یہ رسم ایجاد کی ہو تب بھی بری رسم ہے۔ کسی حق دار کا حق جس کو اللہ و رسولؐ نے مقرر فرمایا ہو اس کو نہ رہنا شرعاً برا ہے۔ اس کے علاوہ عقیقے کی طرح اس میں بھی قرض لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے قرض لینے والے پر سود کی وجہ کی فانہ کشی کی حالت ہو جاتی ہے لہذا اسلام میں ایسی رسومات کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ جس کے سبب انسان بدحالی کا شکار ہو جائے اور پھر گانے کی محفلیں منعقد کروائی جاتی ہیں۔[3] غرض یہ کہ شرعی رسم کو ان تمام امور کی وجہ سے ادا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

خلاصہ بحث:

درج بالا باب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہی سے مسلمانوں کی ذمہ داری ابھر کر سامنے آتی ہے جو باشعور ہو اور اپنے ملک کے سرکاری و قومی اداروں میں اسلامی مفہوم کے مطابق قیادت کریں۔ دوسرے الفاظ میں اپنے اداروں اور اپنے معاشرے کو اسلامی تہذیب و تمدن کے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ غیر اسلامی تہواروں کے بجائے اسلامی تہواروں کو فروغ ملے اور ان مغرب کے بنائے گئے غیر اسلامی رسم و رواج اور تہواروں کا جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ان کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جائے تاکہ ہمارا معاشرہ حقیقی معنوں میں اسلامی معاشرہ بن کر ابھرے۔ اس کے بعد یہ مباحث چیلنجوں میں تبدیل ہو جائیں گے جو ہر سطح پر اہم تفاعل کا اظہار کریں گے، کیونکہ یہی معاشرے کا وہ حصہ ہے جو اجتماعی، اقتصادی، مالی، عمرانیاتی، تربیتی، سیاسی، طبّی، قانونی، عدالتی اور منصوبہ بندی سے متعلق مسائل کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ اور مربوط کر سکے گا، چنانچہ یہ چیزیں تہذیبی للکاروں

---

[1] مولانا شمس الدین، قانون شریعت، ج:۲، ص:۳۳۹

[2] مجلہ البدر، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۱۵

[3] مولانا اشرف علی تھانوی، اصلاح الرسوم، ص:۵۲

کے ارادہ کے ضمن میں آجائیں گے تاکہ تہذیبی ظواہر کے خروج میں اضافہ ہو اور زندگی، ارتقاء، صلاحیت، مقابلہ اور سختی میں ان کو مزید قدرت حاصل ہو۔

باب پنجم: مستقبل میں تجدید واحیائے اسلام کے لیے لائحہ عمل

فصل اول: تجدید دین میں حالیہ رکاوٹیں

فصل دوم: تجدید دین کے لیے جدید وسائل اور ان کا استعمال

فصل سوم: اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اسلام کے فکری و عملی مسائل کا حل

فصل چہارم: مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار اور محمد اسد کے نظام حکومت کا ڈھانچہ

فصل اول: تجدید دین میں حالیہ رکاوٹیں

حق و باطل کی کشمکش قدیم تاریخ رکھتی ہے۔ مختلف میدانوں میں حق و باطل کی کشمکش صدیوں سے جاری ہے۔ محمدؐ کی وصال کے بعد ہی اسلام کے فیصلوں میں دراڑیں ڈالنے کا شیطانی عمل کا آغاز ہوا جو تسلسل کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ اسلام اور کفر کی اس طویل جنگ میں جہاں کفر کی، چالوں، اپنے تمام وسائل کے ساتھ حق کو ملیامیٹ کرنے کی سازشیں اور عسکری و فکری، علمی و سیاسی، تہذیبی، نئے طریقوں سے اسلام کو مٹانے اور دیگر میدانوں میں اسلام پر حملہ کرنے کی ایک لمبی داستان ہے، وہاں باطل کے خلاف اہل حق کی کوششوں، حق پر قائم رہنے والے اور حق پر مرنے والوں کے مبارک جذبوں، غلبہ اسلام کے لیے مال و جان کی قربانیوں، کفر کے ایوانوں میں، ہر میدان میں کفر کو منہ توڑ جواب دینے کی داستانوں کی بھی ایک حسین اور قابل رشک تاریخ موجود ہے۔ دعوت و عزیمت کی یہ قابل رشک تاریخ ہمارے لیے روشن چراغ اور مایوس کن دور میں ایک امید ہے ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا الہامی جملہ "اینقص الدین و انا حی" رہتی دنیا تک امت مسلمہ کے سرفروشوں اور دین کے غمخواروں کے لیے دستور، لائحہ عمل اور منشور حیات کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر دور میں دین اسلام کے محافظوں نے سنت صدیقی پر عمل کرتے ہوئے دین میں رکاوٹ ڈالنے والوں کا تعاقب کیا ہے۔

عصر حاضر میں سنت صدیقی دہرانے کی پھر شدید ضرورت ہے۔ آج کی دنیا علوم و فنون کی دنیا ہے، سائنس و ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کا دور ہے، فلسفہ و عقلی موشگافیوں کا زمانہ ہے، آزاد خیالی اور نفس پرستی کا دور ہے، مادیت اور سرمایہ ہی اس دور کے انسان کا معبود اعظم بن چکا ہے۔ انٹرنیٹ اور میڈیا نے دور اور قریب کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ آج ماضی کے برعکس زیادہ تنوع، وسعت اور جامع منصوبہ بندی کے ساتھ باطل اسلام پر حملہ آور ہے۔ مسلمان ماضی کی طرح قوت و طاقت میں نہیں ہیں۔ خلافت کا سائبان مسلمانوں کے سر پر سایہ فگن نہیں ہے۔ آج دنیا کے اختیارات کا لگام اہل مغرب کے ہاتھ میں ہے، اور سیاست و معیشت، سائنس و ٹیکنالوجی، فلسفہ و فکر، تہذیب حتیٰ کہ ہر میدان میں اہل مغرب حاکم اور کلی اختیارات کا مالک ہے۔ اہل مغرب نے اپنی حاکمیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اہل اسلام پر حملہ کر رکھا ہے۔ آج کے مسلمان خصوصاً ایک عالم دین کی ذمہ داری ماضی کے مقابلے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ تمام امت مسلمہ کی بقاء، اور دینی و ایمانی تحفظ وارثین انبیاء کے کندھوں پر ہے۔ موجودہ دور کے بڑے چیلنجز اور رکاوٹوں سے ہر صاحب علم کو مکمل طور پر آگاہی ہونی چاہیے ، اور ان رکاوٹوں کے سد باب اور توڑ کے لیے ہر وقت تیاری کرنی چاہیے۔ عصر حاضر میں مسلم امہ کو فکری و علمی حوالے سے درج ذیل بڑے چیلنجز اور رکاوٹوں کا سامنا ہے:[1]

---

1 محمد سمیع اللہ سعدی، ماہنامہ الشریعہ ۲۰۱۵، جامعہ فریدیہ اسلام آباد

۱۔ سیکولرزم :

سیکولرزم موجودہ دور کے بڑے فتنوں میں اول نمبر پر ہے۔ سیکولرزم سے مراد دین کی دنیاوی معاملات، معاشرتی امور

اور ریاستی مسلوں سے علیحدگی ہے۔ دوسرے معنی میں سیکولرزم دین کو صرف فرد کا ذاتی، پرسنل اور پرائیویٹ معاملہ سمجھتا ہے اور اجتماعی معاشرتی و ریاستی معاملات میں دین و مذہب کی مداخلت کا بے حد مخالف ہے، دوسری طرف دیکھا جائے تو اسلام ایک مکمل دستور زندگی اور کامل ضابطہ حیات ہے، انسانی زندگی کا کوئی حصہ خواہ فردی ہو یا اجتماعی، اسلامی شریعت سے باہر نہیں ہے۔ سیکولرزم اسلام کی کاملیت، جامعیت اور ابدیت کے لیے دور حاضر کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔ آج مسلم امہ مکمل طور پر سیکولرزم سے متاثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ستاون اسلامی ممالک میں سے کسی میں بھی اسلام مکمل طور پر ریاستی سطح پر نافذ نہیں ہے۔ آج کا اسلام صرف چند عبادات تک محدود ہے۔

اسلام کو معاشرتی اور ریاستی طور پر نافذ کرنے کو بیشتر اسلامی ممالک محض ایک ناقابل عمل نعرہ سمجھتے ہیں، ایسے حالات میں علمی و فکری فتنے علماء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ دور حاضر کے اس فتنے کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے اعلان جنگ کریں اور اسلام کے جامع اور ابدی نظام کو دور جدید کی ثقافت اور اسلوب و زبان سے ہم آہنگ کریں۔[1]

۲۔ الحاد :

انسانی معاشروں میں ایسے لوگ ہمیشہ سے رہے ہیں جو اسلام اور اللہ تعالیٰ کے منکر تھے، لیکن دور جدید کی حیرت انگیز ترقی اور سائنسی ایجادات کے پیٹ سے الحاد کی ایک عالمگیر تحریک نے جنم لیا ہے۔ الحاد سے مراد تمام مذاہب سے انکار ہیں۔ مذہب، دین، اللہ تعالیٰ، اور ایک اعلیٰ ہستی کے مطلق انکار کا نام الحاد ہے۔ ملحدین کے نزدیک مابعد الطبیعات نام کی دنیا ایک وہم ہے۔ کائنات صرف موجود اور محسوس کا نام ہے۔ غیر محسوس، غیر مرئی، مابعد الطبیعی اور روحانی دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ سب انسانی خیالات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق الحاد موجودہ دنیا کا مقبول ترین نظریہ ہے، اور روزانہ لاکھوں لوگ الحاد کی بھینٹ چڑھ کر اللہ تعالیٰ اور مذہب کے مکمل طور پر انکار کا نظریہ قبول کر رہے ہیں۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی ایجاد سے تو الحاد ایک منظم تحریک میں تبدیل ہو چکا ہے۔ انٹرنیٹ پر ملحدین کی ہزاروں ویب سائٹس اور سوشل میڈیا پر کئی پیجز اور گروپس موجود ہیں جن میں لاکھوں لوگ شامل ہیں۔ دور حاضر کے ملحدین کا سب سے بڑا ٹارگٹ دین اسلام ہے، کیونکہ باقی مذاہب اپنی عبادتگاہوں تک محدود ہیں اور خود ان کے ماننے والوں کے نزدیک وہ معاصر دنیا کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ صرف

---

1 محمد سمیع اللہ سعدی، ماہنامہ الشریعہ ۲۰۱۵، جامعہ فریدیہ اسلام آباد

دین اسلام ہی دنیا کا وہ واحد نظریہ اور یکتا دین ہے جو آج بھی انسانیت کے مسائل کا سب سے جامع اور کامل حل پیش کرتا ہے۔ الحاد کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہونے کے ناطے ملحدین کی توپوں کا رخ مکمل طور پر اسلام کی طرف ہے اور نت نئے شبہات، اعتراضات اور تاریخ و سیرت سے ضعیف و موضوع روایات و عبادات کی بنیاد پر دین اسلام کو نشانہ بنا رہے ہین۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے، کہ جدید الحاد کا ایک منظم و مربوط رد پیش کیا جائے۔ ملحدین کی دسیسہ کاریوں کے مسکت جوابات دیے جائیں اور ان کے اعتراضات و اشکالات کی بنیادوں پر علمی و تحقیقی کام کیا جائے۔

۳۔جدیدیت :

مغرب صدیوں سے پادریوں اور کلیسا کی غلامی میں جکڑا ہوا تھا۔ اس جکڑ بندی کے خلاف سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر نے ایک مضبوط تحریک شروع کی جس نے آگے چل کر پروٹسٹنٹ کے نام سے ایک مستقل مکتب کی شکل اختیار کرلی۔ اس کے بعد کلیسا و پاپائیت کے خلاف متنوع تحاریک اٹھیں اور ان تحاریک کی کوکھ سے ماڈرن ازم کی ایک ہمہ گیر تحریک نے جنم لیا۔ مغرب کے نامی گرامی فلاسفہ نے عقلی و فلسفیانہ بنیادوں پر ماڈرن ازم کی راہ ہموار کی اور زندگی گزارنے کے متعدد فلسفے خالص عقلی بنیادوں پر مغربی دنیا میں وجود میں آئے۔ ان تمام فلسفوں کا جامع عنوان ماڈرن ازم ہے جن میں قدر مشترک موجودہ دور کے انسان کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور خود مختاری کا علمبردار بنانا تھا۔ یوں جدید مغربی دنیا نے آزادی، مساوات اور ترقی کے تین بنیادی اصولوں پر نظام زندگی کی تشکیل کی جس کے بطن سے سرمایہ دارانہ نظام، لبرل، مغربی جمہوریت، انسانی حقوق کا عالمی چارٹر، سوشل سائنسز اور دیگر جدید نظام ہائے زندگی وجود میں آئے۔ سرمایہ کو اس جدید نظام زندگی کا جزو اعظم اور روح کی حیثیت دی گئی ہے جس سے آگے چل کر دنیا کے وسائل پر ہر قیمت پر قبضہ کرنے اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت اکٹھا کرنے کی عالمگیر سوچ پیدا ہوئی اور حرص و ہوس کی ایک ہمہ گیر فکر نے جنم لیا۔ جدیدیت کے اس فکری طوفان نے مغرب سے آگے نکل کر مشرقی و اسلامی دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں جدیدیت اپنے تمام مظاہر و آثار کے ساتھ قائم ہے، اور دنیا کے سب سے کامل و جامع دین کے علمبرداروں نے اسے نظام زندگی کے طور پر مکمل قبول کر لیا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ جدید مغربی فلسفے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے، اور اس جدید فلسفے کی کھوکھ سے پیدا شدہ نظام ہائے زندگی کا ایک بھرپور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔[1]

۴۔مابعد جدیدیت :

---

1 محمد سمیع اللہ سعدی، ماہنامہ الشریعہ ۲۰۱۵، جامعہ فریدیہ اسلام آباد

مابعد جدیدیت کا فلسفہ جدیدیت کے رد عمل میں وجود میں آیا۔ جدیدیت کے علمبر داروں نے آزادی، ترقی اور مساوات کی بنیاد پر ایک عالمگیر نظام تشکیل دیا اور جبر، قوت، طاقت، لالچ اور مکر و فریب کے ذریعے پوری دنیا پر جدیدیت کا نظام مسلط کرنے کی کوشش کی۔ جدیدیت کے ماننے والوں کے نزدیک اس وقت جدیدیت کے اصول ایک آفاقی سچائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا کے ہر خطے، ہر قوم، ہر مذہب، اور ہر نسل کے افراد کو جدیدیت کا نظام اپنانا ہوگا۔ اس ظلم واستبداد کے رد عمل میں مابعد جدیدیت کا نظریہ و فلسفہ وجود میں آیا۔ مابعد جدیدیت کی تعریف ایک فلسفی لیوٹارڈ کے الفاظ میں "مابعد جدیدیت عظیم بیانیوں پر عدم یقین" ہے۔ مابعد جدیدیت کے علمبر داروں کے نزدیک اس دنیا میں اصول، نظریات، روایات، اقدار اور سچائی و حقیقت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں آفاق سچائی اور حقیقت مطلقہ کا کوئی وجود ہے۔ یہ سب چیزیں اضافی ہیں۔ اضافی ہونے سے مراد یہ ہے کہ سچائی، حقیقت اور حق و خیر کا تعلق محض انفرادی پسند و ناپسند کے ساتھ ہے۔ ہر شخص کی سچائی، ہر شخص کا خیر اور ہر شخص کا حق الگ الگ ہے۔ اس لیے آفاقی سچائی کا تصور محض ایک دعویٰ اور دیومالائی داستان ہے۔

مابعد جدیدیت کے فلسفے کا اثر یہ ہے کہ آج کے انسان کی دلچسپی محض اپنے احساسات، جذبات اور عملی مسائل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کے انسان کے نزدیک زندگی کی تمام بحثیں مسئلہ اور حل کا نام ہیں۔ افکار، نظریات اور آئیڈیالوجی کے مباحث محض نظری ہیں جن کا عملی زندگی کی تشکیل اور مسائل کے حل میں کوئی کردار نہیں ہے۔ آج کے انسان کے نزدیک اصول، نظریات، اقدار، قواعد، ضوابط ماضی کی باتیں ہیں۔ اس لئے بعض مفکرین نے موجودہ دور کو "عدم نظریہ کا عہد" کہا ہے۔ مابعد جدیدیت کا فلسفہ جدیدیت سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ جدیدیت میں تو اصول کا مقابلہ اصول سے تھا، دلائل کے مقابلے میں دلائل تھے، جبکہ فلسفہ مابعد جدیدیت سرے سے اصول و دلائل کا ہی منکر ہے۔ جو انسان دلیل و نظریے کے وجود کا ہی منکر ہو، اسے کسی نظریے پر آمادہ کرنا اور کسی مذہب و عقائد پر لانا ایک کٹھن کام ہے۔ جدیدیت زدہ انسان کا مقابلہ تو اسلام کی آفاقیت، افادیت اور اسلامی نظام کو عقلی و فلسفیانہ بنیادوں پر ثابت کرنے پر موقوف ہے، جبکہ مابعد جدیدیت سے متاثر انسان کا مقابلہ تو اسلام کی آفاقیت، افادیت اور اسلامی نظام کو عقلی و فلسفیانہ بنیادوں پر ثابت کرنے پر موقوف ہے، جبکہ مابعد جدیدیت سے متاثر انسان کو قائل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے نظری پہلو کی بجائے اس کے عملی پہلو پر بھرپور توجہ دی جائے، انسان کی عملی زندگی کے ساتھ اسلامی احکام کے مضبوط تعلق کو ثابت کیا جائے اور اسلامی احکام پر عمل پیرانہ ہونے کی صورت میں انسان کی عملی زندگی کے نقصانات اور اس کے درہم برہم ہونے کی بھرپور وضاحت کی جائے۔ امت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اسلام کو محض ایک نظریہ اور آئیڈیالوجی کے طور پر پیش کرنے کی بجائے اسے ایک عملی اور پریکٹیکل نظام کے طور پر پیش کریں۔[1]

---

1 محمد سمیع اللہ سعدی، ماہنامہ الشریعہ ۲۰۱۵، جامعہ فریدیہ اسلام آباد

۵۔ تجدد پسندی :

سیکولرزم، الحاد، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے افکار کی اٹھان مغرب سے ہوئی اور مغرب سے بقیہ دنیا میں پھیل گئے۔ان فلسفوں نے دنیا کے ہر مذہب اور ہر نظام کو متاثر کیا۔اسلامی دنیا میں ایک بڑا طبقہ زندگی ان جدید فلسفوں سے متاثر ہوا، خصوصاً وہ طبقہ جس نے مغربی تعلیمی اداروں یا اس طرز پر بنی ہوئی مسلم ممالک کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی۔ان فلسفوں خصوصاً جدیدیت کا تاثر کا انجام یہ ہوا کہ اسلامی دنیا کے ایک بڑے طبقے نے دین اسلام کو ان جدید نظریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس میں قطع و برید اور کانٹ چھانٹ کا سلسلہ شروع کر دیا۔دین اسلام میں موجود حالات کے مطابق تبدیلی، تغیر اور قطع و برید کلی و جزوی دونوں سطح پر ہوئی۔ دین اسلام میں جزوی یا کلی تبدیلی، ترمیم اور اصلاح کے علمبرداروں کو تجدد پسند اور متجددین کہتے ہیں۔ان متجددین میں سے کسی معجزات و کرامات کے اسلامی تصور کو عہد جدید کے متضاد سمجھا تو اس کا انکار کیا، احادیث کو مطابقت میں رکاوٹ سمجھا تو اس پر ہاتھ صاف کیا، کسی نے اسلامی اصطلاحات پر ہاتھ ڈالا، کسی نے اسلام کے سیاسی نظام میں عہد حاضر کے لبرل سیاسی نظاموں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت محسوس کی، تو کسی نے اسلام کے فقہ المعاملات میں تغیر کا بیڑا اٹھایا اور سود جیسے قطعی و اجماعی حرمت رکھنے والے حکم کی حلت کا نظریہ پیش کیا۔کسی مفکر نے اسلام کے نظام عفت و عصمت پر تیشہ چلایا، تو کسی نے اسلام کے عائلی نظام کو نشانہ بنایا۔کسی نے فقہ الجہاد میں تغیر کی ضرورت محسوس کی، تو کسی نے اسلام کے نظام تزکیہ واحسان کو اپنا ہدف بنایا[1]۔

ان ترمیمات و تغیرات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے دین اور اسلاف سے مضبوط رشتہ تھا، اس لیے اسلاف کے تذکرے اور علماء پر روایت پسندی کی پھبتی کسی گئی اور ہر ممکن طریقے سے راسخ العلم قدیم علماء کی اہانت، مخالفت اور تمسخر و مذاق اڑانے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ان متجددین نے موجودہ دور میں دنیاوی سطح پر مسلمانوں کے زوال میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے دین اور اسلام کی اس تشریح اور اس فہم کو سمجھا جو نسل در نسل، سینہ بسینہ اور طبقہ بہ طبقہ صحابہ کرام کے دور سے اب تک چلا آرہا ہے۔ ان متجددین کی مجالس، اقوال اور تصانیف میں مشترک طور پر مغرب کی مدح سرائی، مغربی نظام کی اصلحیت، نافعیت، مسلم دنیا کے مستقبل کے بارے مایوسی، دین اسلام کے متفقہ و اجماعی احکام پر اشکالات، اعتراضات اور اسلامی تاریخ اور اسلاف امت کی تحقیر نظر آئے گی۔ متجددین کی تحریروں و تقریروں میں تجدید، جدت، احیاء، اصلاحات، زمانے کے ساتھ ہم آہنگی، اجتہاد اور اس جیسے الفاظ کی کثرت ہے۔ان کی نظر میں زوال کا سبب دین کی اصلی شکل و صورت پر اصرار ہے اور جس دن دین میں زمانے کے ساتھ تبدیلی و ترمیم کا راستہ کھل گیا، اس دن سے مسلمان ترقی کی دوڑ میں شامل ہو کر ترقی کی معراج

---

1 محمد سمیع اللہ سعدی، ماہنامہ الشریعہ ۲۰۱۵، جامعہ فریدیہ اسلام آباد

پر پہنچ جائیں گے۔ متجددین دنیائے اسلام کے ہر خطے اور ہر ملک میں پیدا ہوئے، لیکن برصغیر، ترکی اور مصر کو متجددین کے مراکز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ برصغیر میں مرزا ابو طالب خان سے لے کر سر سید احمد خان، قیام پاکستان کے بعد تمنا عمادی، ڈاکٹر فضل الرحمن سے لے کر جاوید احمد غامدی تک متجددین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ترکی میں سلیم ثالث، محمود ثانی، مصطفی کمال اتاترک سے لے کر شیخ احمد آفندی تک متجددین کی ایک لمبی کڑی ہے۔ مصر میں جمال الدین افغانی [1]، مفتی محمد عبدہ، رشید رضا مصری سے لے کر مصر کے نامور ادباء تک ایک وسیع سلسلہ ہے۔ [2]

آج صورت حال یہ ہے کہ ہر طرف چیلنج ہی چیلنج ہیں۔ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم، تہذیب وثقافت، سائنس، ٹیکنالوجی، اخلاقیات اور فکر وفلسفہ کے میدانوں میں مسلمانوں کو بہت سے چیلنجز کا سامنا ہے، اس حوالے سے میں کچھ مزید باتوں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جو کہ میری نظر میں تجدید دین کے لیے بنیادی باتیں ہیں۔ اس کی فہرست درج ذیل ہیں:

پہلی بات:

آج دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی غالب اکثریت آج کے عالمی حالات اور ماحول دونوں سے بے خبر ہے۔ ہمیں نہ دنیا کے جغرافیے کا علم ہے اور نہ تاریخ کا علم ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے، کون کیا کر رہا ہے، کیسے کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ کچھ فی صد حضرات ضرور اس سے مستثنیٰ ہوں گے لیکن مجموعی صورت حال یہی ہے۔

آج کے دور میں دینی کام کے لیے سب سے پہلے آج کی دنیا کے مجموعی تناظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، اقوام عالم میں ہماری حیثیت کیا ہے اور ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اس لیے علماء کرام اور بالخصوص نوجوان علماء کرام کو چاہیے کہ وہ دنیا کے حالات سے باخبر رہیں، معاصر اقوام و مذاہب سے واقفیت حاصل کریں اور اس عالمی تہذیبی کشمکش کا شعور حاصل کریں جو اس وقت اسلام اور مغرب کے درمیان تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے بغیر کوئی نوجوان عالم دین دینی وعلمی خدمات سرانجام دینا چاہتا ہے تو وہ اپنے مخصوص اور محدود ماحول کے دائرے میں تھوڑا بہت کام ضرور کر لے گا لیکن اسلام کی دعوت اور ملت اسلامیہ کے مسائل و مشکلات کے حوالے سے کچھ نہیں کر پائے گا۔

آج ہم جس جنگ اور کشمکش سے دوچار ہیں، اسے جنگ سے تعبیر کر لیں یا کھیل سمجھ لیں لیکن یہ بات طے ہے کہ جنگ اور کھیل دونوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں، کچھ قواعد ہوتے ہیں، کچھ طے شدہ طریقے ہوتے ہیں اور کچھ ہتھیار اور آلات ہوتے ہیں جو حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جن کی پابندی جنگ اور کھیل کے دونوں فریقوں کے لیے لازمی سمجھی جاتی

---

1 موصوف اگرچہ اصلاً مصری نہیں تھے، لیکن چونکہ ان کی فکر کو سب سے زیادہ فروغ مصر میں ملا، اس لیے مصری متجددین میں ان کا تذکرہ کیا

2 محمد سمیع اللہ سعدی، ماہنامہ الشریعہ ۲۰۱۵، جامعہ فریدیہ اسلام آباد

ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم فکر و فلسفہ، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تربیت اور دعوت و ابلاغ کے محاذوں پر آج کے طریقہ جنگ سے شناسائی نہیں رکھتے، قواعد اور طریقہ کار کی ہمیں کچھ خبر نہیں ہے، آج کے ہتھیاروں اور آلات سے ہمیں آگاہی حاصل نہیں ہے اور دشمن کی قوت کار، دائرۂ عمل، طریق جنگ اور ہتھیاروں کی نوعیت سے ہم اکثر و بیشتر بے خبر ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے اور ہمارے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اسی حال میں مگن ہے۔ اسے بے خبری کا بحران کہہ لیں، ادراک واحساس کے فقدان سے تعبیر کر لیں یا رابطے کے خلا کا عنوان دے لیں، مگر یہ بحران موجود ہے اور میرے نزدیک دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے آج کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ اس بحران سے نجات حاصل کریں، بے خبری کے اس خلا کو پر کریں اور فکر وعقیدہ اور تہذیب وعقیدہ کی یہ جنگ جذباتی اور سطحی نعروں کے ذریعے سے نہیں بلکہ ادراک واحساس، فہم ودانش اور شعور و باخبری کے ہتھیاروں کے ساتھ لڑیں۔

دوسری بات:

آج امریکہ نے پاکستان کے دینی مدارس کی اصلاح کے لیے اربوں روپے دیے ہیں اور یورپی یونین نے خطیر رقم کی بطور امداد پیش کش کر دی ہے۔ یہ روپیہ ہمارے ماحول میں پھیلے گا اور ہمارے تعلیمی نظام ونصاب کو سبوتاژ کرنے کے لیے صرف ہو گا۔ ہم سے دنیا کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ہم عقیدہ کی تعلیم دیتے ہیں، کمٹ منٹ کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہم تعلیم برائے تعلیم کے بجائے تعلیم برائے عقیدہ اور تعلیم برائے دین کے فلسفہ پر عمل کر رہے ہیں اور عقیدہ وثقافت کی صرف تعلیم ہی نہیں دیتے بلکہ ہم نے اپنے عملی ماحول کو بھی اس کے مطابق ڈھال رکھا ہے۔ عقیدہ وثقافت کے ساتھ بے لچک کمٹ منٹ اور اس کے مطابق معاشرتی ماحول کا تحفظ یہ دونوں باتیں آج کی دنیا کے لیے اجنبی ہیں، نا قابل قبول ہیں بلکہ نا قابل برداشت ہیں۔ امریکہ اور یورپی یونین کی دی ہوئی دولت اسی کمٹ منٹ کو کمزور کرنے کے لیے استعمال ہو گی اور ہمارے دینی اور ثقافتی ماحول کو تبدیل کرنے کے لیے صرف ہو گی۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اصل بات عقیدہ وثقافت اور اس کے مطابق ماحول کی ہے۔ اگر یہ دونوں تبدیل ہو گئے اور ان میں دراڑ ڈالنے میں کامیابی حاصل ہو گئی تو صرف تعلیم باقی رہ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، پھر اگر دینی مدارس باقی رہیں تو بھی کوئی نقصان نہیں ہو گا کیونکہ عقیدہ وثقافت کی کمٹ منٹ اور عملی دینی ماحول کے بغیر بننے والا مولوی یورپ کے اس پادری سے مختلف نہیں ہو گا جو صرف تنخواہ کے لیے ڈیوٹی دیتا ہے اور ڈیوٹی کے علاوہ باقی اوقات میں وہ عام سوسائٹی کے ماحول میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ جیسے مذہب اور اس کی تعلیمات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔[1]

---

1 زاہد الراشدی، ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، تاریخ اشاعت: ستمبر ۲۰۰۳ء

تیسری بات:

اسلام اور مغرب کی کشمکش کے پس منظر میں اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ مغرب کا موقف کیا ہے اور اس موقف کا پس منظر کیا ہے؟ ہم مغرب کے موقف کو اصولی طور پر دو حوالوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ایک تو تاریخی پس منظر ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ مغرب نے قرون وسطیٰ یا قرون مظلمہ میں مذہب کے جس کردار کا مشاہدہ کیا ہے بلکہ مذہب کے جس کردار کو بھگتا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے مغرب کی مذہب دشمنی کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ مغرب نے صدیوں تک اس صورتحال میں وقت گزارا ہے کہ عام آبادی بادشاہت اور جاگیردارانہ نظام کے مظالم کی چکی میں پستی رہی ہے۔ عام آدمی اس دور میں غلام سے بدتر حیثیت اختیار کر چکا تھا اور انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ مذہب کے ٹھیکداروں نے اس دوران عام آدمی کا ساتھ دینے کے بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا اور اپنا پورا وزن مظلوم کے بجائے ظالم کے پلڑے میں ڈال دیا حتیٰ کہ بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف عوامی بغاوت کے موقع پر بھی مذہب کا پرچم تھامے ہوئے تھے، اس دور کے اہل مذہب نے غریب عوام کے بجائے بادشاہت اور جاگیرداری کی حمایت و تعاون کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں شدید رد عمل کی طوفانی لہروں نے بادشاہت اور جاگیرداری کے ساتھ مذہب کا بیڑا بھی گہرے سمندر میں غرق کر دیا۔ اس لیے آج جب مغرب والوں کے سامنے مذہب کا نام آتا ہے تو ان کی نظروں کے سامنے قرون وسطیٰ کا منظر گھوم جاتا ہے اور ان کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مذہب اور اہل مذہب کا اس کے سوا بھی کوئی کردار ہو سکتا ہے لہٰذا ہمیں مغرب کے سامنے مذہب کی بات کرتے ہوئے مذہب سے اس کی شدید نفرت کے اس بڑے سبب کا لحاظ کرنا ہوگا اور دلیل، منطق اور کردار کے ساتھ واضح کرنا ہوگا کہ اسلام اور قرون وسطیٰ کی مسیحیت کے معاشرتی کردار میں کیا فرق ہے اور عام اہل مغرب کو باور کرانا ہوگا کہ اسلام بادشاہت کا نہیں بلکہ عوام کا ساتھی ہے اور جاگیردار کا نہیں بلکہ مظلوم کا حمایتی ہے۔

مذہب سے اہل مغرب کی شدید نفرت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ مذہب کے ٹھیکداروں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں اہل مغرب کی پیش رفت اور ترقی کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کا ساتھ دینے کے بجائے اس کی مخالفت کی ہے۔ مذہب نے کائنات کے مطالعہ اور زمین و آسمان کے نظام کی سائنسی تعبیرات کو کفر و الحاد قرار دے کر سائنس دانوں پر فتوے عائد کیے ہیں اور مذہبی عدالتوں نے انہیں خوفناک سزائیں دی ہیں۔ یہ ایک مستقل باب ہے جس کے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس سے بھی مذہب کے ساتھ اہل مغرب کی نفرت کی شدت اور نوعیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔[1]

---

1 ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، تاریخ اشاعت: نومبر ۲۰۰۲ء

چوتھی بات:

آج کی عالمی کشمکش کے تناظر میں ایک اور بات کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کہ مغرب کا کہنا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد اقوام متحدہ کے نام سے ایک بین الاقوامی ادارہ تشکیل پایا تھا اور اس نے ممالک اقوام کے نظام کو چلانے کے لیے انسانی حقوق کے چارٹر کے نام سے راہنما اصول وضع کیے تھے جس پر دنیا بھر کے تمام ممالک کے نمائندوں نے دستخط کر کے اس چارٹر کو اپنی حکومتوں اور نظاموں کے لیے راہنما اصول کے طور پر تسلیم کر رکھا ہے۔ اس چارٹر کی دفعات کی تشریح و تعبیر کا بھی ایک نظام ہے جس میں تمام ممالک شریک ہیں اور اقوام متحدہ کے مختلف ادارے بوقت ضرورت اس چارٹر کی دفعات کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے جن ممالک نے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں اور جو ممالک اقوام متحدہ کے نظام میں باقاعدہ شریک ہیں، انہیں اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے اور اپنی شرکت اور دستخطوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے قانونی نظاموں اور حکومتی ڈھانچوں کو اقوام متحدہ کے منشور اور قراردادوں کے دائرے میں لانا چاہیے۔

ہم مسلمانوں کی اس سلسلے میں دو بڑی الجھنیں ہیں۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ کے منشور کو من و عن قبول کرنے کی صورت میں ہمیں قرآن و سنت کے بہت سے صریح احکام سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور خاندانی نظام یعنی نکاح و طلاق اور وراثت کے علاوہ حدود و تعزیرات کے باب میں بھی قرآن کریم اور سنت نبویؐ کے متعدد صریح قوانین و احکام پر عمل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اور دوسری الجھن یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے نظام پر مغرب کی اجارہ داری ہے اور خود اقوام متحدہ کے فیصلوں اور قراردادوں پر عمل درآمد میں بھی مغرب کی ترجیحات کا غلبہ رہتا ہے لیکن ان دو الجھنوں اور رکاوٹوں کے باوجود مغرب کے اس موقف کو اصولی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جن ممالک نے اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں اور جن ممالک کے نمائندے اقوام متحدہ کے نظام میں شریک ہیں، ان کو اقوام متحدہ کے منشور اور فیصلوں کی پابندی کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ آج کے نوجوان علماء کرام کے لیے اس بات کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور اور اس کے مختلف اداروں کے فیصلوں اور قراردادوں کا اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ کہاں کہاں ٹکراؤ ہے اور اقوام متحدہ یا دوسرے لفظوں میں آج کے بین الاقوامی قوانین کا کون سا حصہ اور کون سا قانون قرآن و سنت کے کون سے قانون اور ضابطے سے متصادم ہے؟ اس کا ادراک حاصل کیے بغیر ہم آج کی عالمی تہذیبی کشمکش اور مسلمانوں کے ساتھ اہل مغرب کی کشیدگی کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

اس کشمکش سے ہٹ کر مثبت انداز میں اہل مغرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے اور مغربی ماحول میں اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے بھی ہمیں اپنے روایتی طرز عمل پر نظر ثانی کرنی ہو گی۔ کسی بھی شخص، گروہ یا سوسائٹی کے سامنے اسلام کی دعوت رکھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ بات اس کی زبان میں ہو اور صرف زبان کافی نہیں بلکہ اسلوب اور انداز بھی اس سوسائٹی کے لیے متعارف ہو ورنہ صرف اچھی انگریزی بول کر اپنے روایتی مشرقی اسلوب میں اسلام کی دعوت و تعلیم کا فریضہ

مغرب میں سرانجام دینے کا نتیجہ بھی مختلف نہیں ہو گا جبکہ زبان و اسلوب کے ساتھ تیسرے نمبر پر اس قوم اور سوسائٹی کی نفسیات اور ذہنی سطح کا ادراک حاصل کرنا بھی دعوت و تعلیم کا ناگزیر تقاضا ہے۔

ہمیں رسولؐ کی سنت کو مد نظر رکھ کر مغرب کے ساتھ اس طریقے میں بات کرنی چاہیے کہ جب پیغمبر ﷺ کے پاس ایک دفعہ قریش کے چند سردار آئے اور پوچھا کہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے سامنے ایک کلمہ پیش کر رہا ہوں جسے اگر تم قبول کر لو تو عرب پر تمہاری بادشاہت قائم ہو جائے گی اور عجم بھی تمہارے تابع ہو گا۔

محمدؐ کی یہ بات ان تمام سرداران قریش کے نفسیات میں موجود تھی کہ یہ سردار لوگ ہیں اور چودھراہٹ کی زبان سمجھتے ہیں اس لیے آپؐ نے ایمان کلمہ طیبہ کے بے شمار فوائد میں سے پہلے مرحلہ میں وہی فائدہ ان کے سامنے رکھا جو فوری طور پر ان کی سمجھ میں آسکتا تھا۔ ہمیں اس سنت نبوی سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے اور لوگوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس کے مطابق ان کے سامنے اسلام کی دعوت و تعلیم کو رکھنا چاہیے۔[1]

پانچویں بات:

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ جب ہم دین کی بات کرتے ہیں اور انسانی معاشرہ کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات و ہدایات کو قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو ہم سے اختلاف بلکہ مزاحمت کرنے میں سب سے پہلے عالمی ادارے اور بین الاقوامی فورم و لابیاں حرکت میں آتی ہیں حتیٰ کہ ہمارے مقامی مخالفین کو بھی وہی لوگ حرکت میں لاتے ہیں، اس لیے دین کی دعوت اور اس کی مزاحمت و مخالفت کا عالمی ماحول نہ صرف موجود ہے بلکہ متحرک ہے اور ہمیں اس کا شعور و ادراک ہو یا نہ ہو، ہماری ہر بات کا رد عمل اور جواب عالمی ماحول کی طرف سے سامنے آتا ہے جس کا جواب اسی ماحول اور سطح پر دینا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ دین کی بات کرنے، وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی طرف نسل انسانی کو بلانے اور قرآن و سنت کا معاشرتی ماحول قائم کرنے کی محنت میں ہم لوگ تنہا ہیں اور سوسائٹی کے دوسرے طبقات اس میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ ان میں سے بہت سے ادارے اور طبقات ہماری مخالفت کر رہے ہیں یا کم از کم اپنا وزن ہمارے مخالفین کے پلڑے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ جبکہ کچھ طبقات و افراد خاموشی کے ساتھ اس کشمکش کے نتائج کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ وہ وزنی پلڑے میں خود کو شامل کر سکیں۔ یہ کشمکش اعتقادی ہے، فکری ہے یا تہذیبی ہے، اس میں ہم، اہل دین یا جو علماء کرام کہلاتے ہیں، تنہا ہیں۔ ہمیں اکیلے ہی یہ جنگ لڑنی ہے اور ہمارے پاس اس سے پیچھے ہٹنے کا آپشن موجود نہیں ہے۔[2]

---

1 ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، تاریخ اشاعت: نومبر ۲۰۰۲ء

2 روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، تاریخ اشاعت: ۲۲ تا ۲۴ جون ۲۰۱۸ء

دینی مدارس کے منتظمین، اساتذہ اور طلبہ کو اس بارے میں چوکنا رہنا ہوگا اور اپنے عقیدہ و ثقافت اور عملی دینی ماحول کو بچانے کے لیے خودداری، حوصلہ، دینی حمیت اور ایثار و قربانی کے ساتھ اس خطرناک چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا۔

علماء کرام بالخصوص نوجوان علماء کو تاریخ کے مطالعہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ عالمی تاریخ، مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ اور بالخصوص عالم اسلام کی تاریخ کے اہم مراحل سے ان کا واقف ہونا ضروری ہے۔ پھر ان تحریکات سے بھی انہیں باخبر ہونا چاہیے جو مختلف ادوار میں اہل حق اور علماء دین نے ملت کی آزادی اور دین کے تحفظ کے لیے برپا کی ہیں۔ جنوبی ایشیا میں ہمارے اکابر حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادہ کی خدمات، علماء دیوبند کی جدوجہد اور برطانوی استعمار سے آزادی کی تحریکات سے آگاہی کے بغیر تو ہم اپنے مشن اور اہداف کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہمارے بزرگوں نے حالات اور موقع محل کی مناسبت سے جدوجہد کے مختلف طریقے اپنائے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہیں:

- حضرت مجدد الف ثانی[1] نے اکبر بادشاہ کے ریاستی الحاد اور خود ساختہ دین الٰہی کے خلاف جدوجہد میں ارباب اختیار کی ذہن سازی، بریفنگ اور لابنگ کا طریقہ آزمایا ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔
- حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دہلی کی طرف جنوبی ہندوستان کے جنونی مرہٹوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لیے مقامی مزاحمتی قوتوں کو کمزور سمجھتے ہوئے افغانستان کے فرمانروا احمد شاہ ابدالیؒ سے مدد مانگی اور اسے حملہ کی دعوت دی، ان کی یہ تکنیک بھی کامیاب رہی۔
- برطانوی استعمار کے خلاف شہدائے بالاکوٹ اور ۱۸۵۷ء کے حریت پسند علماء اور ان سے قبل سراج الدولہؒ اور ٹیپو سلطانؒ نے عسکری مزاحمت کا راستہ اختیار کیا جس میں اگرچہ وقتی طور پر ناکامی ہوئی لیکن اس سے مستقبل میں حریت پسندوں کو راہنمائی اور حوصلہ ملا اور انہی کا مقدس خون تحریک آزادی کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔
- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے آزادی کی جدوجہد کے لیے عالمی سطح پر انگریز مخالف قوتوں سے رابطے قائم کیے اور جرمنی، جاپان اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے تحریک آزادی کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی مگر خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہوگئی البتہ حریت پسندوں کو جدوجہد کا ایک نیا راستہ اور اسلوب ملا۔
- کانگرس، جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں نے آزادی کے لیے دستوری اور سیاسی جدوجہد کا طریق کار اختیار کیا۔ ان میں جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام دینی جماعتیں تھیں۔ جمعیۃ علماء ہند کی

---

1 شیخ احمد سرہندی ابن شیخ عبد الاحد فاروقی المعروف مجدد الف ثانی، ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو پیدا ہوئے، دسویں صدی ہجری کے مشہور عالم تھے، آپ کے مشہور خلیفہ سید آدم بنوری ہیں، ۱۰ ستمبر ۱۶۲۴ء کو وفات پائے {ویکیپڈیا}

قیادت مسلکی حوالے سے خالص دیوبندی قیادت تھی جبکہ مجلس احرار اسلام میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام پر مشتمل قیادت نے ٹیم ورک کی صورت میں مشترکہ دینی قیادت کا عملی نمونہ پیش کیا۔

- یونان، ایران اور ہندوستان کے فلسفوں نے مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں دراندازی شروع کی، ان کے اثرات ہمارے ہاں پھیلنے لگے اور ان فلسفوں نے ہمارے عقائد کو متاثر کرنا چاہا تو اس وقت کے باشعور علماء اسلام امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابو منصور ماتریدیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ، امام ابن رشدؒ اور دوسرے اہل علم نے یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفوں پر عبور حاصل کر کے انہی کی زبان اور دلائل سے ان کا رد کیا تھا۔ ان فلسفوں سے آگاہی حاصل کی، ان پر عبور حاصل کیا اور ان فلسفوں کی زبان اور اصطلاحات استعمال کر کے انہی کے دلائل سے اسلام کی حقانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہ سب اہداف نہیں بلکہ طریقہ کار تھے، ان میں سے کوئی بھی حتمی اور قطعی نہیں تھا بلکہ یہ بات حالات پر منحصر تھی کہ کس وقت کون سا طریقہ کار دینی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ نوجوان علماء کو اس بات سے بھی باخبر ہونا چاہیے کہ آج دنیا پر مغرب کے سیکولر فلسفے کی حکمرانی ہے جس کی بنیاد مذہب سے لاتعلقی پر ہے، جس کی زبان انسانی حقوق کی زبان ہے ، آج کی اصطلاحات الگ ہیں، اسلوب مختلف ہے اور دلیل و منطق کے ہتھیار جداگانہ ہیں۔ ہمیں اس فلسفہ سے، اس کی اصطلاحات سے، اس کے اسلوب سے اور اس کے دلائل سے اسی طرح مکمل طور پر واقفیت حاصل کرنا ہو گی جس طرح ہمارے اکابرین نے حاصل کیا تھا۔

یہ آج کے دور کی چند اہم ضروریات اور چند ناگزیر تقاضے ہیں جن کی طرف مناسب توجہ نہ دینے کا ہمیں نقصان ہو رہا ہے اور ہم علمی، فکری اور تہذیبی محاذ پر کھلا میدان سامنے ہونے کے باوجود پیش رفت نہیں کر پا رہے۔ ان کی طرف دینی مدارس کو توجہ دینی چاہیے، دینی مدارس کا نصاب و نظام تشکیل دینے والوں کو متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ اصل ذمہ داری ان کی ہے لیکن اگر ان سے ہٹ کر بھی کچھ علمی ادارے اور فکری سوسائٹیاں ان ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کی کوشش شروع کر دیں تو کچھ نہ کچھ پیش رفت ضرور ہو گی اور شاید انہی کی کوششوں سے جمود کی اس دیوار میں کوئی روشن دان نمودار ہو جائے۔ [1]

---

1 ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، تاریخ اشاعت: نومبر ۲۰۰۲ء

علماء کی ذمہ داری :

عصر حاضر کے ان بڑے فکری چیلنجز اور رکاوٹوں کا مقابلہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ علمائے امت چونکہ حدیث کے مطابق انبیاء کے وارث ہیں، اس لیے ان کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمارے علماء کو پانچ میدانوں میں ان تھک محنت کی ضرورت ہے:

1۔اسلامی علوم میں کامل رسوخ ومہارت :

آج کے علماء کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی علوم میں مکمل مہارت اور کامل استعداد سے تہی دامن ہوتے ہیں جس کی بنا پر دور جدید کے فکری مسائل کا کماحقہ رد نہیں کر سکتے۔ آج اس امر کی ضرورت ہے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ اور دیگر علوم الیہ میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق استعداد پیدا کی جائے۔ اسلامی علوم پر مکمل گرفت ہی عہد حاضر کے پیدا کردہ اشکالات واعتراضات کے قابل اطمینان حل کا ذریعہ ہے۔ اس کے لیے جہاں نصاب میں قابل ذکر تبدیلیوں کی ضرورت ہے وہاں مدارس میں ایسی فضاء بنانی چاہیے جس میں طلباء کو نصابی کتب سے ہٹ کر دیگر مراجع تک رسائی ہو، اور خارجی مطالعے کا ایک حوصلہ افزا ماحول میسر ہو۔

2۔فرق وافکار کی تاریخی مطالعہ :

اسلامی تاریخ میں پیدا ہونے والے مختلف فرقے اور متنوع افکار کے حاملین افراد و گروہوں کی تاریخ کا مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔ خصوصاً ان فرقوں کے رد کے لیے اسلاف امت کے مختلف مناہج، طریقہ کار اور طرز تردید کا ایک ٹھوس مطالعہ کرنا چاہیے۔ فتنوں کے تعاقب میں اسلاف امت کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے فہم واجتہاد کی بنا پر مختلف طرز اپنائے۔ محدثین کا منہج الگ تھا، متکلمین کا طرز اور تھا، صوفیا کا طریقہ کار الگ تھا۔ پھر ان کے اندر قابل قدر شخصیات کے اسالیب مختلف تھے۔ ان سب سے باخبر رہنا ضروری ہے تاکہ موجود فتن میں مفید حل کی طرف رہنمائی مل جائے۔

3۔ مغربی فکر وفلسفہ سے واقفیت :

عصر حاضر کی جملہ فکری گمراہیوں کا شجرہ نسب کسی نہ کسی صورت میں مغربی فکر و فلسفہ سے ملتا ہے، اس لیے مغرب کا تحقیقی مطالعہ بھی بہت ضروری ہے اس سلسلے میں مغربی افکار کی تاریخ، اور ان میں حالات واسباب کی بنا پر متنوع تبدیلیوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ مغرب سے ناواقفیت بسااوقات فکری مسائل کو حل کرنے کی بجائے مزید الجھا دیتی ہے۔

4۔عالم اسلام کی احیائی وفکری تحریکات کا مطالعہ :

تقریباً پچھلے پانچ سو سال سے عالم اسلام روبہ زوال ہے اور مغرب ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس سلسلے میں عالم اسلام کے مختلف خطوں میں متعدد فکری واحیائی تحریکیں اٹھیں جن کا مقصد امت مسلمہ کو ان کا کھویا ہوا مقام دوبارہ دلانا تھا۔ ان تحریکوں کا ایک مبسوط مطالعہ ضروری ہے۔ ان کے بانیوں کے حالات، تحریکوں کے مد و جزر، نشیب وفراز اور ناکامی یا کامیابی پر منتج

ہونے کی وجوہات سے واقفیت ہونی چاہیے تا کہ موجودہ فکری چیلینجز سے نمٹنے میں ان غلطیوں سے بچنا آسان ہو جائے اور وہی غلطیاں دوبارہ نہ دہرائی جائیں جن کی وجہ سے کئی سو سال سے ہماری فکری و علمی تحریکیں ناکام ہوتی آ رہی ہیں۔

5۔ عصر حاضر کے اسالیب تحریر و تقریر اور جدید علوم سے واقفیت :

آج عمومی طور ہمارے علماء کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ تقریر و تحریر کے جدید اسالیب سے نابلد ہیں۔ آج کے محاورے، زبان، اصطلاحات اور جدید نسل کی علمی و ذہنی سطح کے مطابق دین اسلام کے ابلاغ و تفہیم سے قاصر ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی سے مانوس نسل جب خطباء کے سامنے بیٹھتی ہے تو ان کی زبان سمجھ آتی ہے نہ ان کے طرز و اسلوب سے مانوس ہوتے ہیں جس سے دوری میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ نئ علوم بالخصوص جدید علم سیاست، معیشت اور سوشل سائنسز کا ضرورت کے مطابق مطالعہ کرنا چاہیے، کیونکہ ان نئ علوم سے بے خبری بسا اوقات جدید نسل کے مسائل اور معاصر فکری آراء کو سمجھنے میں غلطی کا باعث بنتی ہے، اس کے لیے اصحاب مدارس اور دین اسلام کا درد رکھنے والے مخلص جدید تعلیم یافتہ حضرات کو مل کر ایک عام فہم نصاب بنانا چاہیے جن سے ان علوم و افکار کے مبادیات سے بقدر ضرورت واقفیت میں مدد ملے اور وہ مزید مطالعہ و تحقیق کے بل بوتے پر ان علوم میں مہارت اور گہرائی پیدا کرنے پر قادر ہوں۔[1]

آج کے انسانی معاشرہ میں ہمارا تعارف کیا ہے؟ تا کہ ہم اس کے مطابق اپنا مقام و حیثیت صحیح طور پر سمجھ کر ذمہ داریوں کا تعین کر سکیں۔ ہمیں آج کے قومی بلکہ عالمی معاشرہ میں دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، اسلام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور جب ہم خود کو انبیاء کرام علیہم السلام کا وارث کہہ کر اپنے فضائل و مناقب بیان کرتے ہیں تو اس تعارف اور حیثیت کو مزید پختہ کر دیتے ہیں۔ ہم ایک ماحول میں کام کرتے ہیں اور ہماری سرگرمیوں کا دائرہ اپنا ملک، قوم اور علاقہ ہوتا ہے لیکن ہم پھر سے اپنے اس نقطۂ آغاز پر واپس جا چکے ہیں جب پیغمبر ﷺ نے صفا پہاڑی پر مکہ والوں کو جمع کر کے اپنے خطاب اور دعوت کا آغاز "یاآیہا الناس" سے کیا تھا۔ ہمارا اصل خطاب کسی قوم، علاقہ یا طبقہ سے نہیں ہے بلکہ نسل انسانی سے ہے۔ اور آج جب وطن و قوم، رنگ و نسل اور زبان و علاقہ کے فاصلے سمٹتے چلے جا رہے ہیں اور ایک گلوبل ہیومن سوسائٹی قائم ہو رہی ہے، ہمیں دین کی بات اسی "زیرو پوائنٹ" سے کرنا ہو گی اور اسے مؤثر بنانے کے لیے وہی کردار پیش کرنا ہو گا جس کی رسول اکرمؐ نے ہمیں ہدایت کی ہے۔

اس مجموعی صورتحال کو مد نظر رکھ کر میں کچھ مزید باتوں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ ہمارے کرنے کے کام کیا ہیں اور ہمارے لیے محنت و کاوش کے دائرے کونسے ہیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہیں:

---

1 محمد سمیع اللہ سعدی، ماہنامہ الشریعہ ۲۰۱۵، جامعہ فریدیہ اسلام آباد

پہلا دائرہ:

عام مسلمان کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق قائم رہے، مسجد کے ساتھ اس کا رابطہ موجود رہے اور اہل دین اور علماء کرام کے ساتھ اس کا میل جول باقی رہے۔ یہ دینی محنت کا سب سے پہلا اور وسیع میدان ہے اور یہ محنت کرنے اور جان کھپانے سے ہی ہو گا، خود بخود نہیں ہو جائے گا۔ اس محنت میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ دعوت و تبلیغ کی محنت کرنے والوں کو معاون بنا دیا ہے جو اللہ رب العزت کا بہت بڑا احسان و انعام ہے۔ وہ عام آدمی کو جس کا مسجد کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے گھیر گھار کر مسجد میں لے آتے ہیں، اور عام مسلمان کو جو علماء کرام کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتا اسے کسی نہ کسی طرح مسجد میں لا کر ہمارے پیچھے کھڑا کر دیتے ہیں اور اس کی زبان سے "پیچھے اس امام کے" کے الفاظ کہلا دیتے ہیں۔ مگر ہماری یہ بد نظمی اور بے ترتیبی ہے کہ مسجد میں آنے والے لوگوں کو سنبھالنے میں ہم وہ کچھ نہیں کر پا رہے جو ہمیں کرنا چاہیے بلکہ بعض مقامات میں ہمارے درمیان معاصرت اور غلط فہمیوں کا ماحول قائم ہوتا جا رہا ہے جس کی طرف توجہ کرنے اور اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہماری محنت و کاوش کا پہلا دائرہ ہے کہ عام مسلمان کا مسجد، نماز، قرآن کریم، علماء کرام اور دینی فرائض و احکام کے ساتھ تعلق قائم ہو اور جن لوگوں کا تعلق موجود ہے وہ قائم رہے۔[1]

دوسرا دائرہ:

جو لوگ دین سے تعلق رکھتے ہیں ان کی دینی تعلیم و تربیت کا نظام و ماحول قائم کیا جائے اور ان کی روحانی و اخلاقی تربیت کی طرف توجہ دی جائے۔ یہ وہ سطح ہے جسے ہم "ضروریات دین" کہتے ہیں اور ہر مسلمان مرد و عورت کے لیے اسے "فرض عین" قرار دیتے ہیں، یعنی عقائد، عبادات، فرائض، حلال و حرام، معاملات اور اخلاق و آداب کی وہ ضروری تعلیم جس کے بغیر کوئی مسلمان اپنے دین کے مطابق روزمرہ کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس کا ماحول ہمارے معاشرہ میں کس حد تک موجود ہے اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں اور ہم کیا کر سکتے ہیں!

تیسرا دائرہ:

دینی ضروریات کے لیے رجال کار کی تیاری اور فراہمی کا ہے۔ مسجد کے لیے امام، خطیب اور مؤذن کی ضرورت ہے، مکتب کے لیے حافظ اور قاری کی ضرورت ہے، مدرسہ کے لیے مدرس اور مفتی کی ضرورت ہے، دین کی عمومی تعلیم کے لیے اچھا لکھنے اور بولنے والوں کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت کافی حد تک دینی مدارس پوری کر رہے ہیں لیکن اس باب میں بھی ضروریات اور فراہمی کا پوری طرح جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ دینی مدارس کی عالمی سطح پر مخالفت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں

---

1 روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، تاریخ اشاعت: ۲۲ تا ۲۴ جون ۲۰۱۸ء

دینی تعلیم کا ماحول قائم رکھے ہوئے ہیں جو سیکولر فلسفہ و نظام کی ترویج میں رکاوٹ ہے لیکن دینی مدارس کا یہ کردار بہر حال قائم ہے اور ہمیشہ کے لیے رہے گا۔

چوتھا دائرہ:

ہمارا ایک امتیازی تعارف و تشخص بھی ہے جس کا قائم رہنا اور اس کا اظہار کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہم اہل سنت، حنفی اور دیوبندی ہیں، ہمیں اس پر فخر ہے اور یہ ہماری قوت اور کردار کی اساس ہے جسے قائم رکھنا اور اس کا اظہار ہماری ذمہ داری ہے، مگر یہ "لتعارفوا" کے درجہ میں ہے، اسے محاذ آرائی کی بنیاد نہیں بننا چاہیے۔ مسلکی امتیازات ضروری ہیں لیکن اپنے تعارف کے لیے، امتیاز کے اظہار کے لیے اور قوت و حوصلہ حاصل کرنے کے لیے، مگر انہیں معاشرتی محاذ آرائی اور تفریق کا ذریعہ بنانا درست نہیں ہے اور یہ بھی جدوجہد اور محنت و کاوش کا ایک اہم دائرہ ہے۔

پانچواں دائرہ:

معاشرہ میں غلط عقائد اور روایات کے خلاف جدوجہد کا ہے۔ مثلاً ختم نبوت کا انکار، حدیث و سنت کی حجیت سے انکار، حضرات صحابہ کرامؓ کے مقام و حیثیت کی نفی اور خلاف سنت رسوم و رواجات اور بدعات کا فروغ وغیرہ، ان کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کرنا اور صحیح عقائد و افکار کی تعلیم و ترغیب دینا ہماری ترجیحی ذمہ داری ہے۔[1]

چھٹا دائرہ:

آج کے مغربی فلسفہ و نظام نے اسلام کے بارے میں اور بہت سے اسلامی احکام و قوانین کے بارے میں نئی نسل کے ذہنوں میں جو شکوک و شبہات پیدا کر رکھے ہیں اور میڈیا اور لابنگ کے ذرائع سے ان شکوک و شبہات کا دائرہ دن بدن وسیع کیا جا رہا ہے، ان کا سامنا کرنا اور عام مسلمانوں بالخصوص نئی نسل کو ان کے جال سے نکالنا ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ آج کا سب سے بڑا فتنہ ہے اور ہماری اس طرف بالکل توجہ نہیں ہے۔ انسانی حقوق، مرد و عورت کی مساوات، آزادیٔ مذہب، آزادیٔ رائے اور لبرل ازم جیسے خوشنما عنوانات کے ساتھ جو علمی، فکری اور تہذیبی خلفشار مسلسل بڑھتا جا رہا ہے، اہل دین میں اس کا احساس تو ہے مگر شعور و ادراک نہیں ہے۔ ہماری ان مسائل میں تیاری نہیں ہے، تحقیق و مطالعہ نہیں ہے اور صحیح طور پر ان کا سامنا کرنے کا ذوق و اسلوب نہیں ہے۔ کوئی نوجوان کسی دانشور کی بات سے متاثر ہو کر ہمارے سامنے کسی شبہ اور شک کا اظہار کرتا ہے تو ہم اس کی وجہ سمجھنے اور اسے دور کرنے کی بجائے اس نوجوان کو ڈانٹ دیتے ہیں، اس پر کوئی فتویٰ صادر کر دیتے ہیں یا گول مول سا جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان تینوں صورتوں میں اس کا شک دور نہیں ہوتا بلکہ مزید پختہ ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اس فتنہ کا

---

1 روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، تاریخ اشاعت: ۲۲ تا ۲۴ جون ۲۰۱۸ء

شکار ہو کر خود اس کا داعی بن جاتا ہے۔ ہمیں اس صورتحال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا ہوگا اور خاص طور پر دینی جماعتوں، روحانی خانقاہوں، علمی مراکز اور مراجع کو اپنی حکمت عملی اور طریق کار کا از سر نو تعین کرنا ہوگا۔

ساتواں دائرہ:

شریعت اسلامی کے احکام و قوانین پر اعتراضات اور ان کی ضرورت و افادیت کی نفی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور بین الاقوامی اور قومی ماحول میں اس کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، جبکہ ان کے جوابات کے لیے کوئی اجتماعی کام نظر نہیں آرہا، افراد کی حد تک یہ محنت کسی درجہ میں موجود ہے مگر اداروں اور طبقات کی سنجیدہ توجہ نہیں ہے۔ یہ کام بھی بہت ضروری ہے اور ہم نے ہی کرنا ہے۔

آٹھواں دائرہ:

دین کی اجتماعی جدوجہد کا ہے، مثلاً دعوت و تبلیغ کا میدان ہے، دینی تعلیم و تدریس اور روحانی تربیت کے شعبے ہیں، نفاذ شریعت اور قومی سیاست میں اہل دین کی نمائندگی کی جدوجہد ہے، تحفظ ختم نبوت و ناموس رسالتؐ کا محاذ ہے، حضرات صحابہ کرامؓ کے ناموس اور مقام و حیثیت کے دفاع کا شعبہ ہے، اور بے حیائی و فحاشی کے سدباب اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کی محنت ہے وغیرہ، یہ سب دینی جدوجہد کے دائرے ہیں اور ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔[1]

اس حوالہ سے میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان اور بلکہ ہر عالم دین کو اس میں سے کسی شعبہ سے وابستہ ہونا چاہیے۔ کسی عالم دین کا دینی جدوجہد سے لاتعلق ہو جانا اور دین کے کوئی کام میں حصہ نہ لینا کبیرہ گناہ کا بھی اوپر کا کوئی درجہ ہے۔ علماء کرام کو ان میں سے کسی شعبے سے لازماً جڑ جانا چاہیے، جس شعبہ کا ذوق ہو اور جس محاذ پر کام کرنے کا رجحان ہو اسی میں کام کریں لیکن ایسا ضرور کریں، پیچھے نہ ہٹیں اور گریز نہ کریں، جبکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دین کے دوسرے کاموں کی نفی نہ کریں، ان کی تحقیر نہ کریں، ان کا مذاق نہ اڑائیں اور ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمارا عام طور پر یہ مزاج بن گیا ہے کہ دینی جدوجہد کے جس شعبے میں خود کام کر رہے ہیں بس اسی کی اہمیت و ضرورت بیان کرتے ہیں جبکہ دوسرے کاموں کی نفی کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، تخفیف و تحقیر کرتے ہیں اور ان کے خلاف لوگوں کے ذہن بنانے سے بھی باز نہیں آتے۔ یہ غلط بات ہے اس سے گریز کرنا ہوگا۔ اپنے ذوق و اسلوب کے شعبے میں خوب محنت سے کام کریں اور اس کے تقاضے پورے کریں لیکن اس کے ساتھ دیگر شعبوں اور ان میں کام کرنے والوں کا احترام کریں، باہمی احترام کا مجموعی ماحول پیدا کریں اور حسب ضرورت ان سے تعاون کریں، اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ کر سکیں تو ان کے بارے میں کم از کم خاموشی ضرور اختیار کریں جو میرے نزدیک ''اضعف الایمان'' کا درجہ ہے۔

---

1 روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، تاریخ اشاعت: ۲۲ تا ۲۴ جون ۲۰۱۸ء

فصل دوم: تجدید دین کے لیے جدید وسائل اور ان کا استعمال

بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں کو اگر سائنسی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی کے باب میں انقلاب کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اللہ نے عقل انسانی کو ایسے نئے آلات و وسائل ایجاد کرنے کی رہنمائی فرمائی جن کا کچھ سالوں پہلے تک تصور بھی ممکن نہ تھا۔اس انقلابی ترقی کے دور میں ہر میدان میں اور ہر قسم اور ہر طرح کے چھوٹے بڑے آلات ظہور پذیر ہوئے، لیکن میرے اس فصل میں میری گفتگو کا محور وہ جدید ترین ایجادات ہیں جن کا تعلق ذرائع ابلاغ، مواصلاتی نظام، آپسی روابط اور پیغام رسانی کے عمل اور اس کے تبادلے سے ہے، جیسے انٹرنیٹ، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور سٹیلائٹ ٹی وی چینلز فی الوقت یہی وسائل زیر بحث ہیں کیونکہ دعوتی نقطہ نظر سے انہی کی اہمیت زیادہ ہے،اور یہ کہ بقیہ متعلقہ وسائل جیسے کمپیوٹر، ٹی وی، وی سی آر، آڈیو کیسٹ، فیکس مشین، فوٹو کاپیر وغیرہ، خاصے عرصے سے استعمال میں لائے جا چکے ہیں۔انٹرنٹ، فضائی ٹی وی چینلز، سی ڈیز، ڈی وی ڈیز کا استعمال اس دور میں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے،اور ساری دنیا میں پھیل رہا ہے اسی لئے عصر حاضر کو الیکٹرونک میڈیا اور انفار مشین ٹیکنالوجی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنا پیغام چاہے وہ جس مقصد کے لئے ہو، پہنچایا جا رہا ہے۔انٹرنٹ اور ٹی وی چینلز نے تو خاص طور پر ساری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے، آپ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے ساری دنیا کے واقعات و حالات سے واقف ہو سکتے ہیں، بلکہ دنیا کے کسی کونے میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات کا براہ راست مشاہدہ کر سکتے ہیں،اور لمحہ بہ لمحہ تفصیلات جان سکتے ہیں، خاص کر انٹرنیٹ کے ذریعے جس طرح کی معلومات چاہیں، گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔

جہاں تک دعوتی مقصد کے لئے ان دونوں وسائل یعنی انٹرنٹ اور ٹی وی چینلز کے استعمال کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دونوں ہی نہایت کارگر اور مفید ہیں۔ہمیں رسول ﷺ کی امت ہونے کے ناطے اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ دین کی دعوت ساری دنیا کے لوگوں تک پہنچائیں، بلکہ ہمیں "خیر امت" یعنی بہترین امت کا خطاب اسی بنیاد پر دیا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو بہتر طور پر انجام دیں، اللہ کا ارشاد ہے

{كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ}[1]

ترجمہ: ”تم تمام امتوں میں سب سے افضل امت ہو جو لوگوں کے لیے بھیجے گئے ہو، اچھے کاموں کی تلقین کرتے رہو اور برے کاموں سے روکتے رہو۔“

1 سورۃ آل عمران ۳ : ۱۱۰

اگر ہم تجدید دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے انٹرنیٹ اور فضائی ٹی وی چینلز کا استعمال کما حقہ کر سکتے ہیں، تو بآسانی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور ایک ہی وقت میں دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں لوگوں کو مخاطب کر سکتے ہیں۔

کچھ لوگ ان وسائل کے سلسلے میں بے بنیاد شکوک وشبہات کے شکار ہیں اور انہیں استعماری طاقتوں کا حربہ، فسق وفجور کا آلہ اور گمراہ کن افکار و نظریات کا ذریعہ سمجھ کر یکسر رد کر دیتے ہیں، جب کہ ان کا یہ موقف کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ وسائل خود اپنی جگہ پر محض خیر یا شر کے لیے نہیں ہوتے، ان کے باعث خیر یا شر ہونے کا فیصلہ، جائز یا ناجائز کاموں میں اس کے استعمال سے ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ معاشرہ کو ان وسائل سے پاک نہیں کیا جا سکتا، اور اگر ہم انہیں خیر کے لئے نہیں اپناتے ہیں تو یہ محض دشمنان دین واخلاق کے لئے باطل و مذموم مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے رہیں گی۔ تیسری بات یہ ہے کہ وسائل کے باب میں اصل ان کا مباح ہونا ہے، اور اگر کسی شرعی غرض وغایت کے لئے ان کی افادیت ظاہر ہو جائے تو ان کا اختیار کرنا واجب ہے بشرطیکہ کوئی چیز ان کو مباح قرار دیئے جانے میں حائل نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اسلامی دعوت کی تبلیغ کے لئے زبان وبیان کے وہ سارے ذرائع استعمال کئے یا اجازت دی جو جاہلی معاشرہ میں رائج تھی، چاہے وہ خطابت ہو یا شعر ہو، یہاں تک کہ آپؐ ان کے میلوں اور بازاروں میں بھی تشریف لے گئے اور دین کی دعوت پیش کی۔ اس بنا پر یہ پورے اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے حکم کو بلند کرنے اور دین کو عام کرنے کے لئے انٹرنیٹ اور سٹیلائٹ ٹی وی کو کام میں لانا عصری تقاضوں کے عین مطابق اور وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ حق کی آواز ان بندوں تک بھی پہنچنا ممکن ہو جائے جنہوں نے اس کے بارے میں کبھی سنا نہ ہو، دین کے ساتھ محبت اور اخلاص رکھنے والے اور داعیان توحید، دونوں میدانوں میں نمایاں طریقہ پر کام کر رہے ہیں، لیکن ضرورت زیادہ شدید اور بڑی ہے اور اس کے مقابلے میں کام مختصر اور وسائل محدود ہے۔[1]

عصر حاضر میں جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال اسلام کی حسین و جمیل صورت کو مسخ کرنے کے لیے بھی کیا جا رہا ہے اس لیے مذہب اسلام کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ اس کی حمایت اور بیرونی حملوں سے اس کی حفاظت ہر دور میں مجموعی طور پر قوم پر واجب ہے۔ حالات وزمانے کے لحاظ سے اس فرض کی ادائیگی میں قدیم ذرائع کے ساتھ ساتھ جدید ذرائع ابلاغ کی شمولیت بھی ضروری ہے۔ عصر حاضر میں ان جدید وسائل کو دعوت و تجدید دین کے لیے استعمال کرنا نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

جدید وسائل میں تجدید دین کے لیے جو چیز سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہے میں مختصر انداز میں ان وسائل پر قرآن وسنت کی روشنی میں روشنی ڈالتا ہوں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہیں:

---

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبداللہ سلمان ریاض، بنگلوری

میڈیا:

میڈیا کی حیران کن ترقی نے دنیا بھر کی طرح پاکستان کو بھی شدید متاثر کیا ہے۔اس نے ہر معاشرے کی طرح ہمارے ہاں بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میڈیا کے طاقتور اثرات کے باعث کی وجہ سے معاشرتی رویے تبدیل ہوئے ہیں جبکہ اس نے بعض روایات کو بدلنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ میڈیا کے معاشرے پر بے پناہ اثرات کی وجہ سے ہی آج کے دور کو ذرائع ابلاغ کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی مختلف صورتیں ہیں۔الیکٹرانک میڈیا ٹی وی چینلز، سی ڈی اور دیگر ویڈیوز، براڈکاسٹ یعنی ریڈیو، سائبر میڈیا (انٹرنیٹ)، پرنٹ میڈیا (اخبار، رسائل وغیرہ) اسی طرح موبائل فونز اور دیگر ذرائع کے ذریعے پیغام رسانی بھی ذرائع ابلاغ کا حصہ ہیں۔ حکومتیں، ادارے، تنظیمیں اور مختلف افراد میڈیا کو اپنے پیغامات کی اشاعت، نظریات کے فروغ، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں حتی کہ بعض اوقات جنگی مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا میں میڈیا کو باقاعدہ منصوبہ بندی سے استعمال کرنے کا آغاز کئی دہائیاں پہلے ہو چکا تاہم ہمارے ہاں الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کی آمد کو ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں۔ یہ ایک نیا چیلنج ہے کہ جس نے ہمارے معاشرے کے دیگر طبقات کی طرح دینی حلقوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ میڈیا کی روایتی پریکٹس اور تفریحی مواد کی زیادتی کے باعث اسے اسلام اور سماج مخالف سمجھ لیا گیا ہے اور بہت سے حلقے تو تمام تر برائیوں کی جڑ میڈیا کو قرار دیتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ دینی حلقوں میں یہ بات سرایت کر چکی ہے کہ میڈیا ہمارے معاشرے میں الحاد، فحاشی، غیر اسلامی روایات اور ایسی ہی منفی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے تیار کردہ ایک سازش کا حصہ ہے اور اس سے صرف اور صرف وہی کام لیا جا سکتا ہے جو کہ آجکل پاکستانی، بھارتی اور مغربی میڈیا پر نظر آ رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ دینی حلقے اس سے دور نظر آتے ہیں۔ میڈیا کے خلاف تقاریر، تحریروں کی بھرمار ہے حتی کہ فتوے بھی سامنے آئے ہیں لیکن اس کے اثرات کم ہونے کی بجائے مزید بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ تاہم کچھ مخلص حلقوں نے میڈیا کے میدان میں دینی حوالے سے سرگرمی دکھائی ہے اور اسی لیے اب کہیں کہیں میڈیا کو سمجھنے اور اس کے درست استعمال کی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ حالات کی ٹھوکروں نے میڈیا کی اہمیت تو باور کرا دی ہے لیکن دینی طبقہ ابھی تک میڈیا کے بنائے ہوئے ماحول کو سمجھنے اور اس کی موجودہ پریکٹس میں اپنے لیے راہ تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر میڈیا ٹیکنالوجی کو دینی علوم رکھنے والے افراد مکمل پیشہ ورانہ اصولوں کے ساتھ استعمال کریں تو اسے تجدید دین کے لیے باآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہوائی جہاز آپ کو یورپ کے عشرت کدوں یا عیاشی کے اڈوں میں لے جا سکتا ہے اور وہی مکہ مکرمہ میں حج کے لیے بھی لے جا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ نے کونسی سمت منتخب کی ہے اور پائلٹ کو کیا ہدایات دی ہیں۔ میڈیا ٹیکنالوجی بھی ہوائی جہاز، موٹر کاروں اور دیگر سہولیات کی طرح ایک ایجاد ہی ہے۔ چند آلات بنائے گئے ہیں کہ جن کو پیغام رسانی، اپنے نظریات کے فروغ اور ان کو پھیلانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کریں گے تو یہ آپ کا نظریہ اور پیغام ہر سو پھیلا دے گا اور اگر اس سے دور رہ کر محض

تنقید سے کام چلانے کی کوشش کی تو یہ اتنا طاقتور ہے کہ آپ کی آواز کو گمنام بنادے گا یا آپ خود ہی اس کے اثرات کے سامنے خاموش ہو جائیں گے۔[1]

آج کے دور میں ہم میں سے کسی نے بھی ایسا شخص نہیں دیکھا ہو گا جو مکمل خلوص اور محض ثواب کے جذبے کے تحت حج پر پیدل جانا چاہتا ہو، علمائے کرام سمیت ہر کوئی جہاز یا اور کوئی تیز ترین ذریعہ استعمال کرے گا۔ آج ہم گاڑیوں، کمپیوٹرز اور ایسی ہی دیگر چیزوں سے صرف اس لیے دور ہونا پسند نہیں کریں گے کہ ان کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے، یہی حال میڈیا ٹیکنالوجی کا ہے۔ یہ تو دعوت کو تیز ترین طریقے سے بڑے پیمانے پر پھیلا دینے کا ہتھیار ہے۔ اگر ملحدین اپنا پیغام پھیلانے کے لیے ایسا مواد تیار کر سکتے ہیں کہ جو معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنے تو اسلامی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے بھی ایسا مواد تیار کیا جا سکتا ہے کہ جس سے عقائد پر بھی فرق نہ آئے اور دعوت و تجدید کا کام بھی ہو سکے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا استعمال سیکھ کر آلات کو مرضی کے مطابق چلانا سیکھا جائے۔ سوچ وبچار کے بعد اور بھرپور تیاری سے مواد کی تیاری کے لیے کام کیا جائے۔

اس مقالے کے ذریعے دینی طبقوں کو مخاطب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ ہی اشاعت اسلام کا بھرپور جذبہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے اپنا وقت اور توانائیاں صرف کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں دین کی جو رہی سہی جھلک نظر آتی ہے وہ مسجد و محراب کے ان وارثوں کی ہی وجہ سے ہے۔ مدارس کے پڑھے ہوئے علماء کرام ہی ہمارے معاشرے میں دین کے بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس مقالے کا مقصد صرف ان کو اس بات پر راضی کرنا ہے کہ میڈیا کو تنقید کا نشانہ بنانے کی بجائے اس کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ دعوت و تجدید کے جذبے سے ان آلات کو اپنی آواز کفر کے ایوانوں میں پہنچانے کے لیے تصرف میں لایا جائے۔ میڈیا سے دوستی ہمارے لیے انتہائی مفید ثابت ہو گی اور یہ ہماری دعوت و تجدید کو چہار سو پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ میڈیا کے درست استعمال کے حوالے سے درپیش مسئلہ کو سمجھنے اور اس کو حل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ یہ واضح ہے کہ اسلام گوشہ نشینوں اور تارک دنیا افراد کا دین نہیں ہے اس کے ماننے والے معاشرے کے فعال رکن بن کر جیتے ہیں، تو پھر کیوں دینی طبقہ کی جانب سے میڈیا کے میدان کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے ؟ سوال یہ ہے کہ کیا ابلاغ کا شعبہ معاشرے کی تشکیل میں شامل نہیں ہوتا؟ دینی دعوت کا کام سرانجام دینے والے لوگ اور تنظیموں کو اس کے بارے میں غور کرنا چاہیے۔ یہ فرض تو نہیں ہے کہ محض یونیورسٹیز میں ماس کمیونیکشن کرنیوالے طلبہ جو کہ ملکی نظام تعلیم کی خرابیوں کے باعث دین کا کچھ زیادہ نظریاتی علم ہی نہیں رکھتے وہ ہی میڈیا کے میدان میں سب کی رہنمائی کریں گے۔ دینی طبقوں کو ان سے معجزوں کی امید نہیں لگانی چاہیے۔ اس انتظار میں نہیں بیٹھنا چاہیے کہ یہ لوگ میڈیا کو ایسا بنادیں گے

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبداللہ سلمان ریاض، بنگالوری

جو کہ دین کی دعوت کے لیے اچھا ہو اور اس سے اسلام کی اشاعت ہو سکے، یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بغیر نظریاتی علم اور ٹھوس علمی بنیاد کے صرف پیشہ ورانہ علم ہی کافی نہیں ہوتا۔ اور میڈیا کی درست سمت کے تعین کے لیے دینی علم رکھنے والوں کو خود میدان میں آنا پڑے گا۔

اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ دینی علوم رکھنے والے افراد میڈیا کی جانب متوجہ ہوں۔ یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ میڈیا کا خود اپنا کوئی نظریہ نہیں ہوتا بلکہ اس کو چلانے والے اپنے خیالات عام کرتے ہیں۔ اگر دینی لوگ اس کی باگ دوڑ سنبھالیں گے تو یقیناً اسے ہدایت کا سرچشمہ بنایا جا سکتا ہے اور اگر کم دینی علم رکھنے والے یا بالکل ہی نابلد لوگوں کے ہاتھ میں میڈیا کی طاقت دے دی جائے تو پھر یقیناً یہی کچھ ہوگا کہ جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ یونیورسٹیز کے طلبہ کے پاس اچھی دینی معلومات تو ہو سکتی ہیں لیکن نظریاتی حدود کا خیال اور معاشرتی تبدیلیوں کی دینی لحاظ سے درست سمت کا تعین وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جنھوں نے باقاعدہ دینی علوم حاصل کر رکھے ہوں۔ میری مراد مدارس کے پڑھے افراد ہیں اور وہ علماء جو اصل دینی مصادر سے استفادہ کرتے ہیں۔ احادیث کے علوم سے واقف ہیں جبکہ غلط عقائد اور خالص اسلامی حکم کے درمیان فرق کر سکتے ہیں۔ میڈیا کو تو اچھے بولنے والے چاہیے۔ یہ واقعی المیہ ہے کہ اس وقت جو دینی پروگرام پیش کیے جا رہے ہیں ان میں ٹھوس دینی علم رکھنے والوں کی بجائے نیم دینی علم رکھنے والے لوگ غالب ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مستند دینی حلقے اچھے اینکر اور ٹی وی پر اچھے بولنے والے افراد فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ میدان جاوید غامدی اور ڈاکٹر عامر لیاقت جیسے لوگوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ اب دینی پروگراموں کو اپنے طریقے سے چلا رہے ہیں اور یہی حال ویب سائٹس، ایف ایم ریڈیوز وغیرہ کا بھی ہے۔ اسی طرح دینی طبقات میں اچھی کتابیں لکھنے کا رواج تو عام ہے لیکن میڈیا کے لیے مضامین نہیں لکھے جاتے [1]۔

ہمارے ہاں حالات حاضرہ کو دینی نقطہ نظر سے زیر بحث لانے کا انتظام نہیں ہے۔ ہمیں ایک ایک سو یا اس سے بھی زیادہ کتابیں لکھنے والے علمائے کرام تو مل جائیں گے لیکن کالم نگار، فیچر نگار علماء کی تعداد انتہائی کم ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علماء کی کتابیں انہی کے حلقے کے لوگ تو ضرور پڑھتے ہیں یا پھر اچھا ادبی ذوق رکھنے والے طبقے بلکہ اس میں مسلک اور جماعت کی تفریق بھی حائل ہو جاتی ہے، جبکہ اگر یہی علماء اچھے انداز سے میڈیا میں اظہار خیال کریں۔ کالم لکھیں، معاشرتی مسائل پر فیچر لکھیں تو نہ صرف زیادہ بڑا طبقہ مستفید ہوگا بلکہ لوگ دعوت و تجدید کی طرف مائل بھی ہوں گے۔ حالات حاضرہ کو دینی نقطہ نظر سے زیر بحث لانے سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ علمائے کرام کے بارے میں عام تاثر بھی دور ہوگا کہ یہ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔

---

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبداللہ سلمان ریاض، بنگالوری

ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا یعنی ٹی وی، فلم اور دیگر ویڈیوز کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا ذرائع ابلاغ کا ایک طاقتور حصہ ضرور ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کے بغیر پیغام رسانی اور نظریات کا فروغ ہی ممکن نہیں ہے، ویسے تو بہت سے دینی حلقے کچھ حدود و قیود کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا کے قائل ہو چکے ہیں لیکن اگر کوئی جماعت اس کے بغیر ہی چلنا چاہے تو بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں آنے کے لیے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے کیونکہ دعوت کے لیے موجودہ رائج الوقت طریقے کارآمد نہیں ہوں گے۔ دینی جماعتوں کو چاہیے کہ الیکٹرانک میڈیا میں زور آزمائی سے پہلے پہلے دیگر شعبہ جات یعنی پرنٹ میڈیا (اخبارات ورسائل)، سائبر میڈیا یعنی انٹرنیٹ وغیرہ میں زیادہ کام کریں۔ کچھ عرصہ کی مکمل پیشہ ورانہ تربیت کے بعد الیکٹرانک میڈیا کی طرف آیا جائے، کیونکہ یہ ایک مہنگا کام ہے اس لیے بغیر پیشہ ورانہ تربیت کے فنڈز ضائع ہونے کا بھی خدشہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انٹرنیٹ، پرنٹ میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں اور اگر ان کو مکمل پیشہ ورانہ اصولوں سے استعمال کیا جائے تو ان سے انتہائی مفید نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ روایتی طریقوں سے ہٹ کر اس شعبے کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ پروپیگنڈا کرنا ایک مکمل سائنس کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور اس کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے۔ ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ ''پروپیگنڈا'' کے لفظ کو بھی میڈیا کی طرح صرف منفی معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ اس سے مراد پیغام کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دینا ہے، یعنی دعوت کو عام کرنا۔ یہ منفی اور مثبت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دعوتی سرگرمیوں سے منسلک علماء کرام کو ان سے متعلق جاننے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔ انتہائی سستے طریقے موجود ہیں کہ جن کے ذریعے آپ اپنی بات سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں تک بآسانی پہنچا سکتے ہیں۔ سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس، ای میلز، ڈیلی نیوز لیٹر، بلاگس، ویب سائٹس اور ایسی بہت سے چیزوں کے استعمال سے دعوتی سرگرمیوں ملکی بلکہ عالمی سطح پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ اخبارات میں اچھے لکھنے والوں کے لیے ابھی بہت گنجائش موجود ہے جبکہ الیکٹرانک میڈیا میں اچھے بولنے والوں کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ صرف اچھے رابطے کے ذریعے میڈیا گروپس سے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں دینی طبقہ کے میڈیا کے میدان میں زیادہ اثر ورسوخ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی جماعتوں، ذیلی تنظیموں، بڑے دینی اداروں وغیرہ کے شعبہ اطلاعات سے منسلک افراد بھی میڈیا کی ورکنگ سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے اور شاید بہت سے مواقع پر تو اس عہدے کو صرف خانہ پوری سمجھا جاتا ہے۔ آج کے دور میں یہ انتہائی اہم عہدہ ہوتا ہے۔ دینی جماعتیں کسی اہم اور نامور عہدیدار کو ہی ترجمان اور اطلاعات کے شعبے کا انچارج مقرر کرنا پسند کرتی ہیں۔ اگر کسی بڑے نام کو ہی ترجمان مقرر کرنا مقصود ہو تو بھی کم از کم اس کی مدد کے لیے ہی کسی پروفیشنل کو مقرر کر دیں۔ ہم زندگی کے دیگر شعبوں میں ٹیکنکل کاموں کے لیے ہنر مند افراد کی مدد لینا پسند کرتے ہیں، لیکن شاید میڈیا کے لیے اس اصول کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ہم اپنی گاڑی کا ڈرائیور یا عمارت کا معمار بھی محض تعلق کی بنا پر مقرر کرنا پسند نہیں کریں گے، کیونکہ ہمیں پتہ

ہے کہ اگر ایسا کیا تو اناڑی ڈرائیور ضرور حادثہ کرادے گا اور اگر معمار ہنر مند نہ ہوا تو عمارت کو اس طرح بنائے گا کہ وہ جلد گر جائے گی۔ شعبہ اطلاعات اور تعلقات عامہ کو مضبوط اور ماہر افراد کی زیر نگرانی ہونا چاہیے کیونکہ اس کا درست استعمال آپکی دعوت کو زیادہ تیزی سے عام کرے گا۔ ہر ہر موقع پر مکمل منصوبہ بندی کی جائے کہ کس مسئلے پر کیا طریقہ کار اختیار کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ دینی جماعتوں کے شعبہ اطلاعات سے منسلک افراد یقینا مخلص ہوتے ہیں اور اپنے طور پر بھرپور کوشش بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مطلوبہ نتائج صرف اس لیے حاصل نہیں ہو پاتے کہ منصوبہ بندی اور پیشہ ورانہ مہارت کی کمی ہوتی ہے [1]۔

اس کے علاوہ بہت سی دینی جماعتوں اور رہنماوؤں کو یہ اعتراض بھی ہے کہ میڈیا انہیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور اس کا زیادہ فوکس سیاست اور دیگر تفریحی مواد کی طرف ہوتا ہے، اس اعتراض سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آج تک کسی دینی جماعت نے میڈیا کی تربیت کے حوالے سے کوئی ادارہ قائم نہیں کیا۔ میڈیا میں موجود افراد سے تعلقات بڑھانے اور ان تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے کسی قسم کی کوشش نہیں کی گئی۔ دینی جماعتوں نے باقاعدہ طور پر کوئی ایسے افراد تیار نہیں کیے ہیں جو کہ میڈیا پر مخالفانہ پروپیگنڈے کا جواب دے سکیں۔ میڈیا کے لیے مواد کی فراہمی اور موجودہ پیش کیے جانیوالے مواد کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں متبادل فراہم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ جب کچھ بویا ہی نہیں گیا تو کیا کاٹنے کی امید کی جارہی ہے۔ اگر آج میڈیا پر لادینیت اور سیکولرازم غالب نظر آتا ہے اور ایسی چیزوں کی بہتات ہے جو کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عالمی سطح پر اسلام مخالف اداروں نے اس کے لیے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ ایسے ادارے موجود ہیں کہ جو مکمل منصوبہ بندی کے زریعے میڈیا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ریسرچ سینٹرز قائم کیے گئے ہیں، سروے رپورٹس اور انکشافات کے زریعے میڈیا کو ایک خاص لائن فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام مخالفت ادارے میڈیا سے منسلک ہنر مند اور تجربہ کار افراد کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور ان کی رہنمائی میں ایسا مواد تیار کیا جاتا ہے جو کہ بظاہر تفریح، کھیل یا کسی بھی اور مقصد کے لیے ہوتا ہے لیکن اس کا پوشیدہ مقصد معاشرے میں لادینیت پھیلانا ہے۔ میڈیا پر اس مواد کی اشاعت کے لیے سپانسرز ڈھونڈے جاتے ہیں اور ایک نیٹ ورک کے ذریعے اس کو عام کر دیا جاتا ہے۔ ہیری پوٹر سیریز اور انڈین چینلز کے ڈرامے اس کی مثال ہیں۔ ہیری پوٹر سیریز میں جادو وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے، اس کی کتاب مارکیٹ میں آتی ہے، چینلز اس کی کوریج کرتے ہیں، پھر فلم بنائی جاتی ہے، ملٹی نیشنل کمپنیاں اس کی مشہوریاں بناتی ہیں، اس نام کے کھلونے اور دیگر سرگرمیاں سامنے آتی ہیں، یہاں تک کہ ایک مکمل منصوبہ بندی کے زریعے اسے پوری دنیا میں زبان زدعام بنا دیا جاتا ہے۔ یہی حال انڈین ڈراموں کا ہے، ان میں ہندو مذہب

---

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبداللہ سلمان ریاض، بنگالوری

کی بھرپور تبلیغ کی جاتی ہے، خواتین کے لباس کے ایسے ڈیزائن متعارت کرائے جاتے ہیں کہ جو بے حیائی کا باعث ہوں۔ تاجر فوری طور پر اس قسم کے ڈیزائن کردہ لباس بازار میں لے آتے ہیں اور اس طرح ایک منصوبہ بندی کے زریعے مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر ہمیں میڈیا کو دعوت و تجدید اور اسلامی روایات کے فروغ کے لیے استعمال کرنا ہے تو اس کے لیے اسی قسم کی منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ دینی جماعتوں کو میڈیا کے میدان میں کچھ بونے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی فصل معاشرے میں پھیلنے والے اثرات کی صورت میں کاٹ سکیں۔ مسئلے کو صرف محفلوں میں زیر بحث لانا اور " استغراللہ" اور "نعوذ با اللہ" کا ورد کرتے ہوئے میڈیا میں کام کرنیوالوں کو بے دین اور اسلام مخالف قرار دینا بھی مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس سے پریشانی حل نہیں ہوگی بلکہ خلیج بڑھتی جائے گی[1]۔

اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ میڈیا میں کام کرنیوالے بہر حال مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے اور ہمارے اسی مسلم معاشرے میں ہی پروان چڑھے ہیں۔ ان میں سے کسی کا بھی تعلق بھارت یا ہندوازم سے نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تربیت امریکہ، یہودی تنظیموں یا اسلام مخالف گروہوں میں سے کسی نے کی ہے۔ یہ اسی معاشرے کے ایسے افراد ہیں کہ جنہیں نظام تعلیم کی خرابی، دینی طبقے سے رابطے کے فقدان، مخصوص معاشرتی معاشرتی ماحول اور دیگر عوامل نے موجودہ مقام تک پہنچادیا ہے ۔ ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ انہیں دینی طبقہ میڈیا کے میدان کوئی خاص رہنمائی فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے اور اب یہ لوگ مغرب اور بھارتی ثقافت میں رنگے نظر آتے ہیں۔ دینی جماعتیں اور حلقے یہ ہی کیوں چاہتے ہیں کہ سب لوگ خود بخود ہی چل کر ان کے پاس آئیں اور آکر رہنمائی کی درخواست کریں۔ اس بات پر کیوں غور نہیں کیا جاتا کہ دعوت و تجدید کا فریضہ تو بہر حال آپ کو ہی سرانجام دینا ہے۔ اگر آپ اپنی دعوتی سرگرمیوں کو اچھے طریقے سے سرانجام دیں گے اور مضبوط نیٹ ورک بنائیں گے تو معاشرے کا بڑا طبقہ بشمول میڈیا آپ کے ساتھ چلے گا اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو یقینا مخالفین حاوی نظر آئیں گے اور محض مساجد میں دیئے گئے وعظ اور خطبات کام نہ آسکیں گے۔ اس مقالے کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ نظریات کے اس تصادم میں اسلام کی دعوت کے امین اور صاحب علم دینی حلقوں کو کچھ زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے اور خاص کر میڈیا کے میدان میں بہت زیادہ ضرورت ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی سنجیدہ کوشش ہوئی تو یہی نوجوان نسل کہ جسے دین بیزار سمجھ لیا گیا تھا وہ ہی ہراول دستہ ثابت ہوئی۔ کشمیر اور فلسطین کی تحریک آزادی میں یونیورسٹیز کے طلبہ کا ایک بڑا کردار ہے۔ انٹرنیٹ پر دعوت میں بھی بڑا حصہ ایسے افراد کا ہے جو کہ شاید کبھی کسی مدرسے نہ گئے ہوں۔ یہ علماء کرام کی کتابوں کی تشہیر کرتے ہیں اور

---

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبداللہ سلمان ریاض، بنگالوری

مطالعہ کرکے دلائل ڈھونڈتے ہیں۔ دینی طبقے کو میڈیا سے منسلک افراد سے رابطے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ دینی اور نظریاتی افراد کو بھی پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر کے میڈیا کے اداروں میں داخل کرایا جاسکتا ہے۔

ہمیں میڈیا کے میدان میں ذرا تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ بالکل کام ہی نہیں ہو رہا۔ بہت سے حلقے کوششیں کر رہے ہیں اور ان کے کچھ مفید نتائج بھی نکلے ہیں، مسلہ صرف یہ ہے کہ کام منظم نہیں ہے۔ ایسا سمجھ لینا کہ لوگ میڈیا کے زریعے دین کی دعوت کو سننا ہی نہیں چاہتے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ یہ میڈیا ہی ہے کہ جس کے ذریعے آج ڈاکٹر ذاکر نائیک اور مولانا سید توصیف الرحمٰن شاہ کی دعوت و تجدید عام ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر فرحت ہاشمی عالمی سطح پر پہچان رکھتی ہے۔ بہت سی اسلامی تنظیموں نے ایسا مواد تیار کیا ہے جو کہ واقعی پر کشش ہے اور اس کی وجہ سے ہی بہت سے لوگ مسلمان بھی ہوئے۔ انٹرنیٹ دعوت کا بہت بڑا ذریعہ بن چکا ہے اور یورپ و امریکہ میں اتنے لوگ اس کے ذریعے مسلمان ہوئے ہیں جن تک پہنچنا شاید ویسے ممکن ہی نہ ہوتا۔ ایک رپورٹ کے مطابق سعودی عرب کی موبائل ایس ایم ایس سروس سے کئی ہزار لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔ فلسطینی تنظیم حماس اور لبنان میں حزب اللہ نے اپنے مقاصد کے لیے میڈیا کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے متعدد مواقع پر یہودی اور مغربی میڈیا کو شکست دی ہے۔ یہ لوگ انتہائی مہارت سے میڈیا کو اپنے حق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایران میں بھی میڈیا کی روایتی پریکٹس سے ہٹ کر متبادل فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اگر یہ سب منظم طریقے سے ہونے لگے تو کافی زیادہ اچھے نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ وقتی طور پر کسی گروپ کا غلبہ دیکھ کر پریشان نہ ہوا جائے۔۔ ایسا تو انبیاء کے دور میں بھی نہیں ہوا کہ سب لوگ ہی ہدایت یافتہ ہوگئے ہوں۔ یہ مقابلے کی دنیا ہے، ہر گروہ کو اپنا اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔ میڈیا معاشرتی تبدیلی کا طاقتور ترین ہتھیار ہے اور دعوت و تجدید کے میدان میں اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس لیے دینی طبقے کے لیے ضروری ہے کہ میڈیا سے دور رہنے کی پالیسی کو دور کرتے ہوئے اسے اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوششوں کا آغاز کریں۔[1]

انٹرنیٹ:

انٹرنیٹ دراصل کئی چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر نیٹ ورک اور مواصلاتی نظام کا مجموعہ ہے، اس کے ذریعہ لمحوں میں دنیا بھر کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہے اور اس نظام سے منسلک ہر کمپیوٹر والے سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے ، یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انٹرنیٹ کمپیوٹر کا ایسا سیٹ اَپ ہے جس کے ذریعہ اور مصنوعی سیاروں کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک کیا جاتا ہے۔

انٹرنیٹ دنیا کا سب بڑا کمپیوٹر نیٹ ورک ہے جس سے تقریباً 120 ملکوں کے 50 میلین یا 5 کروڑ افراد براہِ راست جڑے ہوئے ہیں۔

---

1 ۶ دسمبر ۲۰۱۰، محمد عاصم

اس ترقی یافتہ دور میں جہاں کمپیوٹر ہر انسان کی ضرورت بنتا جا رہا ہے وہاں انٹرنیٹ کی اہمیت وافادیت سے کوئی نابلد نہیں ہے چند فوائد مندرجہ ذیل ہیں۔

- **الیکٹرانک میل:** عام روایتی ڈاک کے برعکس ای میل کے ذریعے دور دراز کے ممالک میں اپنے احباب کو نہایت سستے اور سرعت کے ساتھ اپنے پیغامات دنیا کے کسی بھی گوشے میں بھیج سکتے ہیں۔
- **ورلڈ وائڈ ویب:** یہ انٹرنیٹ کی دوسری سب سے اہم خاصیت ہے۔ جس کی مدد سے آپ گھر بیٹھے ہی دنیا بھر کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً کسی بھی ملک کی یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات میں ڈگریوں کی تفصیلات، کورسیس کی معلومات، کمپنیوں کے اور دنیا کے کسی بھی کونے کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔
- **سرچ انجن:** انٹرنیٹ کا پتہ معلوم نا ہونے پر کسی خاص موضوع کو تلاش کرنے کے لیے انٹرنیٹ پر کئی سائٹس موجود ہیں۔ جن پر کسی مخصوص موضوع یا مواد یا معلومات کو تلاش کیا جاتا ہے اسے سرچ انجن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
- **انٹرنیٹ ٹیلیفون:** آپ آئی ایس ڈی (ISD) کی بجائے انٹرنیٹ فون پر انتہائی سستے داموں میں بیرون ملک میں رہنے والے اپنے عزیز واقارب سے کئی کئی منٹوں بلکہ گھنٹوں باتیں کر سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے افسران اپنا آفس چھوڑے بغیر کمپیوٹر کے ذریعہ مختلف ممالک میں اپنے افسران سے میٹنگ کرتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے استعمال سے میڈیکل سائنس کے شعبے میں خاصی ترقی ہوئی ہے، انٹرنیٹ پر مختلف کالجوں کی معلومات، ان کے نصاب کی تفصیلات، داخلے کا طریقۂ کار و فارم، درسیات کی تفصیل اور اسکالرشپ کی معلومات وغیرہ موجود ہیں۔ مریضوں کی تشخیص اور علاج ومعالجہ کرنا، یہاں تک کہ جنگ کے زمانے میں سینکڑوں میل دور بیٹھے سرجن کی مدد سے میدان جنگ میں ابتدائی طبّی امداد دے کر کئی جانیں بچائی جا سکتی ہیں۔ امریکہ میں ایک نئے دفتری نظام کے تحت ملازمین کو آفس میں آنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، یہ ملازمین اپنا کام گھر بیٹھے انجام دیتے ہیں اور پھر آفس کے کمپیوٹر پر منتقل کر دیتے ہیں۔ اس سے کمپنی کو بہت بڑا دفتر بنانے، دیکھ بھال پر اخراجات کرنے کی بچت ہوئی، ساتھ ہی ملازمین کا دفتر پہنچنے کا وقت بھی بچا ہے، ٹرانسپورٹ کی تکلیف، ٹریفک کی بدنظمی اور ماحولیاتی آلودگی میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔

بہت ساری کتابیں، ڈکشنریاں، انسائیکلوپیڈیا اور ریسرچ جرائد بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں جن کی مجموعی تعداد ایک بہت بڑی لائبریری سے بڑھ کر ہے، کچھ ویب سائٹس ایسی ہیں جن پر لاکھوں کی تعداد میں مختلف زبانوں پر کتابیں موجود ہیں۔ مارکیٹ جانے کے بجائے اپنے گھر میں انٹرنیٹ پر بیٹھے بیٹھے خریداری کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر آپ سفر کا پروگرام، روٹ کا انتخاب، ہوٹل بک کرانا اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی کنفرم کروا سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ بین الاقوامی مددگاروں کا ایک گروپ ہے جو دنیا کے ہر موضوع پر آپ کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔ پیشہ ور ماہرین کے لیے یہ سونے کی کان ہے جس کے ذریعے مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے اپنے پیشے کے متعلق انٹرنیٹ پر خرید وفروخت کرتے ہیں۔

اللہ نے انسان کے اندر بے پناہ تخلیقی قوتیں ودیعت کی ہیں، ان قوتوں کی وجہ سے ہر روز نئے آلات وجود میں آرہے ہیں۔ یہ آلات اچھے کاموں میں بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں اور برے کاموں میں بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں، ان آلات کا اچھے کاموں کے لیے استعمال اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال باعث شکر وامتنان ہے اور ان کا غلط استعمال کفرانِ نعمت، باعث ذلت اور سببِ فتنہ وفساد ہے۔

انٹرنیٹ ایسے ہی جدید آلات میں سے ایک ہے جس کے ذریعے چند ابلیسی ذہن کے حامل افراد صحیح افکار وخیالات کی ترویج، علمی وفنی معلومات کی اشاعت، تعلیمی اور تحقیقی میدان کو وسعت دینے کے بجائے فحاشی، عریانیت، باطل خیالات، غلط افکار کی ترویج اور خدا بے زار معاشرے کی تشکیل میں سرگرداں ہیں۔ماہرین نفسیات نے انٹرنیٹ کے ذریعے فحاشی اور جنسی رجحان کے فروغ سے نئی نسل کی اخلاقی قدروں کی تباہی کی نشاندہی کی ہیں۔ماہرین کا کہنا ہے کہ 15 فیصد سے زائد افراد انٹرنیٹ پر جنسی مواد اور عریاں تصاویر سے دل بہلاتے ہیں۔ 9 فیصد برطانوی فی ہفتہ گیارہ گھنٹے جنسی تصاویر دیکھتے ہیں۔ سائبر کیفے کے مالکان نے ہر کمپیوٹر کے لیے علیحدہ کیبن بنا رکھا ہے جہاں نوجوان لڑکے، لڑکیاں اسکولوں، کالجوں کو الوداع کہہ کر کئی کئی گھنٹے چیٹنگ اور نفس انسانی کو متحرک کرنے والی ویب سائٹس سے ذہنی اور نگاہوں کی عیاشی کرتے ہیں۔

۲۰۰۲ء کے سروے کے مطابق ایک انٹرنیٹ کلب کی ایک روزہ ڈائرکٹری دیکھی گئی جس میں 80 فیصد کام صرف غیر اخلاقی ویب سائٹس دیکھنے کے حوالے سے کیا گیا تھا۔ باضابطہ کئی سائبر کیفے کے مالکان نے فحش وغیر اخلاقی ویب سائٹس کی فہرست تیار کی ہیں جو ڈیمانڈ پر اپنے گاہکوں کو فراہم کی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ کے نقصانات، فواحشات اور غیر اخلاقیات کو دیکھ کر اس پر کفر کا فتویٰ لگادینے سے کام نہیں چلے گا، '' انٹرنیٹ کا استعمال ممنوع ہے'' کا نعرہ بلند کرنے سے بھی بات نہیں بنے گی اور نہ ہی کمپیوٹر توڑ ڈالنے سے ہمارے مسائل حل ہوں گے بلکہ ہمیں بھی اپنی حکمت کو جدید خطوط پر استوار کرنا ہوگا تاکہ انٹرنیٹ کے اس ذریعے درپیش چیلنج کا مقابلہ کیا جاسکے۔

ہمارا یہ دور سائنسی انکشافات اور ترقیات کا دور ہے۔انٹرنیٹ بھی ایک جدید شئے ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ دعوت وتجدید دین کے دیگر ذرائع سے منہ موڑ کر خالص انٹرنیٹ پر ہی اسلام کی تبلیغ کی جائے مگر اس نہج پر بھی کام کرنا انتہائی ضروری ہے، اس لیے کہ بنیادی طور پر میڈیا کی دو قسمیں ہیں۔پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا۔الیکٹرانک میڈیا میں دعوت وتجدید دین کے لیے انٹرنیٹ سب سے مؤثر وسیلہ ہے۔اس کے ذریعہ ہم تقریباً پونے دوسو ملکوں میں کروڑوں افراد تک بیک وقت اپنی دعوت، اپنے خیالات اور افکار ونظریات کو پہنچا سکتے ہیں۔اگر اب بھی ہم نے دعوت کی راہ میں جدید تقاضوں سے دوری بنائے رکھی تو اس کے بھیانک نتائج ہمیں صدیوں بھگتنے ہوں گے، جیسا کہ یورپ ودیگر براعظموں میں صنعتی انقلاب رونما ہورہے تھے، جدید علوم پر ریسرچ کی جارہی تھی۔زمانہ تحقیق کی شاہراہوں پر گامزن تھا اس وقت ہمارے حکمراں امام باڑے، چارمینار، قطب مینار، گول گنبد اور تاج محل بنانے میں مصروف تھے۔ جس کے نقصانات دانش ور، مفکرین اور ارباب فکر ونظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔اگر

اب بھی ہم روز مرہ کی ایجادات وانکشافات کو اچھوت سمجھ کر گھر بیٹھے منہ تکتے رہے یا محض کچھ وہمی امور کا سہارا لے کر ''کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے''اس کام کو روکنا مناسب نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ کوئی بھی سائنسی ایجاد بذات خود جائز یا ناجائز نہیں ہوتی، بلکہ اس کے استعمال کی نوعیت اس کو جائز و ناجائز بناتی ہے، بالکل اسی طرح انٹرنیٹ کا غلط استعمال ناجائز ہوگا اور اس کے ذریعہ دین وملت کی اشاعت مقصود ہو تو جائز ہی نہیں بلکہ امر مستحسن ہوگا اور یہ بات بھی تسلیم کرکے چلنا چاہیے کہ سب لوگ صرف گانا بجانا چاہتے ہیں ایسا نہیں ہے، بہت سے سلیم الطبع افراد اپنے ذہنی الجھنوں کا حل چاہتے ہیں۔ایسے لوگ نشریاتی پیغامات یا انٹرنیٹ کے ذریعہ اسلام کی سچائی تک پہنچ سکتے ہیں اور پہنچتے ہیں اگر ان کو صحیح رہبری ور ہنمائی میسر آجائے۔

۲۰۰۲ء میں انٹرنیٹ پر ساڑھے چار لاکھ سے زائد مذہبی ویب سائٹس تھیں جن میں تقریباً دولاکھ ویب سائٹس عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مخصوص تھیں۔مذہب اسلام کی اشاعت کے حوالے سے مشکل سے سے چند ہزار ویب سائٹس موجود تھی، جنہیں یا تو غیر مسلم افراد چلارہے تھے یا پھر ایسے لوگ اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کررہے تھے جنہیں خود بھی اسلام کے متعلق مناسب و موزوں معلومات حاصل نہیں۔اسلامک ویب سائٹس پر اکثر وبیشتر مقدس مقامات کی تصاویر اور تھوڑی بہت اسلامی تاریخ مل جاتی ہے۔اس کے برعکس یہود ونصاریٰ اپنی ویب سائٹس پر منصوبہ بند طریقے سے عصری علوم کا سہارا لے کر بڑے خوبصورت انداز سے اپنے مذہب کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں،انہوں نے اپنی ویب سائٹس پر کئی علوم پر مشتمل بہت ساری کتابیں،ڈکشنریاں،انسائیکلوپیڈیا اور ریسرچ جرائد اس قدر مہیا کردئے ہیں کہ بڑی بڑی لائبریریاں ان کے نیٹ سسٹم کے سامنے ہیچ نظر آئیں، گویا کہ اسلام دشمن عناصر اسٹوڈنٹس،اسکالرس اور محققین کی راہوں کو ہموار کرکے اس کے پس پردہ انہیں عیسائیت کی طرف راغب کررہے ہیں یا اسلام کو دو طبقوں بنیاد پرست اور جدت پسند میں تقسیم کرنے کا کام بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ان تمام حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے اب دین کے لیے فکر مند و درد مند افراد وادارے یہ سوچنے پر مجبور ہورہے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کی حدود کے اندر رہ کر ہمیں بھی اپنے مقاصد کی ترجمانی وفروغ کے لیے اس ذریعہ کو اپنانا چاہیے۔[1]

میں اس پر کچھ مزید روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں وسائل کو کس طور تجدید دین کے لئے استعمال کرسکتے ہیں اور یہ کہ اس میدان میں کیا پیش رفت ہورہی ہے۔

---

1 جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے مذہب اسلام کی تبلیغ،عطاء الرحمان نوری،مالگاؤن بدون تاریخ

انٹرنٹ کی کئی خدمات لوگوں کے لئے بالکل مفت ہیں، جیسے ای میل ،چیٹینگ،اور ویڈیو کالنگ ان کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے۔چیٹینگ کرکے براہ راست لوگوں سے تعارف حاصل کیا جاسکتا ہے اور مناسب موقعہ پر ان کو دینی نصیحت کی جاسکتی ہے،دینی کتابوں اور اسلامی مواد کا شوق دلایا جاسکتا ہے، برادران وطن کو اسلام کی دعوت دی جاسکتی ہے، اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ای میل کے ذریعے بآسانی خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھا جاسکتا ہے اور رابطوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جاسکتا ہے، سیکنڈوں میں مطلوبہ مواد منتقل کئے جاسکتے ہیں اور ان کا آپس میں تبادلہ ہو سکتا ہے۔

دینی دعوت اور تجدید کے لئے انٹرنٹ کا بہترین استعمال یہ بھی ہے کہ اچھے اور معیاری اسلامی سائٹس کا قیام عمل میں لایا جائے۔ایک کثیر تعداد اس طرح کے سائٹس کی پہلے سے موجود ہیں، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے پیمانے پر علم شرعی میں مہارت رکھنے والے لوگ اس طرف متوجہ ہوں،اور بہم پہنچائی جانے والی معلومات مدلل اور واضح ہوں۔ان سائٹس پر مختلف زبانوں میں ،ورنہ کم ازکم چند مشہور زبانوں میں مواد فراہم ہو، چھوٹی چھوٹی جامع دعوتی الیکٹرونک کتابوں کا ذخیرہ ہو، عقائد صحیحہ کو سب سے زیادہ اجاگر کیا گیا ہو تاکہ اولاً کتاب و سنت پر مشتمل عقائد کا علم حاصل ہوسکے اور پھر ان گم راہ کن عقائد سے بچنے اور ان کو باطل سمجھنے کا شعور بیدار ہو سکے جو محض فریب میں مبتلا کرنے کے لئے ایک بڑی تعداد میں اسلام یا اسلامی دعوت کے نام پر قائم کئے جانے والے سائٹس کے ذریعے نشر کئے جاتے ہیں۔دعوتی مقاصد کے لئے مخصوص سائٹس پر اگر ایسے تقاریر ودروس بھی پیش کئے جائیں جن کو سننے اور محفوظ کرنے کی بھی سہولت موجود ہو تو زیادہ بہتر ہے، بلکہ اب تو ایسے بھی سائٹس کا قیام عمل میں آچکا ہے جن کے ذریعے ریڈیو اور ٹی وی کی طرح براہ راست تقاریر ودروس نشر ہوتے ہیں[1]۔

بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یا تو مستقل سائٹس ورنہ کم ازکم لنکس ایسے ہوں جن میں ایمان واخلاق اور عبادات سے متعلق خوش الحانی کے ساتھ پیش کئے گئے ترانے ہوں، سیرت وتاریخ سے مستند اور صحیح معلومات پر مبنی انبیاء اور رسولوں کے قصے ہوں، صحابہ کرام اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے واقعات اور رسول اللہ ﷺ کے غزوات کا بیان ہو، تاکہ ان کے اندر شوق عمل بیدار ہو، بالخصوص ان دنوں ایسے سائٹس کی تو نہایت اہم ضرورت ہے جن میں دین اسلام کے محاسن بیان کئے گئے ہوں۔اس کے دین رحمت ہونے کی خصوصیت کو ابھارا گیا ہو، انسانی حقوق اور عورتوں کے سلسلے میں اس کی واضح تعلیمات کو اچھے انداز واسلوب میں سمجھایا گیا ہو، اسلام کے اعتدال پسندی، میانہ روی اور صلح وآشتی کے مزاج کو خوش اسلوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہو، تشدد اور دہشت گردی سے اس کی فطری دوری کو آشکارا کیا گیا ہو، نئے مسلمانوں کے اسلام میں

1 جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے مذہب اسلام کی تبلیغ، عطاء الرحمان نوری، مالگاؤن

داخل ہونے کے اسباب بتائے گئے ہوں،تاکہ ان لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو سکیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط پروپیگنڈوں اور بیانات کے شکار ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔

اب روایتی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کی جگہ سی ڈی، ڈی وی ڈی، پین ڈرائیو اور آئی پوٹ نے لے لی ہے، اور دعوتی کاموں اور تجدید دین کے لئے ان کا استعمال زیادہ بہتر طور پر اس لئے ہو سکتا ہے کہ ہم بآسانی گھر بیٹھے اپنے کمپیوٹر کے ذریعے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سی ڈی یا ڈی وی ڈی کی کاپیاں تیار کر کے لوگوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

موبائل فون کے ایجاد نے اس زمانے میں جو آپسی رابطے کی آسانی مہیا کر دی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اور دین کی سب سے ادنٰی خدمت اس کے ذریعے یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی مختصر پیغام نویسی کی سہولت کو دینی اور اخلاقی باتیں لوگوں تک پہنچانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس کے علاوہ رہی ڈش ٹی وی یا سٹیلائٹ ڈیجیٹل چینلز کی بات، تو اس میں شک نہیں کہ آج کل ان کا استعمال شر و فساد اور فحاشی و بدکاری کو پھیلانے میں زیادہ وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر کھلی حقیقت ہے کہ وہ اہل خیر چاہے وہ حکومتیں ہوں یا افراد، جو اس ذریعے اسلام کی خدمت انجام دے سکتے ہیں وہ کوتاہیوں کے شکار ہیں۔ اگر وہ بھی اہل شر کی طرح سرگرم عمل ہوتے تو صورت حال یکسر مختلف ہوتی، اور وہ نوجوان بچے اور عوام الناس جو ٹی وی پروگراموں کے ذریعہ بے راہ روی کے شکار ہیں، ان کی یقیناً ایک بڑی تعداد ان پروگراموں کا بہتر بدل پا کر راہ حق کی طرف لوٹ آتی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اسے بھلی چیزوں کے ذریعہ اپنے فارغ اوقات گزارنے کا موقعہ نہ ملے تو مضر اور غیر صالح اسباب کو اپنا لیتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ افراد، حکومتیں اور ادارے جن کے اندر اللہ نے دین کی خدمت کا جذبہ رکھا ہے اور وہ فضائی چینلوں کے قیام کی صلاحیت رکھتے ہیں، اگر وہ مختلف چینلز، دعوت اور اصلاح و تربیت کے کاموں کے لئے وقف کر دیں تو دنیا کے لاکھوں انسانوں کو اپنی روحانی پیاس بجھانے کا موقعہ مل سکتا ہے، اور وہ اسلام کے سایہ تلے آ سکتے ہیں، بھٹکے ہوئے مسلمان راہ ہدایت پا سکتے ہیں، علماء کے براہ راست فتوؤں کے پروگراموں سے دینی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، دینی تعلیمات کی روشنی عام کی جا سکتی ہے، نوجوانوں اور بچوں کو بدل صالح مل سکتا ہے، اسلام کے سلسلہ میں لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے، اور گھر گھر اسلام کے نور سے منور ہو سکتا ہے۔[1]

دعوت دین انبیاء و رسل تک محدود نہیں بلکہ تمام مسلمانوں اور علماء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں: ''میری بات دوسروں تک پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت اور ایک ہی بات ہو۔''

---

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبد اللہ سلمان ریاض، بنگلوری

دوسری جگہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے تفصیل سے بین الاقوامی نظامِ امن وسیاست کے اصول کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

''اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدَ الْغَائِبَ فرب مَبْلَغُ اَوْعِىَ مِنْ سَامِعٍ''[1]

ترجمہ: جو لوگ موجود ہیں وہ میری بات ان لوگوں تک پہنچادیں جو اس وقت موجود نہیں، ہو سکتا ہے کہ جس تک یہ بات پہنچے خود سننے والے سے زیادہ اسے محفوظ رکھنے والا ہو۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ دعوت دین کے ذرائع و وسائل بے شمار ہیں۔ مساجد وعبادت گاہیں دعوت کے اہم مراکز ہیں۔ غیر مسلموں میں یا مغربی ملکوں میں دعوت کا طریقہ مسلم ملکوں کے طریقہ سے مختلف ہے۔ حالات ومقامات اور افراد کے اعتبار سے اس کی صورتیں جداگانہ اختیار کی جاتی ہیں مگر ہر ایک کا مقصد اسلام کا پیغام اس انداز واسلوب میں دوسروں تک پہچانا ہے جو دلوں پر اثر کرسکے، اس میں نرمی پیدا کرسکے، ان کی نفرتوں کو محبتوں میں تبدیل کرسکے۔ ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے لوگ متنفر ہوں، اسلام سے بدکیں اور اسے فرسودہ سمجھنے پر مجبور ہوں۔ ہر زمانہ میں مسلمانوں نے اس فریضہ کو انجام دیا ہے اسی لئے ہر زمانہ میں مذہب اسلام پھلتا اور پھولتا رہا، اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے، اس میں کبھی کمی نہیں آئی۔

ہمیں اس کا بھی بخوبی علم ہے کہ اسلام اور دین وایمان کے پھیلائو میں ذرائع ابلاغ کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ ان ذرائع ابلاغ کی صورتیں ایک نہیں بلکہ اس کی صورتیں بے شمار ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی دریافت اور اسکے معرض وجود میں آجانے کے بعد دعوت وتجدید کا عمل پہلے کے برعکس تبدیل ہوگیا ہے۔ آج انسان کے بس میں ہے کہ وہ ایک مضمون، ایک چھوٹی سی تحریر اور اپنی بات تحریر کرکے اسے ساری دنیا میں پھیلادے کہ منٹوں میں دنیا کے گوشے گوشے کے لوگ اسے پڑھ لیں اور اس سے واقف ہوجائیں۔ آج ہم اپنے گھر میں بیٹھ کر ایک بات تحریر کرتے اور لمحوں میں اسے مشرق ومغرب میں پڑھ لیا جاتا ہے اور لوگ اس پر اپنے تبصرے اور اپنی آراء بھیجنے لگتے ہیں۔ آج ان وسائل کی آمد کے بعد ہماری ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان ذرائع کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے دین اسلام کا پیغام اور اس کی دعوت اقوام عالم تک پہنچائیں اور اسکے خلاف اعدائے اسلام جو سرگرم ہیں ان کا حکیمانہ جواب دیں، ان کی سازشوں کو ناکام بنائیں اور اپنے دین ومذھب کا پوری بصیرت کے ساتھ دفاع کریں۔ ہم ایسے مسموم ذہنوں کی پیداوار کا جواب دیں جس کے ذریعہ وہ ہمارے دین ومذہب کی صورت بگاڑنے کی کوشش کررہے ہیں اور اس کے لئے جھوٹ ودروغ گوئی، جعلسازی وگمراہ کن پروپیگنڈوں کا سہارا لے رہے اور بے بنیاد مناظر تیار کرکے پیش کررہے ہیں تاکہ دنیا کے عام باشندوں کے ذہن میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی جذبات پیدا ہوں اور وہ اسلام سے قریب آنے کی بجائے اس سے دور ومتنفر ہوں۔ اس وقت سارے مسلمانوں خاص طور پر داعیانِ دین یا جو ذرائع

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: ۱۷۴۱

ابلاغ سے وابستہ ہیں، ان کے ذمہ ہے کہ وہ اپنی توجہ اس کے ذریعہ دعوت پر مرکوز کریں اور اسلام کے دفاع میں اپنی ذمہ داری نبھائیں اور مسلمانوں کو اپنا سلوک اور اپنی زندگی سچے مسلمانوں والا بنانے کی تلقین و تفہیم کریں۔

ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ جدید ذرائع ابلاغ اُن اہم ترین وسائل میں سے ہیں جو مذہب اسلام کی دعوت کو پھیلانے اور پوری دنیا میں اسلام و مسلمانوں کے بارے میں پھیلائی جارہی غلط تصویر کو بہتر بنانے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ آج دنیا کی غیر مسلم آبادیوں میں، اسی طرح مغرب کی یہودی و مسیحی آبادی میں طرح طرح کی باتیں اسلام کے بارے میں پھیلائی جارہی ہیں اور پوری قوت سے کوشش کی جارہی ہے کہ دنیا کے باشندے اسلام قبول کرنے کے بارے میں سوچیں بھی نہیں۔ اسلام کے بارے میں عام پروپیگنڈا کیا جاتا اور ذہنوں میں ایک سوچ بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو آزادی نہیں دیتا بلکہ انہیں قید و بند میں جکڑ دیتا اور ان کی زندگی تنگ کردیتا ہے جبکہ یہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔

اسلام ہر چیز میں آسانیاں پیدا کرتا ہے سختی نہیں۔ اسلام میں رکھ رکھاؤ میل ملاپ اور بڑی آزادی ہے۔ اس جیسی آزادی کسی اور معتبر مذہب میں نہیں، مگر وہ لوگوں کو قانون پر عمل کرانا چاہتا اور اسے قانون سے بالاتر نہیں گردانتا۔ اسے قانون کا پابند بنا کر مکمل آزادی دیتا ہے۔ ہمیں بخوبی احساس ہے کہ دنیا میں دعوت دین کے فرائض کی انجام دہی میں ہم سے کوتاہیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ ہم نے اس فریضہ کو اس طرح انجام نہیں دیا جس طرح ہمیں دینا چاہئے تھا۔ ہم اب بھی خواب غفلت میں پڑے اور کاہلی کا شکار ہیں جبکہ مغربی ذرائع ابلاغ اور خود ہمارے ملک میں آر ایس ایس کے زیر اثر سارے ذرائع ابلاغ اس میں سرگرم ہیں۔ وہ رات و دن اسلام کو بدنام کرنے میں لگے ہیں۔ ان کی دعوت کا اسلوب منفی ہے۔ وہ اپنی مذہبی بات تو کم ہی پیش کرتے ہیں کہ ان کے پاس پیش کرنے کی کوئی خاص چیز نہیں، مگر وہ اپنی بات منوانے اور اپنی دعوت عام کرنے کے لئے اسلام کو بدنام کرنے کی محنت کرتے ہیں مگر ہم پاکستان میں اور مغربی ملکوں میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس شر کے اندر بھی خیر کا پہلو نکل رہا ہے۔ ان کی اس مہم کے نتیجہ میں لوگ اسلام کے مطالعہ کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ اس کا مطالعہ کر رہے ہیں اور جب اس کی صداقت نظر آتی ہے تو بہت سے حلقہ بگوش اسلام بھی ہو جاتے ہیں[1]۔

اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہم دعوت میں کوتاہی کو جاری رکھیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے سے زیادہ اس کے لئے سرگرم ہوں، ہم عمدہ معیار اختیار کرتے ہوئے جدید وسائل کا استعمال کریں اور عالمی سطح پر اور اسکے معیار کے مطابق اسلام کا پیغام اقوام عالم تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس دعوت دین کو پھیلانے کی شروعات رسول اللہ ﷺ نے کی تھی،

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبداللہ سلمان ریاض، بنگالوری

صحابہ کرامؓ نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، تابعین و تبع تابعین نے اس امانت کو بعد والوں تک پہنچایا اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے اہل علم آج بھی اس خدمت کو اپنی بساط کے مطابق انجام دے رہے ہیں۔

علمائے اسلام کا فریضہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کو دین اسلام اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کریں۔اقوام عالم کو اسلام کے پیغام کی وضاحت کے ساتھ ایمان و توحید کی دعوت دیں۔آج ہر ملک میں ہزاروں چینل ہیں جو رات و دن اپنی نشریات پیش کرتے رہتے ہیں۔آج کا زمانہ چینلوں، انفارمیشن اور انٹرنیٹ اور طرح طرح کی سائٹوں اور رابطے کے وسائل کا زمانہ ہے۔ان وسائل کا سہارا لے کر ہم اسلام کی حقیقت و حقانیت، اسلام کی تاریخ، اسکے عدل و انصاف، اس کی رواداری، اس کے عطا کردہ حقوق اور اس کے سنہرے ادوارِ حکمرانی کو لوگوں کے سامنے پیش کریں اور مغربی و صہیونی میڈیا کے پروپیگنڈوں کا جواب اقوام عالم کی زبان میں دیں۔انٹرنیٹ اور رابطے کے جدید وسائل نے دعوت و تجدید کے کام کو ہمارے لئے آسان بنادیا ہے، اسے غنیمت سمجھنا چاہئے۔اس کے ذریعہ ہم دنیا کے گوشے گوشے سے منٹوں میں ربط کر لیتے ہیں۔ہم ایک چیز تحریر کرکے جونہی پوسٹ کرتے ہیں لاکھوں کروڑوں لوگ اسے فوراً پڑھ لیتے ہیں۔ہمارے پڑوس کے لوگ جس طرح اسے دیکھتے مشرق و مغرب کے لوگ بھی اسی لمحہ اسے دیکھ لیتے ہیں۔اس سہولت نے ہم پر ذمہ داری ڈالی ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اس میں ذرہ برابر کوتاہی نہ کریں۔علمائے دین کی اب ذمہ داری ہے کہ وہ پہلے اپنے علم میں گہرائی پیدا کریں، مذاہب وادیان کا مطالعہ کریں، مختلف زبانوں میں لکھنا اور بولنا سیکھیں اور کتاب و سنت میں دسترس حاصل کرنے کے بعد بہتر سے بہتر اسلوب میں دین اسلام کی تعلیمات دوسروں کو سمجھانے اور مطمئن کرنے کی تربیت حاصل کریں۔اس کے بعد ان جدید وسائل کو دعوت اسلامی کے مقصد سے استعمال کریں[1]۔

آج مثال کے طور پر ہم اگر اپنی اردو زبان میں دین کی باتیں لکھنے اور بولتے رہیں تو یہ بھی بلاشبہ اچھا عمل ہے، مگر اس کا دائرہ محدود ہے۔ہم اپنی بات اپنوں کو ہی کہہ رہے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی بات دوسروں تک ان کی زبان میں پہنچائیں اور انہیں مطمئن کریں۔اس کے لئے ہمیں ہندی، تلگو، کنڑ، مراٹھا، کیرل، تامل، بنگالی، اسامی اور ہر خطے کی زبان میں مہارت حاصل کرنا ہوگا۔ہر زبان کے داعیوں کی ایک کھیپ تیار کرنی ہوگی، جو ان زبانوں میں دعوت کا فریضہ انجام دے سکیں، اسلام کے خلاف پھیلائے جارہے منفی پروپیگنڈوں کا جواب دے سکیں، ہم باور کرا سکیں کہ ہمارے دین و مذہب کی تعلیمات شخصی منافع و مفادات سے بالاتر ہیں، ہم سرمایہ داروں کی تسکین اور مردوں کی اپنی خانگی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کے مقصد سے عورتوں کو نیلام نہیں کرتے اور نہ انہیں ان ذمہ داریوں میں حصہ دار بناتے ہیں بلکہ اسلام ہر ایک کو اسکے دائرہ میں آزادی دیتا ہے

1 جدید وسائل اور آلات کا استعمال برائے دعوت دین، عبداللہ سلمان ریاض، بنگالوری

اور ہر ایک کے فرائض وواجبات اور ذمہ داریوں وحقوق کو متعین کرتا ہے، اور وہی اس کی ذات کیلئے مفید اور اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے، کہ ناقص علم رکھنے والے حضرات چینلوں کے مباحث اور دین اسلام کی ترجمانی کے لئے اسکرین پر آنے سے گریز کریں کہ انکی لاعلمی وجہالت کی وجہ سے، ان کے نارواطرز عمل اور آپے سے باہر ہونے کی وجہ سے اور لاکھوں انسانوں کی نگاہوں کے سامنے عدم علم کی وجہ سے لاجواب ہو جانے کی وجہ سے نہ صرف اسلام ومسلمانوں کی سبکی ہوتی بلکہ دعوت کے عمل کو سخت نقصان پہنچتا ہے اس لئے اگر اہل علم میں سے کسی کو مباحثے کے لئے دعوت دی جائے اور ان کا علم ناقص اور معلومات کی کمی ہو تو وہ معذرت کریں اور علم میں گہرائی رکھنے والوں کی نشاندہی کریں کہ اس کیلئے انہیں مدعو کیا جائے۔ خود نمائی وشہرت کے لالچ میں خدارا اسلام کو بدنام کرنے اور اس کی رسوائی کا سبب بننے سے اجتناب کریں۔[1] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ}[2]

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ میری راہ یہی ہے، میں اور میری پیروی کرنے والے اللہ کی طرف بلارہے ہیں پورے یقین اور اعتماد (یعنی دلائل کے ساتھ) اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں نہیں ہوں۔

اسلام ایک عالم گیر اور تا قیامت باقی رہنے والا مذہب ہے، اس لیے وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے نشیب وفراز، تہذیب وتمدن کا عروج وزوال اور معاشرے کے طرز زندگی کا سدھار وبگاڑ اس کو متاثر نہیں کر سکتا۔ مذہب اسلام جدید آلات وانکشافات کا استقبال کرتا ہے اس کا انکار نہیں کرتا اور نہ ہی جدید اشیا کے استعمال کے متعلق یک لخت بلاتدبر وتفکر کے منع کرتا ہے بلکہ تعلیمات اسلام ہی جدید انکشافات کے دریچوں کی راہوں کو ہموار کرتی ہیں۔

---

1 https://www.urdunews.com

2 سورۃ یوسف ۱۲ : ۱۰۸

فصل سوم: اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اسلام کے فکری و عملی مسائل کا حل

شورائی اور مشاروتی اجتہاد، اجتماعی اجتہاد ہی کا ایک اسلوب ہے۔ شورائی اجتہاد کے بارے میں علماء کی ایک گروہ کا خیال ہے، کہ یہ صرف دینی امور میں ہو گا جبکہ فقہاء کے ایک دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ یہ دینی و دنیوی ہر قسم کے معاملات میں ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر وہبہ الزحیلیؒ سلف صالحین کے اس اختلاف کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

''قرآن پاک کی ایک آیت ہے ''وشاورھم فی الامر'' اس آیت کے مطابق مسلمانوں کو آپس کے تمام معاملات باہمی مشاورت سے حل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، یہ معاملات دین کے متعلق ہوں، دنیا کے متعلق ہوں، سیاسی ہوں یا معاشرتی، اجتماعی ہوں یا انفرادی، اقتصادی ہوں یا ثقافتی، تمام مسائل میں باہمی مشورہ کرنا ضروری ہے، نیز اس آیت میں ان تمام مسائل کے حوالے سے بھی مشورہ شامل ہے کہ جن کے حوالے سے کوئی واضح قرآنی آیت یا شرعی حکم وارد نہ ہوئی ہو۔ اس کے برعکس کچھ علماء جیسے امام طبریؒ، ابن العربیؒ کا خیال ہے کہ اس آیت میں مشورہ صرف دنیوی معاملات کے متعلق ہی لینے کی وضاحت کی گئی ہے، اسی طرح کچھ علماء ایسے بھی ہے جن کی رائے یہ ہے کہ شوریٰ دینی اور دنیوی معاملات و امور میں بھی لیا جائے گا۔ اس رائے کے علماء میں ''علامہ آلوسی'' اور ''علامہ جصاص'' شامل ہیں۔ ان علماء کے مطابق رسولؐ نے صحابہ کرامؓ سے غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشاورت کی تھی اور یہ بھی ایک دینی معاملہ تھا۔[1]

دور حاضر میں اجتماعی اجتہاد کے محرکات:

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے، جس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ایک مکمل رہنمائی موجود ہے۔ دین اسلام کے بنیادی مصادر قرآن اور سنت ہیں۔ اگر کسی مسلے کا صریح حل قرآن و سنت میں موجود نہ ہو تو پھر قرآن و سنت کی وسعتوں اور گہرائیوں سے اس کا حل قیاس، اجتہاد اور قواعد عامہ کے اصول و ضوابط کی روشنی میں مستنبط کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ دور نبوت میں جن مسائل میں وحی نازل نہیں ہوئی تھی، ان میں اجتہاد فرما لیا کرتے تھے۔ اسی طرح آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی بھی اجتہادی تربیت کی اور آپؐ اپنی زندگی ہی میں وقتاً فوقتاً ان کے اجتہادات کی تصحیح یا تائید فرماتے رہتے تھے۔ آپؐ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں اجتہاد کا یہ عمل ریاستی و قومی سطح پر منظم ہوا۔ تابعینؒ کے دور میں بھی سلطنت اسلامیہ کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے نئے نئے مسائل سامنے آئے اور روز مرہ زندگی کے معاملات میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اور بڑھ گئی۔ تبع تابعین اور ائمہ اربعہ کے زمانہ میں مسلمان عربوں کے دوسری اقوام کے ساتھ میل جول اور اختلاط کی وجہ سے باہمی معاملات میں پیچیدگیاں بڑھ گئیں، علماء نے مستقل اصول وضع کیے اور ان کی روشنی میں اجتہادی عمل کو اس کے عروج تک پہنچایا۔ کئی ایک

---

1 عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد، حافظ محمد زبیر، صفحہ ۱۰۷، شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب لاہور۔ بدون تاریخ

مکاتب فکر وجود میں آ گئے اور ہر مکتب فکر کے ائمہ نے اپنے اصول وفروغ کو مدون کیا۔ فقہ اسلامی کے نام سے ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ وجود میں آ گیا، جس میں بلاشبہ زندگی کے لاکھوں مسائل کے بارے میں شرعی رہنمائی جاری کی گئی تھی۔ پس ائمہ اربعہ کے دور کے بعد یعنی چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد کا عمل رک گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ شاید اس کا دروازہ اب قیامت تک کے لیے بند ہو گیا ہے حالانکہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہادی عمل کی ضرورت پوری ہو گئی تھی للذا اکثر و بیشتر ائمہ سلف نے سابقہ فقہی ذخیرے کی شروحات اور توضیح تنقیح میں اپنی زندگیاں کھپائیں۔ وقت کے مسائل و سوالات کا کافی و شافی جواب ائمہ سلف نے اپنے اقوال، کتب اور فتاوی کے ذریعہ دے دیا تھا للذا اسی کی اتباع اور اس میں اضافے کا کام جاری رہا۔

سترہویں صدی ہجری کے صنعتی ترقی، بیسویں صدی ہجری کی معاشی و معاشرتی اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور سیاستی تبدیلیوں نے جہاں ساری دنیا کو متاثر کیا، ویسے ہی مذہب میں بھی بے شمار سوالات پیدا کر دیے۔ معاشی اور صنعتی ترقی کے سبب کاروبار کی ہزاروں ایسی نئی صورتیں متعارف ہوئی کہ جن کی شرعی حیثیت معلوم کرنا موجود دور کا اہم مطالبہ تھا۔ سیاسی انقلاب نے انتخابات، پارلیمینٹ، دستور سازی اور آئین جیسے نئے تصورات متعارف کرائے۔ معاشرتی ردوبدل سے عورت اور مرد کے کے باہمی ملاوٹ اور تعلقات جیسے مسائل نے جنم لیا۔ میڈیکل سائنس اور ٹیکنالوجی نے ایجادات نے دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا، جس سے کئی ایجادات کے بارے میں شریعت کا حکم ماننے کی ضرورت محسوس ہوئی، یہی سبب ہے کہ انیسویں صدے کا اواخر میں اور بیسویں صدی کے شروع میں اکثر اسلامی ممالک میں اجتہاد کی تحریکیں شروع ہوئی۔ تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے نتیجے میں جنم لینے والے ہزاروں مسائل میں علماء نے رہنمائی کی، فتاوٰی کی ہزاروں جلدیں لکھی گئی ہے، اور اجتہاد کے عمل کو منظم انداز میں آگے پڑھانے کے لیے کئی ادارے وجود میں آنا شروع ہوئے۔

اجتماعی اجتہاد کے لئے قومی اور عالمی سطح کے اداروں کی بنیاد رکھی گئی، تاکہ اس دور میں اجتہاد کے مشکل عمل کو اجتماعی صورت میں فروغ دیا جائے، ان اداروں میں پاکستان میں ''اسلامی نظریاتی کونسل''مکہ معظمہ میں ''المجمع الفقہ الاسلامی''سوڈان میں ''مجمع الفقہ الاسلامی''اردن میں ''المجمع الملکی البحوث الاسلامیہ''بھارت میں ''اسلامی فقہ اکیڈمی''مصر میں مجمع البحوث الاسلامیہ''یورپ میں ''یورپی مجلس برائے افتاء تحقیق''شمالی امریکہ میں ''مجمع فقہاء الشریعۃ'' وغیرہ شامل ہیں۔

ان اداروں کے قیام کے اغراض و مقاصد، وجوہات یا محرکات بہت زیادہ تھے۔ مختلف علماء نے اپنے تحقیقی مقالہ جات میں ان اسباب و محرکات کو بیان کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں چند ایک کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔

علمی وفکری وحدت:

اجتماعی اجتہاد کے محرکات و وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے مسلمانوں میں فکری و علمی وحدت حاصل ہو گی۔ نئے پیش آمدہ مسائل میں جب مختلف مکاتب فکر، ممالک اور مدارس دینیہ سے تعلق رکھنے والے علماء فتوی جاری کرتے ہیں تو ایک ہی فتوے میں متعدد متضاد آراء سامنے آتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی کی وجہ سے یہ باہم متضاد فتاوی اسلامی

معاشروں میں بہت تیزی سے پھیل جاتے ہیں اور سائلین کے لیے پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے فتاوی میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے جیسا کہ پاکستان میں حنفی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے بعض علماء اسلامی بینکاری کو جائز جبکہ بعض دوسرے اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ایک ہی مسلک کے ماننے والوں کے مابین حلال و حرام کے اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ بعض مسائل میں تو یہ اختلاف ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی، الزامی تقاریر، جوابی تحریر اور طعن و تشنیع تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اجتماعی فتوی کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے تاکہ فقہی مسائل و فتاوی کے اختلافات کم سے کم واقع ہوں۔ ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃؒ بیان کرتے ہیں:

''مسلمانوں کو موجودہ دور میں ان تمام اشیاء کی شدید ضرورت ہے جن سے ان کی عقیدہ وحدانیت کو تقویت ملتی ہے اور علماء جن مسائل کا حل پیش کرتے ہیں، ان میں اتحاد رائے ہو تاکہ امت اپنے طریقہ کار اور ایک دوسرے سے معاملات میں برابری پیدا کر سکے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک ملت اسلامیہ ایک دوسرے سے نفرت پیدا کرنے والی ذاتی آراء سے دور ہوتے ہوئے اپنے مسائل اور مشکلات کا حل ایسی اجتماعی رائے کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، جو امت کو جمع کر دے اور ان کی صفوں میں اتفاق پیدا کر دے۔ انفرادی آراء امت کے نظریات میں تفرقہ صفوں میں افتراق اور احکام میں تشدد پیدا کرتی ہیں۔ ان وجوہات سے عامۃ الناس انفرادی فتاوی کے معاملے میں حیران و پریشان ہو جاتے ہیں امت کو عمومی مسائل میں ایک ہی رائے اور حکم کے حصول کی خاطر اسی طریقہ کار پر عمل کرنا چاہیے شائد اجتماعی اجتہاد ہی وہ رستہ ہے جس کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے''[1]

یہ بات بھی واضح رہے کہ امت کی علمی و فکری اتحاد کی اہمیت مسلم ہے لیکن اتباع حق کے جذبے پر اس محرک کو غالب نہیں ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کیمرے کی تصویر کے جواز و عدم جواز کے بارے میں کوئی مشورہ کرنے کے لیے علماء کی ایک جماعت باہمی مذاکرہ کرتی ہے اور اگر اس مجلس کے بعض اراکین دلائل اور فکر و نظر کے اختلاف کے باوجود اجتماعی رائے کے حصول کی خاطر اپنی انفرادی آراء سے رجوع کر لیتے ہیں، جن کو وہ حق سمجھتے ہیں یا اتحاد امت کے جذبے کی خاطر بغیر غور و فکر اور تحقیق کے مجلس کے اجتماعی فتوی کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں تو یہ ایک نامناسب طرز عمل ہے۔ اسلام میں اجتماعیت مطلوب ہے لیکن اس قدر بھی نہیں کہ مصنوعی طور پر پیدا کی جائے بلکہ باہمی آزادانہ مشاورت اور بحث و تمحیص کے نتیجے میں اگر علماء کی ایک جماعت کا کسی مسئلے کے شرعی حل پر اتفاق ہوتا نظر آتا ہے تو یہ مستحسن امر ہے۔ پس اجتماعیت کے حصول کے جذبے کو اتباع حق پر غالب نہیں آنا چاہیے۔

---

1 الدکتور عبد المجید، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، السّوسوہ ناشر وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ الدوحۃ قطر، ص: ۸۸۔۸۹

مذہبی و گروہی تعصب میں کمی:

بعض علماء کا کہنا ہے کہ انفرادی اجتہاد نے مذہبی و گروہی تعصب بڑھادیا ہے۔ ہر مذہب و مسلک کے علماء اپنی انفرادی حیثیت میں فتاوی جاری کرتے ہیں جو عموماً اپنے موقف کے اثبات سے زیادہ دوسرے کی رائے پر تنقید پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہی فتاوی جات مختلف مسالک کے علماء یا علمی حلقوں کے مابین مناظرے کی صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے رد میں کتابیں اور علمی مقالے تحریر کیے جاتے ہیں اور مخالف مکتب فکر کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اپنے مسلک کے بڑوں کی تعریف میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور مخالف مذہب کے علماء پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں عامۃ الناس میں بھی ایک دوسرے کے مسلک و مذہب کے خلاف نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔

ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہادی دعوت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے، کہ انفرادی فتاوی میں اختلافات کے نتیجے میں باہمی مخالفتیں بڑھ جاتی ہے اور امت تنگی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر خاص و عام کے علم میں ہے۔ اس مسلے کا بہترین حل شائد وہ اختلاف ہے جو علماء کے مابین حصص سرٹیفکیٹس کی حلت و حرمت کے بارے میں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ یہ اختلاف باہمی طعن و تشنیع اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کی حد تک پہنچ گیا۔ اس قسم کے شدید اختلافات کا عام مسلمانوں پر بہت ہی برا اثر پڑا۔ اگر اس مسلے کو کسی فقہی مجلس یا اکیڈمی کے ذریعے حل کر لیا جاتا، جیسا کہ بالآخر ایسا ہی کیا گیا تو ہم اس سب کچھ سے بچ سکتے تھے۔ جماعت کی رائے انفرادی رائے کے مقابلے میں نسبتاً صحیح ہوتی ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اجتماعی رائے فردی رائے کے بالمقابل زیادہ قابل قبول ہوتی ہے" [1]

بعض علماء کا یہ خیال ہے، کہ مسلمانوں میں تفرقے کی بنیاد ہی انفرادی اجتہاد ہے لہٰذا اس پر پابندی لگا دینی چاہیے اور صرف اجتماعی اجتہاد کے منہج کو برقرار رکھا جائے۔ شیخ عبد الوہاب خلافؒ فرماتے ہیں کہ جن مسائل میں قرآن و سنت میں کوئی صریح حکم نہیں ہے تو ان میں اجتماعی اجتہاد ہو گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"جن لوگوں کے پاس اجتہاد بالرائے کا اختیار ہے، ان سے مراد وہ قانون ساز جماعت ہے جس کے ہر ایک رکن میں وہ اجتہادی صلاحیت پائی جاتی ہو جس کی طرف علماء نے رہنمائی کی ہے کسی بھی فرد کو اجتہاد بالرائے کا اختیار نہیں ہے، چاہے وہ کس قدر اہلیت و صلاحیت اور کمالات کیوں نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ فقہ اسلامی میں قانون انتشار کے بڑے اسباب میں سے ایک اہم سبب انفرادی اجتہاد بھی ہے۔" [2]

---

1 الدکتور محمد شعبان اسماعیل، الاجتہاد الجماعی ودور المجامع الفقھیۃ فی تطبیقہ، ناشر دار البشائر الاسلامیہ، حلب، سوریا، ص: ۱۲۱

2 شیخ عبد الوھاب، مصادر التشریع فیما لا نص فیہ، خلاف،: ص: ۱۳

ہمارے خیال میں شیخ کی یہ رائے درست نہیں ہے،اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اجتماعی اجتہاد کی اہمیت مسلم ہے لیکن اس سے مراد بالکل بھی یہ نہیں ہے کہ اجتماعی اجتہاد کی مدح سرائی میں انفرادی اجتہاد جو کہ اس کی اصل ہے،اسی کارد کرنا شروع کر دیا جائے اور بغیر کیسی دلیل کے فرقہ وارانہ تعصب کی بنیاد ائمہ سلف کے انفرادی اجتہاد کو قرار دیا جائے۔ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیلؒ شیخ عبدالوہاب خلافؒ کی اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انفرادی اجتہاد کو لا قانونیت قرار دینے میں ایک اعتبار سے مبالغہ ہے۔دوسرے پہلو سے اس بیان میں مختلف زمانوں کے نامور علمائے مجتہدین مثلاً امام ابو حنیفہؒ،امام مالکؒ،امام شافعیؒ،امام احمد بن حنبلؒ،امام لیث بن سعدؒ،امام ابو ثورؒ،امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ اور امام شوکانیؒ وغیرہ کی اجتہادی کاوشوں کا انکار بھی شامل ہے،جنھوں نے امت مسلمہ میں وہ فکری بیداری کی کہ جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔اجتماعی اجتہاد کی اہمیت بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی بھی حال میں انفرادی اجتہاد کا انکار ہی کر دیا جائے''[1]

فقہ الواقع کا صحیح علم نہ ہونا:

تہذیب و تمدن کے عروج سے جنم لینے والے نئے علوم وفنون میں اس قدر فراخی ہو گئی ہے کہ کوئی ایک فرد کے لیے ان تمام علوم کا استقصاء کرنا ممکن نہیں ہے۔ خصوصی طور پر علم اقتصادیات اور میڈیکل سائنسز نے بہت سارے اعمال کے بارے میں جواز اور عدم جواز کے سوال پیدا کر دیے ہیں۔ایک طالب علم دینی مدرسہ میں جس نصاب تعلیم سے گزرتا ہے اس میں معیشت، طب یا دوسرے عصری علوم وفنون ان کے نصاب میں نہیں ہوتا۔لہٰذا ایسے مسائل میں ذاتی فتویٰ دینے کے لیے بہت زیادہ تحقیق ومشقت کرنی پڑتی ہے۔مثال کے طور پر کلوننگ جائز ہے یا ناجائز؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔جس کا جواب اسی صورت دیا جا سکتا ہے جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ کلوننگ فی الواقع کیا شیء ہے؟ پس کلوننگ سے متعلقہ جمیع معلومات کو فقہ الواقع کا علم کہتے ہیں۔کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز ہے یا ناجائز؟ایک تو مسلے کا شرعی پہلو ہے جبکہ دوسرا واقعاتی یعنی کریڈٹ کارڈ کیا چیز ہے ؟ یہ فقہ کا مسئلہ ہے۔

''فقہ الواقع''کو ہر لحاظ سے جان لینے کے بعد اس پر''فقہ الاحکام''کے اصول وضوابط لاگو ہوں گے۔یہاں اجتہاد کی یہ صورت ہو گی کہ فقہ الواقع کو فقہ الاحکام سے پرکھا جائے گا۔

اجتہاد کی ایک صورت حکم شرعی کی تلاش ہے جبکہ دوسری صورت اس حکم کا اطلاق۔اجتہاد کی دوسری قسم کو فقہاء کی اصطلاح میں تحقیق المناط بھی کہتے ہیں۔پس حکم شرعی کے اطلاق میں فقہ الواقع کا علم ہونا ازبس ضروری ہے۔عصر حاضر میں تحقیق المناط میں صحیح رائے تک پہنچنے کے لیے اجتماعی اجتہاد ایک بنیادی ضرورت کا درجہ رکھتا ہے۔اس کی صورت یہ ہو گی کہ علماء

---

1 الاجتہاد الجماعی ودور المجامع الفقہیۃ فی تطبیقہ: ص ۱۲۲

کی ایک جماعت کسی بھی جدید مسلے میں متعلقہ علوم کے ماہرین فن کے ساتھ بیٹھ کر پہلے اس مسلے کو سمجھے گی اور پھر اس پر حکم شرعی کا اطلاق کرے گی۔ یہ واضح رہے کہ ''فقہ الواقع'' کو سمجھنے میں تو ماہرین ان سے مشورہ کیا جائے گا، لیکن حکم کا اطلاق صرف علماء کرام کا گروہ ہی کرے گی۔ڈاکٹر عبدالمجید السوسوۃ لکھتے ہیں:

''اکثر و بیشتر نئے مسائل کو اس قدر متضاد حالات اور انواع نے احاطہ کیا ہوتا ہے اور ان مسائل کا دوسرے واقعات اور علوم کے ساتھ ایسا ربط ہوتا ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے بنا ان مسائل کے تمام شکلوں اور متعلقات کو گھیرنے پر قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ تنہا بندے کے لیے یہ قدرے مشکل ہے کہ وہ ان مسائل سے متعلقہ حمہ علوم و فنون کا احاطہ کر سکے، لہٰذا ان مسائل میں ذاتی اجتہادی آراء عام طور پر خطا پر منحصر ہوتی ہے۔ پس کبھی کبھی ایک عالم اور الجھے ہوئے مسائل میں ایک جہت کو مد نظر رکھتا ہے تو دوسرا جہت نظروں سے غائب رہتا ہے، جس کی بنا پر ناقص رائے سامنے آتی ہے۔''[1]

کبھی کبھی ''فقہ الواقع'' کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھنے کے سبب علماء کے لیے انفرادی طور پر اجتہاد میں غلطی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں اور کسی حتمی رائے تک پہنچنے میں زیادہ دیر لگ جاتی ہے۔ مولانا زاہد الراشدیؒ فرماتے ہیں:

''دوسری جانب علماء کا یہ طریقہ کار بھی قابل گرفت ہے، کہ متعلقہ مسئلہ کے حکم و علت اور اس کے حوالے سے مروجہ عرف سے ناواقفیت کے خلا کو متعلقہ شعبہ کے بعض لوگوں سے سوال و جواب کی شکل میں پُر کرنے پر اتفاق کیا جاتا ہے، اور زمانے اور مروجہ عرف سے اس درجہ کی ''عملی ممارست'' کو لازمی سمجھا جا رہا ہے، جو کسی زمانے میں فقہاء کا طرہ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ مثلاً عبادات اور لاؤڈ سپیکر کے جواز و عدم جواز کی بحث پر ایک نگاہ ڈال لیجئے جس میں لمبے بحث کے بعد کسی حتمی انجام تک پہنچنے میں ہمیں تقریباً صدی کا وقت لگا اور اگر اس کے وجوہات کا تجزیہ کریں تو سب سے بڑی وجہ لاؤڈ سپیکر کے معاملات ''عملی ممارست'' کا فقدان قرار پائے گا جس نے ہمیں ربع صدی تک تکنیکی بحث میں الجھائے رکھا۔''[2]

وسائل حمل و نقل کا ارتقاء:

ائمہ سلف کے دور میں وسائل حمل و نقل بہت کم تھے۔ ایک سے دوسرے شہر سفر کرنے کے لیے سینکڑوں میل کا فاصلہ اونٹوں، گھوڑوں اور خچروں پر مہینوں میں طے کیا جاتا تھا۔ اس لیے ایک شہر کے علماء کے لیے ایک جگہ جمع ہونا تو کسی قدر ممکن تھا لیکن مختلف اسلامی شہروں کے علماء و مجتہدین کا جمع ہو کر کوئی فقہی مجلس قائم کرنا اور اس مجلس کے ماہانہ یا سالانہ بنیادوں پر اجلاس منعقد کرنا ایک بہت مشکل امر تھا۔ عصر حاضر میں ذرائع حمل و نقل میں انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے دنیا کے تمام یا اکثر ممالک کے علماء کو ماہانہ یا سالانہ بنیادوں پر جمع کرنا بہت ہی آسان اور سہل ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک جگہ جمع ہوئے بغیر بھی کسی

---

1 الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی: ص۸۷

2 عصر حاضر میں اجتہاد، چند فکری و عملی مباحث، س-ن، ص۱۴۸

فقہی مجلس کے انعقاد کے امکانات آئے روز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔انٹرنیٹ، ٹیلی فون، موبائل، کمپیوٹر اور کیبل وغیرہ نے باہمی رابطے کو بہت ہی آسان کر دیا ہے۔ ہوائی جہاز نے ایک ملک سے دوسرے ملک بلکہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک کے سفر کو بھی آسان کر دیا ہے۔ماضی میں جہاں انسان مہینوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پہنچتا تھا، آج وہاں گھنٹوں میں پہنچا جا رہا ہے۔ڈاکٹر محمد الدسوقی لکھتے ہیں:

''ہمارا معاصر ماحول ہم سے دو اسباب کی بنا پر اجتماعی اجتہاد کے اہتمام کا مطالبہ کرتا ہے۔پہلا سبب تو یہ ہے کہ گھر اور علاقے جس قدر دور ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی فقہاء کے لیے ایک جگہ مل بیٹھنا آسان ہو گیا ہے اور یہ آسانی معاصر زرائع مواصلات سے پیدا ہوئی ہے جیسا کہ ساری دنیا نے مل کر ایک بین الاقوامی تنظیم بنائی ہوئی ہے جو مختلف ممالک کی مشکلات پر غور و فکر کرتی ہے، اور ان کے بارے میں قرار دادیں پاس کرتی ہے، اسی طرح عالم اسلام کے لیے بھی یہ ممکن ہے کہ ان کی ایک فقہی کانفرنس ہو جس میں ائمہ فقہاء کی باہم ملاقات ہو۔فقہاء کی یہ کانفرنس سیاسی خواہشات اور باہم دگر متضاد فکری رجحانات سے دور رہتے ہوئے ایک طے شدہ علمی لائحہ عمل کے مطابق ان مسائل پر بحث کرے جو آج امت کو درپیش ہیں''[1]

اب تو ویڈیو کانفرنس کا تصور بھی بہت عام ہو گیا ہے۔جس میں کچھ لوگ ایک جگہ موجود ہیں جبکہ کچھ دوسرے اصحاب ٹی وی سکرین کے ذریعے اس مجلس کی گفتگو میں شریک ہوتے ہیں۔مجلس کی کاروائی کا گھر بیٹھے مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور پھر ٹیلی فونک رابطے کے زریعے اپنی آراء تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔

انفرادی اجتہاد کے منفی نتائج کا سد باب:

بعض علماء دین کا یہ خیال ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد کے عمل سے اس لیے منع کیا گیا کہ نااہل لوگ مجتہد بن بیٹھیں گے۔فتوی دینے میں جلدی اور جرات کا مظاہرہ کریں گے لہٰذا خود بھی راہ راست سے ہٹ جائیں گے اور دوسروں کو بھی راہ راست سے ہٹا دیں گے۔چوتھی صدی ہجری اور مابعد کے ائمہ سلف نے اجتہاد کا انکار اس معنی میں نہیں کیا کہ وہ قیامت تک کے لیے اجتہاد کے دروازے کو بند کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے پیش نظر یہ خدشہ تھا کہ بغیر اہلیت و صلاحیت کے لوگ مجتہد ہونے کا دعوی کریں گے اور فکری و علمی انتشار میں اضافے کا سبب بنیں گے، جبکہ عصر حاضر میں انفرادی اجتہاد کے عمل کو اجتماعیت کے ذریعے منضبط کیا جا سکتا ہے اور ائمہ سلف کی نسبت معاصر علماء وضبط کی جو کمی یا نقص پایا جاتا ہے اسے ایک جماعت کا علم یا ضبط پورا کر سکتا ہے۔آج انفرادی طور پر کسی شخص کا مجتہد مطلق ہونا تو مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن عالم اسلام کے نامور علماء کی ایک فقہی مجلس مجتہد مطلق کی جگہ کفایت کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمیدؒ لکھتے ہیں:

1الاجتہاد الجماعی ودور المجامع الفقھیہ فی تطبیقہ: ص ۱۳۴

"شروع شروع میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا جو فتویٰ جاری کیا گیا تو اس سے مقصود انفرادی اجتہاد پر پابندی لگانی تھی تاکہ نااہل لوگوں کو اجتہاد سے دور رکھا جاسکے۔ اس کے برعکس یہ کج فہمی عام ہوگئی اور رواج پاگئی کہ سلف کا مقصود مطلق طور پر اجتہاد کی ممانعت تھی جبکہ اصل ذمہ داری یہ تھی کہ اجتہاد کے عمل میں لاقانونیت کو منظم کیا جاتا اور یہ عمل ایک فرد کی بجائے جماعت کے ہاتھ میں پکڑایا جاتا، بجائے اس کے اس کا علاج یہ کیا جائے کہ اجتہاد کا دروازہ ہی بن کر دیا جائے۔"[1]

ڈاکٹر محمد سلام مدکورؒ عصر حاضر کے مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب تو یہ ہو رہا ہے کہ ہر وہ شخص جس میں کچھ فقہی بصیرت پائی جاتی ہو، اجتہاد کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور لوگوں کے سامنے اپنی اجتہادی آراء پیش کرنا شروع کر دیتا ہے، اگرچہ اس میں اجتہاد کی اہلیت نہ بھی ہو اور اس میں اجتہاد کی اکثر شروط بھی نہ پائی جاتی ہوں۔ پس متضاد آراء اور پریشان خیالیاں سامنے آتی ہیں اور عوام الناس جس کو بھی پڑھتے یا سنتے ہیں حیرت کے سمندر کے ڈوب جاتے ہیں۔"[2]

جدید مسائل کا پیچیدہ ہونا:

علوم و معارف کی ترقی اور ایجادات کے انقلاب نے مسائل کو بہت زیادہ گھمبیر اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کی معاشرت، رہن سہن، کاروبار زندگی اور روزمرہ کے معاملات انتہائی سادہ تھے لہٰذا ایک فقیہ اور مجتہد کے لیے واقعاتی صورت حال کو سمجھنا اور اس کے بارے میں کوئی شرعی رہنمائی فراہم کرنا آسان تھا۔ عصر حاضر میں زندگی کے مختلف شعبے اور علوم اس طرح آپس میں مل گئے ہیں کہ ان کی تنقیح اور چھان پھٹک کرتے ہوئے اصل واقعاتی صورت کو نکھارنا اکیلے فرد کے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فقہ الواقع کو نکھارنے کے لیے ماہرین فن کی ایک جماعت چاہیے جو مختلف علوم کی روشنی میں متعدد پہلوؤں سے واقعے کی صورت حال کو واضح کرنے کی کوشش کریں۔ **ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیل** لکھتے ہیں:

"انسانی زندگی کی نشوونما اور ترقی سے کئی ایک پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے ہیں مثلاً بینکوں کے ساتھ معاملات کی حدود، تجارتی، زرعی اور سرمایہ کارانہ مقاصد کے تحت قرضے جاری کرنا، انشورنس کے مختلف مسائل، جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں کہ جن کے اصل زر کا علم نہ ہو، جدید معاشی عقود مثلاً برآمدات اور اسٹاک ایکسچینج نے جو قیمت نکالی ہے اس حصص کی خرید و فروخت، بحری اور ہوائی جہازوں کو آڈر پر تیار کروانے کے معاہدے وغیرہ، کرنسی کے تبادلے اور خرید و فروخت کے صیغوں کی رعایت، ہنڈی اور ڈرافٹ بل کی ادائیگی، میعادی بیوع، زمین کی پیداوار کے عوض اس کا کرایہ، قرض کی واپسی اس کے حصول والے دن کی

---

1 الاجتہاد الجماعی ودور المجامع الفقہیہ فی تطبیقہ، ص ۱۳۴

2 الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی: ص ۸۵-۸۶

قیمت پر ہو گی یا اس مسلے میں کوئی رستہ نکالا جائے گا، جدید آلات اتصال مثلاً فیکس، ٹیلی فیکس اور ای میل وغیرہ کے ذریعے عقود کا اجراء، ایک جسم سے دوسرے جسم میں اعضاء کی منتقلی، اور خاص طور پر نئے اعضاء تخلیق کر کے ان کی پیوند کاری کہ جس میں ڈاکٹروں کی ایک خاص رائے ہے اور اس کے علاوہ کئی ایک جدید مسائل ایسے ہیں کہ جن میں انفرادی اجتہاد کفایت نہیں کرے گا بلکہ اس میں باہمی مشاورت اور علماء کی ایک جماعت کی آراء سے کوئی نکالی جائے گی۔"[1]

مجتہد مطلق کے حصول میں ابعاد:

یہ فکر بھی علماء کے حلقے میں عام پائی جاتی کہ علوم و معارف کی وسعت اور فقہ الواقع کے تنوع کے وجہ سے عصر حاضر میں مجتہد مطلق کا وجود بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اجتماعی اجتہادات کے ذریعے فقہی مجالس اس خلاء کو پر کر سکتی ہیں۔ اگرچہ انفرادی طور پر علماء میں مجتہد مطلق کی شرائط کا کامل درجے میں پایا جانا ناممکن ہے لیکن مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے علماء مخصصین کی ایک جماعت اجتماعی طور پر ان شرائط پر پورا اتر سکتی ہے جو سلف صالحین نے اجتہاد مطلق کے ذیل میں بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر عبد المجید لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد سے اجتہاد کی دو سطحوں پر کمال پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو مجتہدین کی سطح پر اور دوسرا محل اجتہاد یعنی واقعاتی سطح پر۔ جہاں تک مجتہد کی سطح پر کمالیت کے حصول کا معاملہ ہے تو اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ درجہ اجتہاد تک پہنچنے کے لیے جو شروط مقرر کی گئی ہیں، ہمارے اس زمانے میں ان تک پہنچنا بہت ہی مشکل ہے۔ اسی لیے اجتماعی اجتہاد میں علماء میں سے بعض، بعض کی تکمیل کرتے ہیں اور اس طرح مجموعی طور پر یہ سب علماء مطلق کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں۔"[2]

اجتماعی فقہ کا حصول:

اجتماعی اجتہاد کا ایک اہم محرک یہ بھی ہے کہ اس طرح کرنے سے تدوین ہونے والی فقہ اسلامی فقہ کہلائے گی۔ اس اجتماعی فقہ کی مسلمانوں کی معاشرتی حیات پر گہرے اور مثبت اثرات برآمد ہوں گے۔ باہمی منافرت کی جگہ محبت و الفت کی فضا پروان چڑھے گی۔ مختلف مکاتب فکر کے علماء اور ان کے متبعین کے لیے ہمدردی اخوت کا جذبہ نمایاں رہے گا۔ عامۃ الناس کا علماء کے طبقے پر اعتماد بڑھے گا اور اسلام کے بارے میں سیکولر عناصر کا یہ اعتراض رفع ہو جائے گا کہ کون سا اسلام درست ہے؟ حنفی، شافعی، مالکی، یا حنبلی؟ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ فرماتے ہیں:

"موجودہ دور میں اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں غور و فکر ہو رہا ہے، اسلام کی دستور سازی قانون پر کتابیں لکھی جا رہی ہے

---

1 الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه: ص ۱۱۹۔ ۱۲۰

2 الاجتهاد الجماعي في التشريع الاسلامي: ص ۹۰

۔مختلف مسلمان ممالک میں آئینی تصورات پر مباحثے ہو رہے ہیں۔یہ عمل پاکستان، مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں بھی ہو رہا ہے۔ان میں سے کسی کام کو، شافعی، حنفی، حنبلی، مالکی مسلک کی حدود میں بند نہیں کیا جا سکتا، اس وقت دنیائے اسلام میں ''اسلامی دستور سازی'' کا کام ہو رہا ہے۔''حنفی دستور سازی'' یا ''مالکی'' اور ''حنبلی دستور سازی'' کا کام نہیں ہو رہا ہے۔پاکستان میں اگر اسلامی دستور کی طرف پیش رفت ہوئی ہے تو وہ اسلامی دستور کی طرف پیش رفت ہوئی ہے، کسی حنفی یا مالکی دستور کی طرف پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔اس لیے فقہ اسلامی کا یہ جدید ارتقاء اور جدید رجحان مسلکی حدود سے بالاتر ہے، اس لیے آئندہ آنے والے سال، عشرے یا صدی فقہ اسلامی کی مشترک صدی ہو گی۔''[1]

ایک تو جدید مسائل میں اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اسلامی فقہ کا حصول ہے، اسی طرح مذاہب اربعہ اور اہل الحدیث کے کبار علماء پر مشتمل ایک ایسی فقہی مجلس تشکیل دینی چاہیے جو سابقہ فقہی اقوال میں اجتہاد کرتے ہوئے ان میں راجح و مرجوح کا تعین کرے اور جمیع فقہی مذاہب سے استفادہ کرتے ہوئے فقہ اسلامی کا ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جائے۔دوسری بات یہ ہے کہ مختلف مکتبہ فکر کے علماء کی ایک جماعت اجتماعی اجتہاد کے لیے جمع ہو گی تو وہ کسی ایک مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے یا ایک ہی فقہ کے اصول و فروع پر اپنے اجتہاد کے بنیاد نہیں رکھے گی بلکہ اجتہاد کی اس قسم میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری اور اہل الحدیث کے مصادر علمیہ سے یکساں طور پر استفادہ کیا جائے گا یعنی سلف صالحین کے جمیع فقہی ذخیرے کو ایک ہی فقہ شمار کرتے ہوئے اس سے استفادہ ممکن ہو گا۔ڈاکٹر طاہر منصوری لکھتے ہیں:

''اجتماعی اجتہاد کی سب سے بڑی اور اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں تقریباً تمام فقہی مسالک اور ان سے متعلق فقہی ذخیرہ کو ایک باہمی اور مشترکہ علمی ورثہ کا درجہ حاصل ہے۔اس اجتماعی اجتہاد سے تمام مسالک کے فقہاء فائدہ حاصل کرتے ہیں بالخصوص جدید دور کے نت نئے مسائل کے حل کے لیے کسی ایک فقہ پر انحصار کرنے کے بجائے اس اجتماعی اجتہاد کے فقہی ذخیرے سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے اور ایسا نقطہ نظر اختیار کیا جاتا ہے کہ جو ایک طرف تو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ہو اور دوسری طرف اس کے احکامات جدید دور کے تقاضوں سے موافقت بھی رکھتے ہوں یوں پوری امت مسلمہ کا ایک مشترکہ علمی، نظری اور دستوری سرمایہ ایک نئی مشترکہ فقہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔''[2]

سلف صالحین کے طریقے کی اتباع:

اجتماعی اجتہاد کا منہج و طریقہ کار کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ دور نبوت، خلفائے راشدین، تابعین، عظام اور ائمہ اربعہ کے دور میں اس کا بہت رواج تھا۔خلفائے راشدین کا دور اجتماعی اجتہاد کے عروج کا زمانہ ہے۔حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ

---

1 ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات فقہ، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۷۷۔۴۷۸

2 اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، صفحہ ل

کا طرز عمل یہ تھا کہ جب ان کو کوئی نیا مسلہ درپیش ہوتا تو مدینہ میں موجود صحابہ رضی اللہ کو بلواتے اور ان سے اس بارے مشورہ لیتے تھے اور باہمی مشاورت کے بعد کوئی رائے جاری کر دیتے تھے۔ تابعین کے زمانے میں مدینہ میں فقہائے سبعہ کی علمی مجلس قائم تھی۔ تاریخ کی کتب میں حضرت امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی فقہی مجالس کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ ائمہ اربعہ کے دور کے بعد بھی تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار میں گاہے بگاہے اجتماعی اجتہاد کی کاوشیں جاری رہیں۔ برصغیر پاک وہند میں فتاوی عالمگیریہ اور سلطنت عثمانیہ میں ''مجلۃ الاحکام العربیۃ'' کی ترتیب وتدوین اجتماعی اجتہادی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے۔ لہٰذا عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد کے طریقہ کار کو فروغ دینا در حقیقت خیر القرون کی سنت کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ فرماتے ہیں:

''یہ اجتماعی اجتہاد و قیاس اس امت میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ غور کیا جائے تو پورے تسلسل کے ساتھ اس کی نظریں ہمیں پچھلے چودہ سو سال کے اندر ملتی ہیں اور خود عہد رسالت کے اندر ملتی ہیں۔ اساری بدر (بدر کے قیدیوں) کے واقعہ میں سرور کائناتؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جائے؟ حضرات علمائے کرام کو معلوم ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا، اس میں خطا ہوئی اور اس پر عتاب بھی ہوا، یہ اجتماعی اجتہاد تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی ایسی ایک مجلس بنائی تھی ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ جو بھی نئے مسائل امت کو پیش آتے، خلفائے راشدین صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے ان سے دریافت کرتے کہ آپ نے کوئی حدیث اس حوالے سے نبی ﷺ سے سنی ہو تو بتائیں، اگر حدیث مل جاتی تو فیصلہ ہو جاتا ورنہ اجتہاد و قیاس سے فیصلہ کیا جاتا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے شاگردوں کے ساتھ بحث و مذاکرہ کا سلسلہ قائم فرمایا اور تقریباً چالیس عظیم المرتبت تلامذہ کے ساتھ اجتماعی اجتہاد و قیاس کا سلسلہ جاری رکھا۔ عالمگیرؒ نے فتاوی عالمگیریہ مرتب کرنے کے لیے علماء کو جمع کیا، اس زمانے میں حالات بدلے ہوئے تھے، نئے مسائل پیدا ہوتے تھے۔ انہیں حل کرنے کی ضرورت تھی اسی لیے فتاوی عالمگیریہ مرتب ہوا۔ اس زمانہ کے فقہاء کی جلیل القدر جماعت مقرر کی گئی۔ "مجلۃ الاحکام العدلیۃ" خلافت عثمانیہ میں مرتب ہوا، یہ بھی علماء ہی کی ایک عظیم جماعت نے مرتب کیا۔"[1]

قانون سازی میں معاونت:

اسلامی تاریخ کے چودہ سو سالوں میں کسی خطہ ارضی میں کوئی متعین اسلامی قانون نافذ نہیں رہا بلکہ عدالتوں میں موجود مجتہد قاضی کسی ایک خاص مسلک کی فروعات یا اپنے ذاتی اجتہادات کی روشنی میں مقدمات کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ اسلامی ممالک میں قانون سازی کا رواج مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ غیر مسلم ممالک، ریاستوں اور اداروں کے ساتھ تجارتی، معاشی اور معاشرتی علائق زیادہ ہونے کے سبب مسلم ریاستوں میں بھی دستور سازی کی ضرورت معلوم ہوئی۔ اکثر اسلامی ملکوں میں علماء

---

1 جدید فقہی مباحث، ۲/ ۳۱

کرام نے دستور سازی کے اس عمل کو قرآن وسنت کی روشنی میں آگے بڑھانے پر زور دیا۔ جس وجہ سے عصر حاضر میں فقہی اقوال کی قانون سازی کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ اکثر و بیشتر اسلامی ملکوں یںں سلف صالحین کے فقہی ذخائر سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی دستور سازی کی جانب پیش رفت ہو رہی ہے۔ دستور سازی کے اس عمل کی شرعی حیثیت کے بارے میں علماء کی کیا آراء ہیں؟ دستور سازی کا یہ عمل اسی صورت بہتر اور مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکتا ہے، جبکہ اس کی بنیاد اجتماعی اجتہاد ہو۔ اگر کسی ایک شخص کی اجتہادی آراء کو بطور قانون نافذ کر دیا جائے گا تو اس میں بہت سی کوتاہیاں ہو گی۔ علاوہ ازیں اجتماعی اجتہاد کی بنیاد پر قانون سازی کرنے کی صورت میں عوام الناس کا اطمینان نسبتاً زیادہ حاصل ہو گا۔ شیخ احمد شاکرؒ لکھتے ہیں:

" انفرادی اجتہاد قوانین کے وضع کرنے میں فائدہ مند نہیں ہے، بلکہ شائد ناممکن ہے، کہ ایک یا ایک سے زائد کچھ افراد مل کر یہ کام کر سکیں، اس کا درست طریقہ کار یہی ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے ذریعے یہ کام ہو جائے، جب افکار کا باہم تبادلہ خیال ہو جائے اور آراء عام ہو جائے تو اللہ کے حکم سے صحیح رائے سامنے آ ہی جاتی ہے۔[1]

شیخ احمد شاکرؒ ایک اور جگہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کا طریقہ بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری رائے میں اس کا عملی طریقہ کار یہ ہے کہ ماہرین قانون اور علمائے شریعت کے ماہرین کی ایک جماعت منتخب کی جائے جو کسی خاص مذہب کی تقلید یا کسی خاص رائے کی پابندی کے بغیر، نصوص قرآن وسنت کی روشنی میں، نئے قانون سازی کے قواعد و ضوابط ایجاد کرے۔ یہ کمیٹی سابقہ ائمہ کے اصول اور فقہی آراء کو سامنے رکھے۔ تمام ماہرین قانون اس کمیٹی کی سرپرستی میں ہوں اور پھر یہ کمیٹی لوگوں کے احوال و ظروف کے مناسب اور کتاب وسنت کے قواعد کے تحت فروعی مسائل مستنبط کرے لیکن اس کے اجتہادات نہ تو کسی نص سے متصادم ہوں اور نہ ہی دین کی کسی ضروری شیءکے انکار پر مبنی ہوں۔"[2]

عوامی مسائل میں اجتماعی اجتہاد:

نفس مسلہ کے اعتبار سے مسائل کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم تو ان مسائل کی ہے جو کسی شخص کی انفرادی زندگی سے متعلق ہیں جیسا نماز، روزہ اور ذاتی معاملات وغیرہ۔ مسائل کی دوسری قسم وہ ہے جن کی نوعیت عمومی ہوتی ہے یعنی وہ پوری قوم یا قوم کی اکثریت کے مسائل ہوتے ہیں۔ لہذا ایسے مسائل میں اجتماعی اجتہاد کے ذریعے کوئی فیصلہ جاری کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر خلیفہ وقت کی تقرری پوری امت کا اتفاقی مسلہ ہے۔ اس مسلے میں پوری امت یا امت کے منتخب نمائندوں کی اجتماعی رائے کی روشنی میں خلیفہ وقت کا انتخاب ہونا چاہیے۔

استاذ علی حسب اللہؒ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ احکام شرعیہ کی دو قسمیں ہیں:

---

1 الاجتہاد الجماعی و دور المجامع الفقھیۃ فی تطبیقہ، ص، ۱۲۸

2 الاجتہاد الجماعی و دور المجامع الفقھیۃ فی تطبیقہ، ص ۱۲۹

پہلی قسم کے احکامات وہ ہیں جن کا تعلق عبادات سے ہے یعنی وہ براہ راست اللہ سے متعلق امور ہیں۔ یہ ایسے امور ہیں کہ جن میں اختلافات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ان مسائل میں انفرادی اجتہاد بھی کفایت کر جاتا ہے بشرطیکہ کہ کسی میں اس کی شروط پوری ہوں۔ دوسری قسم کے مسائل وہ ہیں جو معاملات سے متعلق ہیں۔اس حوالے سے مزید گفتگو کرکے فرماتے ہیں:

"اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایک دوسرے سے باہمی معاملات سے متعلق ہیں۔ان مسائل میں اختلاف نظام سے دوری اور عدل سے اجتناب کی طرف لے جاتا ہے، خاص طور پر جبکہ معاشرہ ایک ہی ہو یا ایک ہی جیسے معاشرے ہوں۔ایسی جگہ میں وہی اجتہاد کوئی علمی فائدہ دیتا ہے جو اجتماعی جہت پر مبنی ہو یعنی علمائے مجتہدین کی ایک گروہ نئے پیش آنے والے مسائل میں غور وتدبر کرے اور سلف صالحین کی آراء کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق اجتہادی آراء کی استنباط کریں۔ یہ اجتماعی اجتہادات نافذ العمل ہونگے۔ ریاست کے تمام لوگوں پر ان کی اطاعت فرض ہوگی اور قاضی ان کے مقتضیات کے مطابق عدالتوں میں فیصلے کریں گے۔"[1]

دسمبر ۱۹۸۰ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا[2] کی طرف سے ہمدرد کنونشن سنٹر، نیو دہلی میں دوسرا فقہی سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کا صدارتی خطبہ جناب مولانا رفیع عثمانیؒ نے پڑھا، جس کا موضوع، تغیر پذیر حالات میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت تھی۔ مولانا اپنے اس خطبے میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت واہمیت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"میرے والد (یعنی مفتی شفیع صاحبؒ) فرماتے تھے، ایسے اجتماعی مسائل جو پوری امت کو درپیش ہیں یا ملک کے تمام مسلمانوں کو درپیش ہیں ان میں انفرادی فتاوی نہ دیئے جائیں۔ان میں باہمی مشورہ ضروری ہے اور تمام بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔ پاکستان میں بھی حضرت والدؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو آج بھی "مجلس تحقیق مسائل حاضرة" کے نام سے موجود ہے۔اس مجلس کی طرف سے کئی ایک رسائل شائع ہوئے، ایک ایک مسلہ پر بعض اوقات دو دو سال تحقیق ہوتی رہی۔"[3]

اجماع کا حصول:

قرآن وسنت کے بعد اجماع مجتہدین ایک اہم شرعی دلیل ہے۔ عصر حاضر میں اجماع کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ اجتماعی اجتہاد ہے۔اجماع کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ایک اجماع تام کہ جس میں اجماع کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں اور دوسرا اجماع

---

1 الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه، ص ۱۲۷۔۱۲۸

2 انڈیا پاکستان کے شمال اور جنوبی ایشیا میں واقع ہے۔ {وکیپیڈیا}

3 جدید فقہی مباحث: ۲/ ۳۱۔۳۲

ناقص کہ جس میں اجماع کی بعض شرائط مفقود ہوں۔ اجتماعی اجتہاد ایک اعتبار سے اجماع ناقص ہوتا ہے لیکن اجماع تام کے درجے کو پہنچ سکتا ہے۔ڈاکٹر توفیق الشاویؒ لکھتے ہیں:

''بعض مفکرین کا کہنا یہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد، اجماع تام تک پہنچنے کے لیے ایک پل کا کام دے سکتا ہے، اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جس مسلے میں علماء دین کی کوئی اجتماعی رائے سامنے آئے، اسے بقیہ علمائے مجتہدین کے سامنے پیش کیا جائے۔ پس اگروہ صراحتاًاس کی تائید کردیں تو یہ اجماع صریح کہلائے گا اور اگروہ اس کو جاننے کے بعد اس میں خاموشی اختیار کریں تو یہ اجماع سکوتی کہلائے گا۔'' [1]

استاذ علی حسب اللہؒ لکھتے ہیں:

''بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ اجتماعی اجتہاد کو اجماع ناقص شمار کرلیا جائے جیسا کہ علماء نے اجماع کی دو اقسام بیان کی ہیں: اجماع کامل اور اس سے مراد تمام مجتہدین کا متفق ہونا ہے اور اجماع ناقص کہ جس میں اکثر مجتہدین کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس کو بعض اوقات اجتماعی اجتہاد بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس رائے کے حاملین کا کہنا یہ ہے کہ اجماع کامل، امر واقعہ میں صرف انہی مسائل میں ثابت شدہ ہے، جو ضروریات دین سے متعلق ہیں اور ان مسائل میں آپ جس بھی عالم دین سے ملیں گے وہ آپ کی موافقت ہی اختیار کرتے گا اور اپنے ماقبل والوں سے اس کو نقل کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اس بات پر اجماع کہ دادا، بھائیوں کی موجودگی میں بھی وارث ہوتا ہے اور یہ کہ دادی کے ساتھ نکاح ماں کی طرح حرام ہے اور اگر ماں نہ ہو تو دادی 1/6 کی وارث ہوتی ہے اور یہ کہ ام الولد (وہ لونڈی جس سے مالک کی اولاد ہو) کی بیع حرام ہے۔'' [2]

بعض علماء نے اجتماعی اجتہاد کو اجماع واقعی کا نام دیا ہے۔ ان علماء کا کہنا یہ ہے کہ اصول فقہ کی اصطلاح میں اجماع تام امر واقعہ میں کبھی بھی واقع نہیں ہوا بلکہ صحابہ رضی اللہ کے دور میں بھی جن مسائل پر اجماع کا دعوی کیا جاتا ہے وہ در حقیقت جمہور صحابہؓ کے اجتماعی اجتہاد سے ثابت شدہ مسائل ہیں۔ڈاکٹر عبد المجید السوسوةؒ لکھتے ہیں:

''پس جب اجماع کی بنیاد یعنی جمیع مجتہدین کا اتفاق تو ناممکن ہے لیکن اکثر مجتہدین کا اتفاق ایک ناممکن امر نہیں ہے اسی تصور کے بارے میں بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ اصولی اجماع کبھی واقع ہی نہیں ہوا بلکہ در حقیقت اجتماعی اجتہادات کا وقوع ہوا ہے اور جس کو اجماع کا نام دیا گیا ہے وہ اصل میں اجتماعی اجتہاد ہے۔ ان علماء نے اجتماعی اجتہاد کو اجماع واقعی کا نام دیا ہے یعنی یہ مختلف اسلامی ادوار میں بالفعل واقع ہوا ہے جبکہ اصولی اجماع عملی طور پر کبھی بھی واقع نہیں ہوا۔ اس رائے کی دلیل یہ بھی ہے کہ صحابہؓ کے بارے میں جن اجماعات کا دعوی کیا گیا ہے، وہ در حقیقت اجتماعی اجتہادات تھے کیونکہ جب بھی خلفاء کو کوئی ایسا مسلہ در پیش

---

1 فقہ الشوری والاشتشارۃ، ص ۱۸۶

2 الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، ص ۸۲

ہوتا کہ جس میں کتاب وسنت کی کوئی صریح نص موجود نہ ہوتی تو وہ مسلمانوں کے سرداروں، بہترین لوگوں اور علماء کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے تھے۔ جس رائے پر ان کا یہ مشورہ ختم ہوتا اس کو حکم شرعی تصور کیا جاتا۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اجتماعی اجتہاد تھا۔ کیونکہ اس مشاورت کے لیے جو لوگ جمع ہوتے تھے وہ جمیع صحابہ رضی اللہ نہ تھے۔ خلفاء میں سے کسی ایک کے حوالے سے بھی یہ مروی نہیں ہے کہ اس نے مشاورت میں شریک صحابہؓ کے علاوہ اور دوسرے شہروں میں موجود بقیہ علماء صحابہؓ کی رائے کی موافقت ہونے تک حکم شرعی میں توقف کیا ہو۔" [1]

اجتماعی اجتہاد کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ اگر اس میں جمہور کا اتفاق ہو جائے تو اس اتفاق کو اجماع کی سی حجیت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شعبان محمد اسماعیلؒ لکھتے ہیں:

"غالباً وہ جدید مسائل کہ جن میں قرآن وسنت میں کوئی صراحت نہیں ہے، ان میں ایسی دنیاوی مصالح، جو زمان ومکان کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں، کی وجہ سے رائے دہی کا امکان ہے جیسا کہ کسی شخص کی امامت پر اجماع ہے یا دشمن سے اعلان جنگ پر اتفاق ہے۔ یہ فی الواقع اجتماعی اجتہاد ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور اس اجتماعی اجتہاد کو اجماع جیسی کامل حجیت حاصل ہوتی ہے۔ جلیل القدر علماء کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے جیسا کہ امام ابن جریر طبری، ابو بکر رازی، ابوالحسن خیاط، معتزلہ کی ایک جماعت اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ کی یہی رائے ہے۔" [2]

شوریٰ کے قرآنی حکم کی تعمیل:

قرآن پاک میں اللہ کے رسول ﷺ کو مختلف مسائل میں صحابہؓ سے مشورہ کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَشَاوِرْهُمْ فِيْ الْاَمْرِ} [3]

"اور اے نبی ﷺ ان سے مختلف امور میں مشاورت فرمائیں"

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مَا رَاَيْتُ اَحَد اَكْثَرَ مَشْوَرَة لِاَصْحَابِهِ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ" [4]

"میں اللہ کے پیغمبر ﷺ سے زیادہ کسی کو بھی صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا"

---

[1] الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، ص ۸۱۔ ۸۲

[2] الاجتہاد الجماعی واھمیۃ فی مواجھۃ مشکلات العصر ص ۶۵

[3] آل عمران ۳ : ۱۵۹

[4] تفسیر ابن ابی حاتم: ۳/ ۸۰۱

بعض ائمہ سلف کی رائے یہ بھی ہے کہ آپ کو صحابہؓ سے مشاورت کا جو حکم دیا گیا تھا، اس کے جاری کرنے کی حکمت یہ تھی کہ مابعد کے زمانوں میں آنے والوں کے لیے بطور سنت آپؐ کا یہ فعل جاری ہو جائے۔ حضرت حسن بصریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قَدْ عَلِمَ اِنَّہٗ لَيْسَ بِہِ اِلَيْهِمْ حَاجَۃً وَرُبَّمَا قَالَ: لَيْسَ لَہٗ اِلَيْهِمْ حَاجَۃً وَلٰكِنْ اَرَادَ اَنْ يَّسْتَنَّ بِہِ مِن بَعْدِہِ "[1]

"یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کو صحابہؓ سے مشورے کی حاجت و ضرورت نہ تھی، لیکن آپ ﷺ نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے مابعد والوں کے لیے اس بارے میں کوئی سنت جاری کریں"۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ }[2]

"اور ان (یعنی آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ) کے فیصلے باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں"۔

ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃؒ لکھتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد میں اجتہادی شوری کی بنیاد پوری ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ فقہی مجلس کے مختلف اراکین آراء کے باہمی تبادلہ، افکار کی چھان پھٹک اور ان کو ہر اعتبار سے پرکھتے ہوئے باہمی مشاورت کی مشق کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ سب ایک یا ان کی اکثریت ایک رائے پر متفق ہو جائیں۔ اس عمل میں شوری کے اس بنیادی حکم کی تعمیل ہے جس کا حکم اللہ نے اور ان کے معاملات ایک دوسرے کے مشاورت سے ہوتے ہیں اور ان سے معاملات میں مشورہ کریں، میں دیا ہے۔"[3]

حکم شرعی کی تلاش میں صحیح تر رائے کا حصول:

اجتہادی مسائل میں خطا کا امکان برابر باقی رہتا ہے۔ مجتہد جب اجتہاد کرتا ہے تو کبھی کبھی اس کا اجتہاد صحیح ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں غلط، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

"اِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهِدْ ثُمَّ اَصَابَ فَلَہٗ اَجْر انِ وَاِذَا حَكَمَ فَاجْتَهِدْ ثُمَّ اَخْطَا فَلَہٗ اَجْر"[4]

ترجمہ: "جب حاکم اجتہاد کرتا ہے اور صحیح رائے تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے اور اگر حاکم اجتہاد کریں اور خطا کریں تو اس کے لیے ایک گنا اجر ہے"۔

---

[1] ایضاً

[2] الشوری: ۴۲: ۳۸

[3] الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، ص ۷۷۔ ۷۸

[4] صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب اجر الحاکم اذا اجتھد فاصاب او خطا (۲۹۱۹) ۲/ ۲۶۷۶

اجتماعی اجتہاد کی صورت میں اگرچہ خطا کا امکان ختم تو نہیں ہوتا لیکن کم ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ امکان ہے کہ انفرادی اجتہاد کی طرح اجتماعی اجتہاد میں بھی غلطی ہو لیکن باہمی مشاورت اور تبادلہ خیال کی صورت میں فقہاء کی جماعت جس رائے تک پہنچتی ہے اس میں صحت کے امکانات برح جاتے ہیں۔ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ لکھتے ہیں:

''اجتماعی اجتہاد کبار علمائے مجتہدین اور ماہرین فن کے باہمی تعامل، مشارکت اور ایک دوسرے کی تکمیل کے پہلو سے انفرادی اجتہاد سے ایک مختلف شیء ہے کیونکہ اس میں پیش آمدہ مسلے کے جمیع پہلوؤں سے واقفیت اور اس کے تمام احوال و جوانب کی سوجھ انفرادی اجتہاد کی نسبت بہت زیادہ حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بحث و مباحثہ کی گہرائی اور آراء و دلائل کی اچھی طرح چھان پھٹک، استنباط حکم میں بہت زیادہ باریکی اور صحت کے امکان پیدا کر دیتی ہے۔'' [1]

علوم میں تخصص اور وسعت:

علوم شرعیہ کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: پہلی قسم علوم عالیہ کی ہے جو قرآن و سنت پر مشتمل ہے جبکہ دوسری قسم علوم آلیہ کی ہے یعنی وہ علوم جو کتاب و سنت کے فہم میں معاون کی حیثیت رکھتے ہوں جیسا کہ علم اصول تفسیر، علم اصول فقہ، علم بلاغت، علم صرف و نحو، علم لغت، علم اصول الحدیث وغیرہ۔ ان علوم میں وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اس قدر تحقیقات، مقالات، کتب، رسائل اور مضامین لکھے گئے ہیں کہ ان کا احاطہ اکیلے فرد کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے عصر حاضر میں علوم میں تخصص کا رجحان بہت زیادہ بڑھ رہا ہے۔ کچھ علماء کا یہ کہنا ہے کہ علوم اسلامیہ میں اس قدر وسعت بھی اجتماعی اجتہاد کا ایک نہایت اہم سبب ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی صورت میں ایک فقہی مجلس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت اور علم صرف و نحو وغیرہ کے متخصصین مل جل کر غور کریں گے تو تمام علوم کی روشنی میں زیر بحث مسلے کے جمیع پہلوؤں پر عمدہ تحقیق سامنے آجائے گی۔

فقہ اسلامی کی تدوین نو:

عصر حاضر میں کتابت کے انداز و اسلوب میں نمایاں تبدیلیوں کی وجہ سے فقہ اسلامی کے ذخیرے کو از سر نو ایک نئے آسان فہم اور جدید اسلوب کے مطابق ترتیب دینے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ علماء کے علاوہ وکلاء، عوام الناس اور جج حضرات بھی اس فقہی ذخیرے تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ کسی ایک فرد کے لیے ایسا کرنا تقریباً ناممکن ہے بلکہ علماء فقہاء اور ماہرین قانون کی ایک جماعت مل کر یہ کام کر سکتی ہے۔ڈاکٹر محمود غازی لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے وسط تک فقہ اسلامی ایک غیر مدون قانون تھی جس کا میں تفصیل سے تذکرہ کر چکا ہوں اس کی حیثیت انگلستان کے ایک کامن لاء کی سی تھی۔ جو باقاعدہ دفعات کی شکل میں مرتب نہ تھا۔ یہی کیفیت فقہ اسلامی کی تھی کہ فقہ

---

[1] الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی: ص ۷۹

کی کتابیں اور اس طرح کی ہزاروں کتابیں کتب خانوں میں موجود تھیں۔ قاضی صاحبان ان کتابوں سے استفادہ کر کے یہ طے کرتے تھے کہ یہ فتوی یا قول یا یہ اجتہاد یہاں اس صورت حال میں متعلق ہے اور اس معاملہ میں اس کو منطبق کیا جانا چاہیے۔اس کی بنیاد پر وہ مقدمات کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ان اجتہادات یا فتاوی کا حکمرانوں یا حکومتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس سے اہل مغرب مانوس نہیں تھے۔ان کے تاجر یہ جاننا چاہتے تھے کہ جس قوم اور ملک کے لوگوں سے وہ تجارت کر رہے ہیں اس کے ہاں تجارت کے احکام کیا ہیں۔اس کی وجہ سے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ یہ قوانین جو ہزاروں کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن سے نہ ہر شخص واقف ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہر شخص اس وسیع ذخیرہ کا ماہر ہو سکتا ہے۔لوگوں کی ضرورت کی خاطر اس کو ایک الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے۔خاص طور پر مسلمان تاجروں اور ان سے معاملہ کرنے والے غیر مسلم تاجروں کو اس کی ضرورت روز پیش آتی تھی۔" [1]

مختلف فقہی مکاتب فکر کا باہم ربط و تعلق:

انفرادی اجتہاد کی صورت میں ایک مجتہد عموماً دوسرے مکاتب فکر کے علماء کے موقف سے تو کسی حد تک آگاہ ہوتا ہے لیکن اس موقف کی شرعی بنیادیں یا اس کی دلیل کی قوت اس پر اسی صورت واضح ہوتی ہے جب اسے مخالف رائے رکھنے والے علماء سے مل بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔یہ بھی نظروں کے سامنے آیا ہے کہ باہمی میل جول سے محبت واخوت کی فضا بڑھتی ہے اور خواہ مخواہ کے سوئے ظن اور الزام تراشیوں میں کمی آتی ہے۔

سلف صالحین اس باہمی ربط کا بہت اہتمام کرتے تھے۔اسی اہتمام کا یہ نتیجہ تھا کہ امام شافعی نے امام محمدؒ کی اور امام محمدؒ نے امام مالکؒ، امام شافعیؒ نے امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے امام شافعیؒ کی شاگردی اختیار کی۔مولانا محمد زاہدؒ لکھتے ہیں:

"دوسری صدی ہجری میں اور تیسری صدی کے اوائل میں مختلف مکاتب فکر کے درمیان ربط اور باہمی استفادے کا جو سلسلہ تھا، اس کی کچھ جھلک اوپر کی سطور میں دیکھی جا چکی ہے، اس کے باوجود جہاں ایک دوسرے کو پورے طور پر سمجھا نہیں گیا، وہاں غلط فہمیاں بلکہ محاذ آرائیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔چنانچہ امام احمدؒ، امام شافعیؒ کے اہل علم پر احسانات شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہم اہل رائے کو برا بھلا کہتے رہے اور وہ ہمیں، یہاں تک کہ شافعیؒ آئے اور انہوں نے ہم دونوں کو جمع کر دیا۔"" [2]

آج ذرائع و ابلاغ کی ترقی نے علماء کے اس باہمی رابطے کو آسان کر دیا ہے لیکن باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں، کہ اس رابطے کا بہت فقدان ہے۔اجتماعی اجتہاد کی مجالس نے اس خلاء کو پر کرنا شروع کیا ہے۔اس وقت اجتماعی اجتہاد کے لیے جو فقہی مجالس موجود ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔بعض مجالس تو ایک ہی مسلک کے علماء پر مشتمل ہوتی ہیں جبکہ بعض دوسری مجالس میں

---

[1] محاضرات فقہ، ص ۵۱۹

[2] اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، ص ۱۴

تمام مکاتب فکر کو متناسب نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں ہونے والے فقہی کام سے عدم واقفیت کی صورت میں کسی بھی اسلامی ملک کے علماء اپنے اجتہادات اور فتاوی میں کمال اور جان پیدا نہیں کر سکتے۔

عالم اسلام کے مغرب یعنی مراکش، تیونس، الجزائر، موریطانیہ اور لیبیا وغیرہ میں اس وقت کیا کچھ علمی کام ہو رہا ہے، برصغیر پاک وہند کے علماء اس سے ناواقف ہیں۔ مدارس دینیہ یا اسلامی جامعات کی لائبریریوں میں شاذ ہی کوئی کتاب ایسی نظر آئے جو بلاد مغرب کے فقہاء و علماء کے علمی کام کا نتیجہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے ہاں سعودی یا مصری علماء کی تحقیقات کتابی صورت میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر عرب ممالک، خلیجی ممالک، براعظم افریقہ کے مسلم ممالک، انڈونیشیا[1]، ملائشیا[2] اور غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمان علماء کی تحقیقات سے آج ہم ناواقف ہیں اور اس کی بنیادی وجہ باہمی ربط و تعلق کا فقدان ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی صورت میں اس ربط ع تعلق کو بڑھاتے ہوئے علمی دنیا میں بہترین اور معتدل نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں۔

تلفیق وجمع بین المذاهب:

تلفیق بین المذاھب سے مراد ایک مذہب کے ماننے والے علماء کا اپنے مذہب کے فتوی کو چھوڑتے ہوئے دوسرے مذہب و مسلک کے فتاوی کے مطابق فتوی جاری کرنا تاکہ کسی خاص مذہب کے فقہی اقوال میں اگر عوام الناس کے لیے تنگی کا پہلو ہے تو اس کو رفع کیا جا سکے۔ اگر کوئی عالم دین اپنی انفرادی حیثیت میں اس عمل کو اپنائے تو عموماً اس کے مذہبی حلقے میں اس کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس کی بدولت بعض علماء دین نے یہ کام اپنے ممالک میں اجتماعی سطح پر بذریعہ اجتماعی اجتہاد کیا ہے اگرچہ ہمارے نقطہ نظر کے مطابق ایک مجتہد انفرادی حیثیت میں بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ مولانا مفتی رفیع عثمانیؒ فرماتے ہیں:

”حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ستم رسیدہ عورتوں کی مشکلات کا ف فقہی حل تلاش کرنے کے لیے متعدد حضرات کو "الحیلۃ الناجزۃ" کی ترتیب کے لیے مقرر فرمایا، میرے والدؒ اور مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ ان میں شامل تھے۔ اس میں کئی مسائل میں فقہ مالکی پر فتوی دیا گیا، لیکن اس فتوی کو شائع نہیں کیا جب تک کہ ہندوستان کے تمام ارباب افتاء سے مراجعت نہیں ہو گئی، اور اصحاب افتاء کی آراء اور تنقیدیں حاصل نہیں ہو گئیں، حرمین شریفین کے فقہاء سے خط و کتابت ہوئی، ان تمام مراحل کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کرایا“[3]

---

[1] انڈونیشیا جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ایک اسلامی ملک کا نام ہے {وکیپیڈیا}

[2] ملائشیا کے مغرب تھائی لینڈ جبکہ انڈونیشیا اور برونائی دارالسلام اس کے مشرق میں واقع ہیں، جنوب براستہ پل سنگاپور سے منسلک ہے، ویتنام اس کی سمندری حدود ہیں۔ {وکیپیڈیا}

[3] جدید فقہی مباحث: ۳۱/۲

متاخرین کی ایک بڑی جماعت نے "تلفیق بین المذاھب" کے منہج کو برقرار رکھا ہے۔اسلامی فقہ اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانیؒ فرماتے ہیں:

"فقہائے حنفیہ کے یہاں اس سلسلے میں بہت سی نظریں موجود ہیں۔شوہر میں بعض عیوب وامراض پیدا ہو جانے کی صورت میں تفریق کا حق، مفقود الخبر کی زوجہ کے لیے تفریق کا حق تعلیم قرآن اور اذان وامامت پر اجرت، کمیشن ایجنٹ (سمسار) کے کاروبار جیسے کتنے ہی مسائل ہیں جن میں فقہائے متاخرین نے دوسرے مکاتب فقہ کی آراء سے فائدہ اٹھا کر امت کو مشقت سے بچایا اور "اختلاف امتی رحمتی" کا عملی ثبوت پیش کیا ہے" [1]

اسلامی انسائیکلوپیڈیاز کی تیاری:

نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی کے لیے عصر حاضر کی بنیادی ضروریات میں ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ ائمہ سلف کی فقہی آراء، اہم شخصیات کا تعارف، تاریخ اسلامی کے اہم واقعات، اسلامی اداروں اور حکومتوں کی ایک مختصر تاریخ، اسلامی ممالک کا جغرافیہ اور مسلمانوں سے متعلق جمیع معلومات کو انسائیکلوپیڈیاز کی شکل میں مرتب کیا جائے تاکہ اسلامی قانون سازی کے عمل میں پیش رفت ہو سکے۔ابجدی ترتیب سے تیار شدہ ان موسوعات سے علماء کے علاوہ عوام الناس اور جدید قانون کے ماہرین کا حلقہ بھی استفادہ کر سکے گا۔اس قسم کے انسائیکلوپیڈیاز کی تیاری کسی ایک عالم دین کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ علماء، فقہاء اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی ایک جماعت ہی اس کام کا بیڑا اٹھا سکتی ہے۔اس سلسلے میں کئی ایک انسائیکلوپیڈیاز تیار کیے گئے ہیں جن میں اکثر وبیشتر صرف ائمہ سلف کے فقہی اقوال کے ابجدی ترتیب پر مبنی ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی فرماتے ہیں:

"دنیائے اسلام کے نامور ترین، جید ترین اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فقیہ استاذ مصطفی احمد زرقا نے تجویز پیش کی کہ فقہ اسلامی کے ذخائر اور اصولوں کو ایک انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں تیار کیا جائے۔جس طرح انسائیکلوپیڈیا میں ہوتا ہے کہ جس فن کا انسائکلوپیڈیا ہوتا ہے اس فن کے تمام تصورات، مباحث اور موضوعات ابجدی ترتیب سے alphabatical شکل میں مرتب کیے جاتے ہیں۔اس موضوع پر دو انسائیکلوپیڈیا تیار ہوئے جن میں ایک کی ترتیب میں خود استاذ مصطفی زرقا بھی شامل رہے۔انہوں نے اس میں بہت کچھ لکھا۔اس کے مضامین کی ترتیب میں انہوں نے حصہ لیا۔ان کے کئی شاگرد براہ راست اس کی ترتیب میں شریک تھے۔یہ ایک بہترین انسائیکلوپیڈیا ہے اور غالباً پینتالیس یا پچاس جلدوں میں مکمل ہو گئی ہے۔کویت کی وزارت اوقاف نے "موسوعۃ الفقہ الاسلامی" کے نام سے یہ کام کرایا ہے۔ایک دوسرا انسائیکلوپیڈیا اور بھی ہے جو اس درجہ کا تو

---

[1] اجتماعی اجتہاد تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، ص ۲۴۳

نہیں لیکن علمی اعتبار سے اچھا ہے۔ یہ مصر میں تیار ہوا۔اس کا نام بھی ''موسوعۃ الفقہ الاسلامی'' ہے۔ یہ نو یا دس جلدوں میں ہے''[1]

1 محاضرات فقہ، ص۵۲۹- ۵۳۰

فصل چہارم: مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار اور محمد اسد کے نظام حکومت کا ڈھانچہ

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعہ ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظم قائم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے قیام و استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقا کی تاریخ ہے۔

دور جدید میں عملی کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نئی پیچیدگیوں کی راہ پا جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرہ کار برابر بڑھ رہا ہے۔ اب دنیا کے تقریبا تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام محض امن و امان اور نظم و ضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ آج ریاست نے ایک مثبت کردار اختیار کر لیا ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کر رہی ہے۔

اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیاء کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا صرف خدا کے لیے خالص ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی کہ:

{يٰقَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُه}[1]

ترجمہ: اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اور ہر پیغمبر نے خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا کہ:

{فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنَ }[2]

ترجمہ: پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

خدا کے ان تمام پیغمبروں نے زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کے لیے جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم ہو اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ تھا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضور اکرم ﷺ نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم بھی کی اور اسے معیاری شکل میں بھی چلایا۔ بائبل اور تلمود کے مطالعہ سے دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے بارے میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے کہ انہوں نے ریاست کے ادارے کی اصلاح کی کوشش کی

---

1 سورۃ الاعراف ۷ : ۶۵

2 سورۃ الشعراء ۲۶ : ۱۶۳

اور غلط قیادت پر بھرپور تنقید کی۔ میں اس فصل کے اندر چند معاصر علماء کے تجدید کے حوالے سے سیاسی افکار کا تذکرہ کرونگا جس میں سر فہرست مولانا مودودیؒ ہیں۔

مولانا مودودی کے سیاسی افکار:

اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں ادھر ادھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ہیں ان سب کی روح اور ان کو جوہر اس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے، پس اسلام کے ہر شعبے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جڑیعنی اصول اولیہ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء کرام کا اصل مقصد:

اسلام کے متعلق دو باتیں قریب قریب ہر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام تمام انبیاء کرام کا مشن ہے۔ یہ صرف محمد ﷺ کا مشن نہیں تھا بلکہ آدمؑ سے لے کر محمد ﷺ تک جتنے بھی انبیاء کرام آئے ان سب کا مقصد ایک ہی تھا۔ دوسری یہ کہ خدا کی طرف سے جتنے بھی انبیائے کرام بھی دنیا میں آئے ہیں ان کی آمد کا مقصد خدائے واحد کی خدائی منوانا اور صرف اسی ایک کی عبادت کرانا تھا۔ یہ دو باتیں ہر مسلمان جانتا ہے لیکن اس کی گہرائی کو کوئی کوئی جانتا ہے۔ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی کہ آج کل ایک عام مسلمان سمجھتا ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے سامنے سجدہ کر لو اور پھر باہر نکل کر حکومت وقت کی غیر مشروط وفاداری اور اطاعت میں لگ جاؤ تو کسی کو کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا[1]۔

قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے کہ کفار و مشرکین اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے، وہ سب یہ تسلیم کر رہے تھے کہ اللہ ہی زمین وآسمان کا خالق و مالک ہے اور خود کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے اور کائنات کا سارا انتظام اسے کے اشارے پر چل رہا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

{قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَن فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ قُلْ مَنْ بِيَدِه مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ}[2]

---

1 ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، اشاعت ۱۹۹۳ء، ص: ۱۲۲

2 سورۃ المومنون ۲۳ : ۸۴- ۸۹

ترجمہ: ان سے پوچھو یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کا ہے اگر تم جانتے ہو؟ وہ فوراً کہیں گے اللہ کا ہے، کہہ دو پھر تم کیوں نہیں سمجھتے۔ ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ وہ فوراً کہیں گے اللہ کا ہے، کہہ دو کیا پھر تم نہیں ڈرتے۔ ان سے پوچھو کہ ہر چیز کی حکومت کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور وہ بچالیتا ہے اور اسے کوئی نہیں بچا سکتا اگر تم جانتے ہو۔ وہ فوراً کہیں گے اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، کہہ دو پھر تم کیسے دیوانے ہو رہے ہو۔

{وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ} [1]

ترجمہ: اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے، پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟

{وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ} [2]

ترجمہ: اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ۔ پھر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے خالق ہونے میں ان کو کوئی اختلاف نہیں تھا، اصل اختلاف اسی بات سے تھا کہ انبیائے کرام ان کو کہتے تھے کہ جو تمہارا زمین وآسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے ،یعنی معبود،اس کے سوا کسی کو الٰہ اور معبود نہ مانو، مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ معبود کا مادہ عبد ہے۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام، جو زندگی، غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری عبادت ہے۔ خدمت کے لیے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعتراف بندگی میں سر جھکانا، جذبہ وفاداری سے سرشار، فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی وجہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو اسے بجالانا وغیرہ غرض یہ عبادت کا اصل مفہوم ہے اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح کرتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انسان کے مقابلہ میں یہ دعوٰی صرف انسان ہی کر سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں اور میں تیرا معبود ہوں میری بندگی اور عبادت کرو۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعوٰی کر سکتا ہے۔ جیسے کہ فرعون نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا: {اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى} [3]

ترجمہ: کہنے لگا کہ تمہارا سب سے بڑا مالک میں ہوں۔

{مَاعَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ} [4]

---

1 سورۃ العنکبوت ۲۹ : ۶۱

2 سورۃ الزخرف ۴۳ : ۸۷

3 سورۃ النّٰزعات ۷۹ : ۲۴

4 سورۃ القصص ۲۸ : ۳۸

ترجمہ: میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی الٰہ ہے۔

جب حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیجنے کی قدرت رکھتا ہوں لٰہذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو۔ قرآن فرماتا ہے:

{لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِى لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ}[1]

ترجمہ: اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا۔

ان لوگوں کا اصل اختلاف اس بات میں تھا کہ انسانوں اور خصوصاً سر زمین مصر کے باشندوں کا مالک میں ہوں، وہ اللہ ہونے کا دعٰوی نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعٰوی رکھتا تھا کہ سلطنت مصر کے باشندوں کا رب میں ہوں اور یہ دعٰوی اس بناء پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی۔ لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے اور جس کی چاہے جان بخشی کر دے۔ یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ سے اس کا یہ مطالبہ تھا کہ تم مجھے رب تسلیم کرو، میری بندگی اور عبادت کرو۔

یہ دعٰوی صرف فرعون نے نہیں بلکہ دنیا میں ہر جگہ فرمان رواؤں کا یہی دعٰوی تھا اور یہی دعٰوی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سر چشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے۔ اسی سے خرابی کی ابتداء ہوئی اور اسی سے آج بھی بس زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کے فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے مگر اب تو ہزار برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا[2]۔

انبیاء کرام کا اصلاحی فریم ورک:

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء کرام نے انسانی زندگی میں کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جو کو مٹانے کے لیے یہ لوگ آئے۔ ان کا اصل مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے، ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے نیچے گرا دیئے گئے ہیں، انہیں ابھار کر اس حد تک اٹھا لائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظام زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتداء سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیام تھا اور وہ یہ تھا کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

یہی بات تمام انبیائے کرام اور آخر میں حضرت محمد ﷺ نے کی ہے۔

---

1 سورۃ الشعراء۲۶ : ۲۹

2 اسلامی ریاست، ابوالاعلیٰ مودودی، ص:۱۲۷

{اِنَّمَا اَنَا مُنْذِر وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَہَّار رَبُّ السَّمٰوٰت ِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا}[1]

ترجمہ: میں بس ایک متنبہ کرنے والا ہوں، کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کر دیا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لیے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا[2]۔

محمد ﷺ کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

{وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِی کَانَتْ عَلَیْھِمْ}[3]

ترجمہ: اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے اتارتے ہیں۔

سیاسی نظریہ کے ابتدائی اصول:

انبیاء کرام نے انسانی زندگی کے لیے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور، اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریہ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لیے جائیں، کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں، وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

{اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ذٰالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمِ}[4]

ترجمہ: حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

{یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ}[5]

ترجمہ: وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

{وَلَا تَقُوْلُوْ ا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبِ ھٰذَا حَلَال وَّ ھٰذَا حَرَام}[6]

ترجمہ: اپنی زبانوں سے یونہی غلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔

---

1 سورۃ ص ۳۸ : ۶۵۔۶۶

2 اسلامی ریاست، ابوالاعلیٰ مودودی، ص: ۱۳۵

3 سورۃ الاعراف ۷ : ۱۵۷

4 سورۃ یوسف ۱۲ : ۴۰

5 سورۃ آل عمران ۳ : ۱۵۴

6 سورۃ النحل ۱۶ :۱۱۶

{وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُلٰئِکَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ}[1]

ترجمہ: جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل کافر ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز صرف خدا ہے۔ کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ کے حکم ہی کا پیرو ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

{اَنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْ حٰى اِلَیَّ}[2]

ترجمہ: میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔

عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اس لئے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے۔

پس اسلامی ریاست کی ابتدائی خصوصیات جو قرآن کی مذکورہ بالا تصریحات سے نکلتی ہیں یہ ہیں:

ا۔ کوئی شخص، خاندان، طبقہ یا گروہ بلکہ ریاست کی ساری آبادی مل کر بھی حاکمیت کی مالک نہیں ہے۔ حاکم اعلیٰ صرف خدا ہے، اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لیے قانون بنا سکتے ہیں اور نہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔

۳۔ اسلامی ریاست اس قانون پر قائم ہو گا جو خدا کی طرف سے اس کے نبی نے دیا ہے اور اس ریاست کو چلانے والی حکومت صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہو گی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو[3]۔

ڈاکٹر اسرار کے سیاسی افکار:

ہمیں گہرے غور و فکر اور نہایت احتیاط کے ساتھ یہ دیکھنا ہو گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے کن کن مراحل اور امور کو ہمیں جوں کا توں لینا ہو گا اور وہ کون سے مراحل ہیں کہ جن کے بارے میں حضور ﷺ کی سیرت کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر استنباط کرنا ہو گا، اور اس معاملے میں ہمیں کس حد تک اجتہاد کرنا ہو گا۔ دو اعتبارات سے دورِ نبوی ﷺ اور آج کے حالات میں واقع فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

---

1 سورۃ المائدۃ ۵: ۴۴

2 سورۃ الانعام ۶ : ۵۰

3 اسلامی ریاست، ابوالاعلیٰ مودودی، ص:۱۳۸

دور نبویؐ اور موجودہ حالات میں دو اہم تضاد:

پہلا تضاد:

دور نبویؐ اور موجودہ حالات میں پہلا واضح ترین اور نمایاں ترین فرق تو یہ واقع ہوا ہے کہ نبی اکرمؐ کی بعثت مبارکہ ایک خالص کافرانہ و مشرکانہ معاشرے میں ہوئی تھی، جبکہ ہمارا تعلق ایک مسلمان معاشرے سے ہے اور ہمیں اس میں کام کرنا ہے۔ پاکستان کی طرح دوسرے بہت سے مسلم ممالک ہیں جن میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد اسی فیصد سے زائد ہے اور ان تمام ممالک کے سربراہ اور حکمران مسلمان ہی ہیں۔ رعایا اور حکمرانوں کے کردار، ان کے اخلاق، ان کی سیرت اور دین سے ان کے عملی تعلق کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ سب کے سب قانوناً مسلمان ہیں۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم و نافذ نہ ہو بلکہ پورے کا پورا لادینی نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران مسلمان ہی تسلیم کئے جائیں گے۔ پھر حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان معاشروں میں کردار کے اعتبار سے ہر طرح کے طبقات موجود ہیں۔ شرابی، زانی، قمار باز اور کئی اعتبارات سے صرف اسلامی اخلاق و کردار ہی سے نہیں عام انسانی سیرت و کردار سے تہی دست افراد بھی موجود ہیں اور اسلامی نظام کے عملاً نافذ نہ ہونے کے باوجود انہی معاشروں میں کچھ نہ کچھ ایسے مسلمان بھی لازماً موجود ہوں گے جو نمازی، روزے دار، اسلامی شعائر کی پاسداری کرنے والے اور انفرادی سطح پر صالح اور متقی مسلمان ہوں۔ بہر حال عملاً یہ تمام لوگ قانوناً مسلمان ہیں اور انہیں کلمہ کی ڈھال حاصل ہے۔ لہٰذا ان حالات میں جن میں نبی اکرم ﷺ نے توحید کی انقلابی دعوت پیش کی اور اس صورت حال میں جس سے ہمارا سابقہ ہے، ایک نہایت نمایاں فرق موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جس معاشرے سے مقابلہ تھا، وہ فکری و عملی دونوں اعتبارات سے خالص مشرکانہ اور کافرانہ معاشرہ تھا اور ان کا پورا نظام شرک کی بنیادوں پر استوار اور قائم تھا[1]۔

دوسرا تضاد:

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوع انسانی کا جو تمدنی ارتقاء ہوا ہے اس کے اعتبار سے اب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل اور پوری قوت موجود ہوتی ہے، جبکہ عوام اب بالکل نہتے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حکومت اور عوام کے مابین فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ پہلے سے قائم شدہ باطل نظام سے مسلح تصادم کا معاملہ نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے قریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ یہ دونوں تبدیلیاں ایسی بنیادی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ہمیں معروضی طور پر غور کرنا ہے کہ اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا عزم کرتے ہیں تو ان تمام مراحل میں جن سے نبی اکرمؐ کی جدوجہد اور سعی و کوشش گزری

---

1 ڈاکٹر اسرار احمد، منہج نبوی انقلاب، ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳۵

آیا ہمیں بعینہ وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو ہمیں سیرت مطہرہ میں ملتا ہے یا یہ کہ ان اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر مرحلہ پر ہم یہ دیکھیں کہ کس کس پہلو سے ہمارا لائحہ عمل مختلف ہوگا۔

اسلامی انقلاب کی نوعیت:

یہ مسئلہ بہت نازک اور پیچیدہ ہے کیونکہ اس دور میں اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی بظاہر احوال اس وقت تک کوئی صورت ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس مسئلہ کو تمدنی ارتقاء کی روشنی میں حل نہ کیا جائے اور اس کے صحیح متبادل طریقہ کو تلاش نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھی یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارا اصل ہدف اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے، جس کے چھ مراحل کا تذکرہ کافی تفصیل کے ساتھ ہو چکا، چونکہ قانونی اعتبار سے آخری مراحل میں ہی سب سے بڑا فرق واقع ہوتا ہے اس لیے مراحل کا ذکر پہلے ہوگا اور یہ فرض کیا جائے گا کہ ابتدائی مراحل کسی معاشرہ میں مکمل ہو چکے ہیں، یعنی خالص اسلام کی دعوت پر ایک تحریک اٹھی، اس کو اس معاشرہ میں مقبولیت حاصل ہوئی، لوگوں نے شعوری طور پر اس دعوت کو قبول کیا، پھر وہ منظم ہوئے اور سمع وطاعت والی ایک تنظیم کا نظام قائم ہو گیا۔ پھر ان کی تعداد بھی اتنی معتدبہ ہو گئی، کہ وہ تنظیم اب رائج نظام کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ پھر یہ کہ تنظیم کے کارکنوں کی تربیت بھی ایسی ہو چکی ہے کہ ان کے انفرادی کردار واخلاق اور ان کی سیرت کے اعتبار سے ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ان کے متعلق یہ حسن ظن موجود ہے کہ وہ فی الواقع اپنی انفرادی زندگی میں اپنے مکان بھر اسلام کو عملاً نافذ کر چکے ہیں، انہوں نے تزکیہ کے مراحل بھی طے کر لیے ہیں اور ان کے دل راہ حق میں قربانیاں دینے کے لیے بے تاب ہیں۔ کسی انقلابی عمل کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہوتا ہے، مگر یہ آج کا مسئلہ نہیں ہے، یہ فوری طور پر عمل کرنے والی بات نہیں ہے، لہٰذا اس آخری مرحلہ کو صرف علمی طور پر سمجھنا ہوگا۔

ہمارا سابقہ ایسے حالات سے ہے کہ ایک مسلمان معاشرہ میں، جو ایمان اور عمل دونوں اعتبارات سے سخت مضمحل ہو چکا ہے، جس میں حکومت کرنے والے بھی مسلمان ہیں، خواہ وہ بادشاہ ہوں، جیسے سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک میں ہیں، چاہے وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوں اور خواہ وہ جمہور کے منتخب نمائندے ہوں، جیسے بہت سے ممالک میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں، بہر حال کچھ بھی ہو مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور حکمران بھی مسلمان ہیں، ان کی تکفیر نہیں کی گئی ہیں۔ اپنی نجی زندگیوں میں وہ کچھ بھی ہوں، فاسق وفاجر ہوں، یا نمازی اور روزہ دار ہوں، دونوں صورتوں میں وہ مسلمان ہیں، لیکن اس معاشرہ میں اسلامی نظام قائم نہیں ہے، تو اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر صحیح وحقیقی اسلامی نظام کے قیام کے لیے آخری اقدام کی صورت نکالنی ہوگی[1]۔

---

1 منہج نبوی انقلاب، ص ۳۳۹

اسلامی تحریک کی خوبیاں:

اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے کچھ خوبیوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ یہ تحریک کسی فرقہ واریت کی بنیاد پر نہ اٹھی ہو، وہ محض رائج الوقت نظام کی کسی جزوی اصلاح کے لیے نہ اٹھی ہو، وہ صرف کسی انتخابی عمل کے ذریعے اس نظام کو چلانے والے ہاتھوں کو بدلنے کے لیے میدان میں نہ آئی ہو، بلکہ اس جماعت کا مقصد خالص اسلامی انقلاب برپا کرنا ہو، یعنی معاشرہ میں علمی وہ عملی دونوں اعتبارات سے توحید کے نفاذ وانعقاد کی جدوجہد ہی اس کا مقصود ہو۔ پھر یہ کہ ایک معتد بہ تعداد میں لوگوں نے اسے شعوری طور پر قبول کر لیا ہو، پھر یہ کہ وہ منظم ہو چکے ہوں اور منظم بھی اس درجہ میں کہ "وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔ وہ کبھی مشتعل نہ ہوئے ہوں، انہوں نے کبھی بھی گالی کا جواب گالی سے نہ دیا ہو، یعنی وہ ان مراحل سے بڑی حد تک گزر چکے ہوں جو صبر محض کے عنوان کے تحت سیرت النبیؐ کے مکی دور کے حالات کے ضمن میں قبل ازیں بیان ہو چکے ہیں کہ نبیؐ اور صحابہ کرامؓ نے سختیاں جھلیں، استہزاء اور تمسخر برداشت کیا، ذہنی وجسمانی تشدد جھیلا، معاشرہ نے اہل ایمان سے بائیکاٹ کیا، لیکن انہوں نے ان سب کو جھیلتے اور برداشت کرتے ہوئے توحید کا علم ہاتھ میں لئے توحیدی انقلاب اور توحیدی نظام قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ کسی ادنیٰ درجہ میں ہی سہی، اس جماعت کے وابستگان میں بھی ان باتوں کی کوئی جھلک نظر آنا ضروری ہے[1]۔

توحید کے اہم نکتہ کی وضاحت:

توحید کی بنیاد پر جو نظام قائم ہوتا ہے صرف اور صرف وہی نظام عدل وقسط کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ یہ نظام توحید ہی سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات قائم کرتا ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، پیشہ اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی بلند واعلیٰ ہوتا ہے نہ کوئی کم تر وپست، پھر مرد وعورت کے منصفانہ طور پر حقوق اور فرائض کو متعین کرتا ہے، معاشی سطح پر یہ نظام ملک کے ہر شہری کی ناگزیر بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت کا ذمہ دار ریاست کو قرار دیتا ہے۔ مزدور وکارخانہ دار کے درمیان عدل وانصاف اور اخوت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جاگیر داری کی لعنت کا مکمل خاتمہ کرتا ہے۔ اس نظام توحید میں سیاسی سطح پر حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کی ہوتی ہے ۔ ملک کی پارلیمنٹ یا اسمبلی "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے اصول پر شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دیگر انتظامی وفلاحی امور کے لئے قانون سازی کی مجاز ہوتی ہے، لیکن وہ اللہ اور رسولؐ یعنی کتاب وسنت میں بیان کردہ حدود وتعزیرات میں ایک شوشہ کے برابر بھی تغیر وتبدل کی مجاز نہیں ہوتی[2]۔

---

1 منہج نبوی انقلاب، ص: ۳۴۰

2 منہج نبوی انقلاب، ص: ۳۴۱

عملی اقدام:

اسلامی تحریک مختلف مراحل سے گزر کر اقدام کے مرحلہ تک آگئی تو بحالات موجودہ اقدام کی صورت کیا ہوگی؟ ظاہر ہے کہ اقدام بغیر نظام نہیں بدلے گا۔ بیٹھے رہیں گے تو وہ نظام خود بخود تبدیل نہیں ہوگا۔ اس موقع پر یہ بات بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ محض وعظ و نصیحت سے بھی ہر گز کوئی نظام تبدیل نہیں ہوتا، البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس فاسد نظام میں چند نیک، صالح باکردار اور متقی لوگوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ نظام کی تبدیلی کے لیے اقدام ناگزیر ہے اس کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔

موجودہ دور میں یہ صورت پیدا ہو چکی ہے کہ اب خروج و بغاوت کا امکان ہی موجود نہیں۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں باقاعدہ تنخواہ دار فوجیں نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ آج کل قریباً ہر حکومت کے پاس لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ اور منظم فوجیں موجود ہوتی ہیں۔ دوسرا اس دور میں جس نوع کا اسلحہ فوجوں کے پاس ہوتا تھا قریباً اسی نوع کا عوام کے پاس بھی ہوتا تھا۔ اس میں مقدار کا فرق تو ہو سکتا ہے، لیکن وہی تلواریں، نیزے، ڈھالیں جو فوج کے پاس ہیں وہی عوام کے پاس بھی ہیں، تو اس زمانہ میں نسبت و تناسب کا کوئی معاملہ موجود تھا، لیکن اب جو تمدن کا ارتقاء ہوا ہے تو یہ صورت باقی نہیں رہی ہے۔ حکومت کے وسائل، اس کی طاقت، اس کی فوجیں اور اسلحہ کے معاملہ کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ چنانچہ اب سرے سے کوئی نسبت و تناسب موجود ہی نہیں ہے۔ حکومتی افواج آج کل کس کس نوعیت کے اعلیٰ اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں اور اس طرح حکومت ایک قوی ترین ادارہ بن چکی ہیں، جبکہ عوام قریباً بالکل نہتے ہیں، تو یہ فرق و تفاوت اتنا عظیم ہے کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا خروج اور بغاوت بحالات موجودہ تقریباً خارج از بحث ہو چکی ہے، شرعی اعتبار سے نہیں، حالات کے اعتبار سے اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے[1]۔

ریاست اور حکومت میں تضاد:

آج کے دور میں ریاست اور حکومت دو الگ الگ چیزیں تسلیم کی جاتی ہیں جبکہ آج سے قبل یہ صورت حال موجود نہیں تھی۔ صرف حکومت ہی کا وجود تھا ریاست کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لیکن یہ صورتحال اس دور میں بدل چکی ہے۔ انسانی فکر اور انسانی تمدن کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کے تحت اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ ریاست ایک بالکل علیحدہ شے ہے اور حکومت صرف ریاست کے معاملات کو چلانے والا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ کسی ملک کے رہنے والے دستوری اور آئینی طور پر درحقیقت ریاست کے وفادار ہوتے ہیں حکومت کے نہیں۔ حکومت کی اطاعت تو ہو کرتے ہیں لیکن دراصل جس شے کو وفاداری کہا جاتا ہے وہ ریاست کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ پاکستان ایک ریاست ہے اس ریاست کو چلانے والی ایک حکومت ہے جو اس ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ یہ حکومت بدلتی رہتی ہے، آج کسی کی ہے تو کل کسی اور کی ہوگی پس حکومت توآنی جانی شے ہے۔ جس شے کو

---

1 منہج نبوی انقلاب، ص: ۳۴۴

دوام ہے، جو چیز تسلسل کی حامل ہے وہ تو در حقیقت ریاست ہے لہٰذا کسی بھی ملک کے رہنے والوں کی اصل وفاداری حکومت سے نہیں ریاست سے ہوتی ہے۔

ساری دنیا مانتی ہے کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا یہ مسلم حق ہے کہ وہ آئینی و دستوری طور پر حکومت بدل سکتے ہیں، چنانچہ وہ مدت سے قبل نئے انتخابات کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل استثنائی صورت ہے کہ ہنگامی حالات سے فائدہ اٹھا کر کوئی جنرل بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اقتدار پر قبضہ کر لے اور رائے دہندگی کے حق کو معطل کر دے، باقی رہا ووٹ کا معاملہ، توان کا یہ حق برقرار رہے گا، اس پر کہیں کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ تمدن کے ارتقاء نے یہ متبادل طریقے عطا کئے ہیں ، جبکہ اس سے پہلے یہ صورت نہیں تھی۔ ریاست اور حکومت کا تصور گڈ مڈ تھا اور حکومت کو ہی ریاست کا مقام بھی حاصل تھا۔ حکومت کو بدلنے کی کوشش کو بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے ریاست اور حکومت دو مختلف تصورات ہیں اور کسی بھی ملک کے باشندوں کو آئینی طور پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں[1]۔

خلافت راشدہ کے نظام کی نوعیت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت راشدہ کا نظام حکومت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ محترم ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مشن کو آگے بڑھانے والا نظام حکومت خلافت راشدہ ہی کا تو ہے، لیکن اس احترام و توقیر کے باوصف ایک بات جان لیجئے کہ اس کے ساتھ دو باتیں موجود تھی جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت بنیادی طور پر عرب میں ایک قبائلی معاشرہ قائم تھا۔ لہٰذا جہاں ایک قبائلی نظام پہلے سے موجود ہو اس میں اگر صرف سرداران قبائل سے مشورہ کر لیا جائے، ان کی آراء کو معلوم کر لیا جائے تو گویا ہر قبیلہ کے افراد سے مشورہ کا حق ادا ہو گیا۔ دوسری یہ کہ سرداران کی حیثیت اپنے قبیلہ کے نمائندہ کی ہوتی تھی، لہٰذا وہاں رائے دہندگان کی فہرستوں کی تیاری، بیلٹ پیپر اور انتخابات کی کوئی ضرورت نہیں تھی وہاں قبائل کے سرداران اور بڑے بڑے خاندانوں کے سربراہ ارباب حل و عقد کہلاتے تھے۔ کسی معاملہ میں ان سے مشورہ ہو گیا تو گویا تقاضا پورا ہو گیا۔ جبکہ موجودہ دور میں یہ بات نہیں چل سکتی۔ اس دور کے تقاضے کے تحت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر جیسے مطلق العنان حاکم کو بھی ریفرنڈم کا ڈرامہ رچانا پڑا۔ اس قسم کی کسی صورت حال کا ثبوت آپ کو خلفائے راشدینؓ کے دور میں تو نہیں ملے گا لہٰذا یہ کہنا کہ اس طرز کا سیاسی نظام جو خلافت راشدہ میں قائم تھا، جوں کا توں اس دور میں چل سکتا ہے، مغالطہ ہے۔ اس دور میں حالات کی تبدیلی کے پیش نظر ایک ایسا نظام بنانے پر غور کرنا ہو گا جس میں اصول تو وہی رہیں، لیکن طریق کار کو تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے[2]۔

---

1 منہج نبوی انقلاب، ص: ۳۴۹

2 منہج نبوی انقلاب، ص: ۳۵۰

مولانا اسد کے سیاسی افکار:

ہر قوم کی زندگی میں زور یا بدیر ایسا وقت آجاتا ہے، جب معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی تقدیر کے آزادانہ انتخاب کا موقع مل گیا ہے، ایسے تاریخی اوقات و لمحات نہایت کم پیش آتے ہیں اور انتہائی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ اگر کوئی قوم ایسے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھاتی تو اغلب ہے کہ آئندہ کے لیے صدیوں تک ایسی مہلت اسے مل ہی نہ سکے۔

آزادانہ انتخاب کا یہ وقت عالم اسلام کے ملکوں کے لیے آگیا ہے۔ وہ ایک صدی تک جدوجہد کرتے رہے۔ امیدوں، غلطیوں اور مایوسیوں کے طوفانوں سے گزرے۔ آخر ان اکثر ملکوں کو سامراجی حکومت سے پوری آزادی مل گئی، جہاں مسلمان آباد ہیں۔ آزادی کے حصول کے لیے یہ مسئلہ حد درجہ اہم بنا دیا ہے کہ وہ کون سے بنیادی اصول ہیں، جن کی پابندی کرتے ہوئے عوام کی راحت و بہبود یقینی ہو جائے گی۔ یہ محض انتظامی صلاحیت ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ نظریاتی مسئلہ بھی ہے۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کا کام ہے کہ آیا آزاد شدہ مملکتوں کو دور حاضر کے مغربی تصورات کے تحت رکھا جائے، جن میں ہر مذہب کو قوم کی عملی زندگی کی تشکیل کا حق حاصل نہیں، یا انہیں بہر حال حقیقی معنی میں اسلامی نظام و اساس کے تابع آجانا چاہیے۔ کسی مملکت میں اسلامی آبادی کی بھاری اکثریت یا کاملاً اسلامی آبادی کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ وہ اسلامی ہے۔ ہر مملکت اسی وقت حقیقی اسلامی مملکت بنتی ہے، جب قوم کی زندگی کے لیے اسلام کے سیاسی و عمرانی اصول قصد و اہتمام سے نافذ کیے جاتے ہیں اور جب وہ اصول ملک کے بنیادی دستور میں شامل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مذہب و سیاسیات کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ دور حاضر کے مغربی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے لیے یہ گہرا تعلق ایک حد تک ناخوشگوار ہے کیونکہ وہ عقائد اور عملی زندگی کے مسائل کو کاملاً جداگانہ دائروں میں سمجھنے اور رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی اہمیت کا اس وقت تک صحیح اندازہ ہو ہی نہیں سکتا، جب تک اس مسئلے پر پوری طرح غور نہ کر لیا جائے۔ تعلیمات اسلام سے کسی شخص کی واقفیت کتنی ہی سطحی کیوں نہ ہو تاہم وہ جانتا ہے کہ یہ تعلیمات صرف خدا سے انسان کے تعلق ہی پر حاوی نہیں، بلکہ اس تعلق کے نتیجے میں اسے جو اجتماعی روش اختیار کرنی چاہیے، اس کے باب میں بھی ایک قطعی نظام طے کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کا بنیادی اصول موضوعہ یہ ہے کہ طبعی زندگی کے تمام احوال و ظروف ارادۂ باری تعالیٰ کے تابع ہیں، لہٰذا ان کی ایک مستقل قدر و قیمت ہے۔ انسان کے تعلق میں اس تابعیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی خواہشات اور کردار عمداً اور عملاً زندگی کے ان قوانین کے مطابق رہیں، جن کا فیصلہ خالق نے فرما دیا ہے[1]۔

---

1 محمد اسد، اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول، المکتبۃ الرحمانیہ لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۴

اسلام نے الٰہی قانون یعنی شریعت کے ذریعے یہ ضرورت پوری کر دی ہے۔قرآن مجید نے خاص احکام مہیا کر دیے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے تعلیمات یعنی سنت کے ذریعے ان کی تفصیل و تفسیر فرمادی۔ مومن کے نقطہ نگاہ سے قرآن و سنت ہمارے لیے تخلیق کے ہمہ گیر خدائی منصوبے کو ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں جو قابل فہم ہے، مگر یہ اس کے ارادے کا صرف اظہار ہے۔وہ ہمیں اس پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔اس نے ہمیں انتخاب کی آزادی دے رکھی ہے۔ہم چاہیں تو خوشی سے اس کے الہامی قانون کے فرمانبردار بن سکتے ہیں، گویا خدا سے تعاون کر سکتے ہیں۔چاہیں تو اس کے خلاف جا سکتے ہیں مگر نتائج کے ذمہ دار ہم ہوں گے۔ہم جو کچھ بھی کریں ذمہ داری ہماری ہوگی۔یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ اسلامی زندگی بسر کرنا چاہیں تو ہمیں پہلا راستہ انتخاب کرنا ہوگا۔اگر ہم خدا کی فرمانبرداری کا فیصلہ بھی کر لیں تو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ پوری فرمانبرداری کر سکیں،اگر چہ ظاہر ہے کہ اسلامی قانون کا حقیقی مدعا انفرادی اعتبار سے انسان کی راستبازی ہے۔اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قانون کا بڑا حصہ صرف اسی صورت میں موثر ہو سکتا ہے جب بہت سے افراد عمداً اس کے لیے متحدہ کوشش کریں،اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک فرد کی نیت کتنی ہی نیک ہو،وہ اپنی نجی زندگی کو اس وقت تک اسلامی تقاضوں کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا،جب تک کہ گردوپیش کا معاشرہ عملی معاملات میں اسوۂ اسلام کی تابعیت پر متفق نہ ہو جائے۔اس قسم کا شعوری تعاون اخوت کے محض احساس سے پیدا نہیں ہو سکتا۔اخوت کا یہ تصور اجتماعی عمل میں منتقل ہونا چاہیے۔مطلب یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے،یا دوسرے لفظوں میں ایسے اجتماعی حالات پیدا کیے جائیں اور انہیں قائم رکھا جائے،جن میں انسانوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہم آہنگی،آزادی اور عزو وقار کی زندگی بسر کر سکے۔ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص معاشرے کے خلاف روش اختیار کر لے تو دوسرے لوگوں کے لیے بھی نصب العین تک پہنچنے میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ایسے سرکشوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، باقی لوگوں کی مشکلات اتنی ہی بڑھ جائیں گی۔گویا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مطابق قوم کا عزم تعاون اس وقت تک زیادہ تر نظری ہی رہے گا،جب تک کوئی دینوی قوت قوم کے ایک حصے کی طرف سے اسلامی قانون کے نفاذ اور سرکشی کے انسداد کے ذمہ دار نہ بن جائے۔کہ ذمہ داری کسی منظم ادارے ہی کی طرف سے پوری کی جا سکتی ہے،جسے حکم اور ممانعت کے اختیارات حاصل ہوں۔اس سے مراد مملکت ہے،لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اس اسلامی مملکت یا مملکتوں کی تنظیم اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لیے ایک ناگزیر شرط ہے[1]۔

اسلامی دستور کی وسعت:

اصل شریعت فقہ کے اس قانونی نظام کے مقابلے میں بہت موجز و بلیغ اور مختصر ہے،جو اسلامی فکر کے مختلف دبستانوں نے تیار کر دیا۔شریعت قانون کا مجموعہ ہے،جو داخلی و موضوعی وضع کے فاضلانہ استنباطات یا نتائج پر منحصر نہیں ہو سکتی،بلکہ اسے

1 اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول،ص:۴۶

کاملاً قرآن وسنت کے قطعی احکام کی شکل میں دیکھنا چاہیے، یعنی وہ احکام جن کے متعلق مثبت قانونی وضع میں بتا گیا" یہ کرو اور یہ نہ کرو" "یہ چیزیں خیر ہیں، اس لیے مطلوب ہیں"" یہ چیزیں شر ہیں اسے لیے ان سے بچنا چاہیے" ۔ان نصوص کی مختلف تعبیرات کی ہی نہیں جاسکتیں، بلکہ ان میں تعبیر کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنی جگہ مکمل اور الفاظ میں غیر مبہم ہیں۔ تمام عرب ماہر لسانیات اس امر پر متفق ہیں کہ نصوص، قرآن وسنت کے ان احکام کو کہتے ہیں، جو ظاہر الفاظ میں بدیہی ہوں، تمام نصوص ایسی شکل میں پیش کیے گئے ہیں کہ انسان کے عمرانی وفکری نشوار ارتقاء کے ہر مرحلے پر ان کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کے برعکس فقہاء کے بہت سے داخلی وموضوعی نتائج ایک خاص وقت اور ذہنیت کے افکار ہیں لہٰذا ان کی دائمی صحت کا دعوی نہیں کیا جاسکتا۔ گویا نصوص قران وسنت اور صرف وہی بحیثیت مجموعی حقیقی اور دائمی شریعت اسلام ہیں۔ یہ شریعت صرف ان احکام پر مبنی ہے، جن میں کسی واجب کا فیصلہ غیر مشتبہ الفاظ میں کر دیا گیا ہے یا اسے ناجائز قرار دے دیا گیا ہے، لیکن جن چیزوں اور سرگرمیوں کے وسیع تر دائرے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا، نہ ان کے کرنے کا حکم دیا گیا اور نہ ان کی ممانعت کی گئی، ان سب کو شرعی نقطہ ونگاہ سے مباح سمجھنا چاہیے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ جو نظریہ اوپر پیش کیا گیا ہے، وہ اسلامی فکر میں کوئی نئی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے صحابہ کا نقطہ نگاہ یہی تھا اور آگے چل کر اسلام کے بعض بہت بڑے علماء کا نقطہ نگاہ یہی رہا خصوصاً اس شخص کا نقطہ نگاہ جسے بجا طور پر اسلام کے ممتاز ترین فقہا میں شمار کیا جاتا ہے۔

چونکہ حقیقی شریعت اور اوامر ونواہی تک محدود ہے، جو قرآن وسنت میں واضح طریق پر بیان کر دے گئے، اس لیے شریعت حد درجہ مختصر اور بلیغ ہے اور اسے سمجھ لینا بہت سہل ہے۔ زندگی کی ہر ضرورت کے متعلق تفصیلی قانون سازی کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کیا جاسکتا تھا، یعنی ہم مسلمانوں کے متعلق قانون دینے والے کا منشا یہ تھا مزید ضروری قانون سازی کا انتظام اجتہاد دے کریں اور وہ روح اسلام کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن وسنت کی بناء پر ہم جو اجتہادی قانون سازی کریں گے، اس قانون سازی میں آئندہ نسلوں کے اجتہاد سے برابر ترمیم ہو سکے گی، یعنی ہماری قانون سازی ہنگامی ہوگی اور یہ قانون ناقابل تردید وتنسیخ شریعت کے تابع بدلتا رہے گا یہ شریعت نصوص قرآن وسنت کے سوا کچھ نہیں ۔شریعت میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ الٰہی قانون ہے۔ اس میں ردوبدل کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ اس کے احکام اس طریق پر بنائے گئے ہیں کہ کوئی بھی حکم انسان کی فطرت صحیحہ اور انسانی معاشرے کے حقیقی تقاضوں سے کسی بھی زمانے میں متصادم نہیں ہو سکتا۔ اس کی صاف اور سادہ وجہ یہ ہے کہ ان احکام میں انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو نظر وضبط کے تابع لایا گیا ہے جن میں فطرتاً تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی[1]۔

---

1 اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول، ص: ۵۷

سیاسی اسلامی اوضاع:

اگر ہم قرآن وسنت کے سیاسی احکام کا جائزہ معروضی اور خارجی نقطہ نگاہ سے لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کے لیے کوئی خاص وضع وہیئت مقرر نہیں کی گئی، یعنی شریعت نے کوئی قطعی نمونہ تجویز نہیں کیا، جس سے مطابقت ایک اسلامی مملکت کے لیے لازم ہو، بلکہ دستوری نظریے کی تفصیلات ہی بیان نہیں کیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن وسنت سے جو سیاسی قانون مستنبط ہوتا ہے، وہ بے حقیقت ہے۔ یہ قانون بہت واضح، روشن اور مثبت ہے اور ایک ایسے سیاسی منصوبے کا خاکہ اس میں صاف صاف آگیا ہے، جس پر انسانی زندگی کے تمام احوال واوقات میں عمل ہو سکتا ہے، تمام احوال واوقات میں قابل عمل ہونے ہی کی بناپر یہ منصوبہ خاکے کی صورت میں پیش کیا گیا اور اسے تفصیلات سے معرار کھا گیا۔ انسان کی سیاسی، عمرانی اور اقتصادی ضرورتیں ہنگامی ہوتی ہیں اور ان میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اگر قوانین کو بے لچک رکھا جاتا تو ظاہر ہے کہ وہ تغیر کے طبعی رجحانات کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور شریعت نے ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ الٰہی قانون ہے اور اس میں تاریخی ارتقاء کی حقیقت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ اس کے مطابق مومن کو گنتی کے وسیع سیاسی اصول بتادیے گئے ہیں۔ ان کے سوا دستور سازی کی سرگرمیوں اور حکومت کے کاروبار کا وسیع دائرہ ایسے کا ویسا چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسے وقتی حالات سامنے آجائیں، اجتہاد کی بناپر ان کے مطابق روز بروز قانون بنائے جا سکتے ہیں۔

یہ سیاسی قوانین ان انتظامی اداروں اور طور طریقوں میں پوری طرح واضح ہوئے، جو خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھے اور اسی وجہ سے ان خلفائے راشدین کی مملکت ہر لحاظ سے اسلامی تھی، لیکن ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اسلامی دولت مشترکہ اس زمانے میں جس غیر مکتوب دستور کی پابند رہی، اس میں ملک داری کے متعلق واضح شرعی قوانین کے ساتھ ساتھ چند اور قوانین بھی رائج تھے، جو وقت کے حکمرانوں نے قرآن وسنت کی اپنی تعبیر کے مطابق وضع کر لیے تھے۔ گویا قوانین اجتہاد کی بناپر تھے۔ ان کے علاوہ ہمیں خلفائے راشدین کے عہد میں اور بہت سے انتظامی و قانونی احکام ملتے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن وسنت سے ماخوذ نہ تھے، بلکہ حکومت کی صلاحیت کار اور مفاد عامہ کے پیش نظر عقل سلیم کی بناپر بنالیے گئے، یہ تمام قوانین وقت کی آئینی حکومت کی طرف سے جاری ہوئے تھے اور وہ شرعی قانون کے منطوق یا مفہوم کے قطعاً خلاف نہ تھے لہٰذا انہیں اس وقت کے لیے ٹھیک قانونی حیثیت حاصل تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لیے جائز سمجھا جائے[1]۔

1 اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول، ص: ٦٧

حکومت کا ڈھانچہ:

اگر تمام حاکمانہ اختیارات امیر کو دیے جائیں تو یہ اختیارات اور ان سے پیدا ہونے والے وظائف صرف اسی کے حوالے ہوں یا ان اختیارات کو وہ بہ اشتراک استعمال کرے گا، مثلاً کابینہ وزراء اس میں شریک ہوگی، کیونکہ وہ مجلس شوریٰ کی بڑی پارٹیوں کی نمائندہ ہوگی اور دوران وزارت میں وہ مجلس شوریٰ ہی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر سکے گی۔ان دونوں صورتوں کے لیے کوئی واضح شرعی قانون موجود نہیں، تاہم بہت سی صحیح احادیث کے منطوق سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک شخصیت میں تمام حاکمانہ اختیارات مرتکز رکھنے کو اسلامی نظام سیاست کے مقاصد کے لیے زیادہ موزوں تصور فرماتے تھے، اسے امیر یا امام کہا گیا ہے۔ یہاں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:

''مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللہ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللہ وَمَنْ یُّطِعِ الْاَمِیْر فَقَدْ عَطَانِیْ وَمَنْ یَّعْصِ الْاَمِیْرِ فَقَدْ عَصَانِیْ وَاِنَّمَا الْاِمَامُ جنۃ یُقَاتِل مِنْ وَّرَائِہ وَیَتّقی''[1]

جس نے میری اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔ جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ امیر ایک ڈھال ہے جس کی حفاظت میں لوگ لڑتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے آپ کو بچائے۔

''کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہِ ، الْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہِ''[2]

ترجمہ: دیکھو تم میں سے ہر ایک گلہ بان ہے اور ہر ایک سے اس کے گلے کے متعلق پوچھا جائے گا۔جو شخص لوگوں پر امام مقرر ہوا ہے وہ بھی گلہ بان ہے اور اپنے گلے کے لئے جواب دہ ہے۔

''وَمَنْ بَایَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاہُ صَفْقَةَ یَدِہِ، وَثَمَرَةَ قَلْبِہِ، فَلْیُطِعْہُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ یُنَازِعُہُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الْآخَرِ''[3]

ترجمہ: جس نے امما کی بیعت کی، اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا، دل کا ثمر اس کے حوالے کیا ضروری ہے کہ جس حد تک استطاعت کرے اور اگر کوئی دوسرا آدمی حق امامت چھیننے کی کوشش کرے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشاد ایسے ہی دوسرے ارشادات حضور ص کے اس حکم عام کے عین مطابق ہیں کہ مسلمان کسی اہم مشترکہ کام میں مصروف ہوں تو ایک آدمی کو دوسرے کی امامت وقیادت کے لئے چُن لینا چاہیے تاہم کہا جاسکتا ہے کہ یورپی نمونے کی پارلیمانی حکومت یعنی کابینہ وزراء جس کے تمام اختیارات براہ راست قانون ساز مجلس سے لیے جائیں اور اسی کے روبرو وہ براہ راست جوابدہ ہو لازما ایک آدمی کی قیادت وامامت کے خلاف مملکت اور وزیر اعظم کے دوگونہ وظیفے اس کی ذات میں جمع

---

1 بخاری، باب القاتل من وراء الامام ویتقی بہ، ج۴، حدیث:۲۹۵۷

2 صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، ج : ۱، حدیث:۸۹۳

3 صحیح مسلم، باب الامر بالوفاء ببیعۃ الخلفاء، ج:۳، حدیث ۱۸۴۴

ہو جائیں گے، لیکن عقل سلیم ہمیں بتاتی ہے کہ ایسا انتظام امیر کی حکومت کو حد درجہ بے ربط بنا دے گا۔ایک طرف وہ ہیئت حاکمہ میں بجائے خود ذوالامر یعنی صاحب اقتدار ہو گا، کیونکہ اسے رائے عامہ سے چنا جائے گا دوسری طرف اسے ان وزراء کو ہیئت حاکمہ کی ذمہ داریوں میں شریک کرنا پڑے گا، جو قانون ساز مجلس کے روبرو فرداً فرداً جوابدہ ہوں گے۔یوں مجلس شوری کی پارٹیاں مملکت میں اختیارات حاکمہ کا سرچشمہ بن جائیں گی۔امیر کو یہ حیثیت حاصل نہ رہ گی۔یہ انتظام اسلامی تصور قیادت کے خلاف ہے اور حکومت کی پالیسی بھی لامحالہ مفاہمت یا لا متناہی سلسلہ ہائے مفاہمت پر موقوف رہ جائے گی۔یہ مفاہمتیں مختلف اور بعض اوقات متصادم پارٹیوں کے پروگراموں میں قبول کرنی پڑیں گی۔اس طرح وہ یکسوئی، یک آہنگی اور داخلی تواتر پیدا نہ ہو گا، جو اسلامی مملکت کے لیے حد درجہ ضروری ہے۔

مخالف پارٹیوں کے پروگرام کے درمیاں مفاہمت کا یہ اصول ممکن ہے، بہت ضروری ہو۔۔ بعض اوقات اخلاقی اعتبار سے حق بجانب بھی ہو جاتا ہے۔۔۔ خصوصا ان گرہوں میں، جو کسی قطعی نظریے کی روح سے معمور ہوتے۔اس وجہ سے تمام سیاسی فیصلے لوگوں کے بدلتے ہوئے قطعی نظریے کے تابع رکھتے ہیں اور یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ خاص حالات میں صحیح راہ عمل کیا ہو سکتی ہے، نظریاتی اسلامی مملکت میں ایسی صورت حال پیش ہی نہیں آسکتی۔وہاں نیک و بد اور حق و باطل کے تصورات مستقبل حیثیت رکھتے ہیں۔اور انہیں وقتی مصلحتوں پر منحصر نہیں رکھا جاسکتا۔ایسی مملکت میں صرف قانوں ہی نہیں، بلکہ انتظامی پالیسی میں بھی وہ نظریاتی حیثیت ہر وقت واضح رہنی چاہیے، جس پر ملت کا اتفاق ہو چکا ہے اور اگر حکومت کو عام کاروبار سیال سیاسیات احزابیہ کے تابع رکھنا پڑے تو ایسا ہونا (نظریے کا قانوں اور انتظامی معاملات میں اظہار) ممکن ہی نہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی مجلس شوری میں پارٹیوں کا وجود خارج از بحث ہے۔اگر نقد و نظر اور رائے کی آزادی کا حق ہر شہری کا طبعی حق تسلیم کیا جاتا ہے (اور اسلام کا سیاسی تصور بے شائبہ ریپ یہی ہے) تو لوگوں کو گروہ بندی کی آزادی حاصل رہنی چاہیے، اگر وہ چاہیں تو کسی مسئلے کے متعلق آراء کے اظہار کی اشاعت کر سکیں، جن پر مملکت کی پالیسی مبنی ہونی چاہیے، لیکن یہ ضرورت کہ آراء اس نظرئے کے خلاف نہ ہوں، جس پر مملکت کی بنا رکھی گئی ہے، یعنی شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ان پارٹیوں کو مجلس شوریٰ کے اندر اور باہر اپنے آراء کے پیش کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے، تاہم پارٹیاں بنانے اور پروگراموں کی اشاعت کرنے کی آزادی کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ حکومت کے انتظامی کاروبار پر اثر پڑے۔اگر حکومت ایسے وزراء سے مرکب ہو گی، جو اپنی پارٹیوں کے حکم تابع رہ کام کریں اور انہی کے روبرو جواب دہ ہوں تو یقینا حکومت کے عملی کاروبار پر اثر پڑے گا[1]۔

ان حالات کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ صرف امیر ی ہی ایسی شخصیت ہے، جسے انتظامی اختیارات و وظائف سونپے جانے چاہئیں اور وہی مجلس کے روبرو۔۔اور مجلس کے ذریعے سے عوام کے روبرو۔۔کاروبار حکومت کے لیے جوابدہ

1 اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول، ص:۱۰۹

ہوگا۔وزراء کو صرف اس کے انتظامی مددگاروں یا سیکریٹری کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔وہی اپنی صوابدید کی بناپر انہیں مقرر کرے اور اسی کے سامنے جوابدہ ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ لفظ وزیر، جو رسول ﷺ نے معاملات حکومت کے سلسلے میں استعمال فرمایا، ایک ایسے شخص کے لئے تھا رئیس مملکت کو حکومت کا بوجھ برداشت کرنے میں امداد دے یعنی وہ انتظامی مددگار کے لیے استعمال ہوا تھا۔ مثلا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" إِذَا أَرَادَ اللهُ بِالأَمِيرِ خَيرًا، جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صِدقٍ، إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ، وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ، وَإِذَا أَرَادَ بِهِ غَيرَ ذَلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ سُوءٍ، إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرهُ، وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ"[1]

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کسی امیر کے ساتھ خیر کا ادارہ کرتا ہے تو اسے ایک قابل اعتماد وزیر دے دیتا ہے۔جب امیر کوئی بات بھول جاتا ہے تو یاد دلا تا دیتا ہے اور جب امیر کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو وزیر اس میں معاون ہوتا ہے۔اسی طرح جب کسی امیر کے متعلق خدا کا ارادہ خیر کا نہیں ہوتا تو اس کے لیے برا مددگار مہیا کر دیتا ہے جو نہ بھولی ہوئی چیز یاد دلاتا ہے اور نہ ذکر کردہ کام میں مدد کرتا ہے۔

اگر مسلمان اپنی مملکت یا مملکتوں کے لئے ایک آدمی کا طریق حکومت اختیار کریں تو وہ بالواسطہ اس اصول کے پابند ہو جائیں گے، جو رسول اللہ ﷺ نے تیرہ سو سال پیشتر فرمایا تھا آخری فیصلہ کرتے وقت محض یہی امر ان کے نزدیک خاصا وزنی ہونا چاہیے، لیکن ایک آدمی کے نظام کے حق میں ایک اور دلیل بھی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اولامر (ارباب اختیار) اسلامی مملکت میں صرف مسلمان ہونے چاہیں۔اگر حکومت کے انتظامی اختیارات وزراء کو سونپے جائیں، جو مجلس شوری میں سے احزابی نمائندگی کی بناپر چنے جائیں گے۔۔۔جیسا کہ مغربی یورپ کی پارلیمانی جمہوریتوں میں مروج ہے۔۔۔تو یہ وزراءامیر کے ساتھ مل کر انتظامی اعتبار سے اولوالامر بنیں گے اور ان کے مجلس کی دستاویز ہو گی۔گویا کسی غیر مسلم کو وزیر بنانے کی صورت میں شریعت کی اس دفعہ سے صریح اختلاف ہوگا، جس کے مطابق مملکت کی انتظامی قیادت صرف مسلمانوں کے لیے محفوظ رکھی گئی ہے، لہذا ملت کو یہ مشکل پیش آجائے گی کہ یا تو حکما غیر مسلم شہریوں کے وزارتی عہدے ممنوع قرار دے (اس وجہ سے غیر مسلم اقلیتوں کے لیے معاملات مملکت میں وفادارانہ تعاون مشکل ہو جائے) یا شریعت کے اس بنیادی حکم کو پس پشت ڈال دیا جائے (جس سے مملکت کے اسلامی تصور کی جڑ پر ضرب لگے گی) لیکن اگر تمام انتظامی اختیارات اور حقوق صرف امیر کے حوالے ہوں تو بظاہر وہی تنہا صاحب امر ہو گا اور اپنی حکومت کی سرگرمیوں کے لیے ذمہ دار قرار کرے گا۔وزیر محض اس کے سیکریٹری یا انتظامی معاون ہوں گے۔وہ اپنی مرضی سے انہیں مقرر کرے گا اور ہر ایک کو وہ اختیارات سونپے گا، جو اس کے منصب میں مضمر ہیں۔چونکہ وزیر یا سیکریٹری پالیسی وضع کرنے کے ذمہ دار نہ

---

1 سنن ابی داود، باب فی اتخاذ الوزیر، حدیث نمبر ۲۹۳۲، صحیح

ہوں گے لہذا انہیں بجائے خود اولامر نہیں مانا جائے گا۔اس صورت میں کسی غیر مسلم خو وزارت کا عہدہ دے دینا بھی شرعا قابل اعتراض نہ ہو گا۔اس طرح غیر مسلم شہریوں کے تعلق میں میں ناواجب امتیاز کی نوبیت نہ آئے گی اور حکومت کے لیے ملک کی بہتریں صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو جائے گا[1]۔

خلاصہ بحث:

اگر ہم شریعت کے اجتماعی احکام تجویز کردہ خطوط کے مطابق کر لیں تو اسلام کا سیاسی نظریہ اس وضاحت سے سامنے آجائے گا جس میں یہ کبھی نہ آیا۔اس کی تمام دفعات معین معانی کی حامل ہوں گی، جن میں تعبیرات کے لیے کوئی گنجائش نہ رہے گی۔ہر مسلمان پر واضح ہو جائے گا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے شرعی قانون کی حاکمیت بے چون چرا تسلیم کر لینی چاہیے۔اہل علم کے اجتہاد کی گنجائش ختم نہ ہو گی بلکہ اس کی ضرورت اور بڑھ جائے گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی شریعت کا مدعا کبھی یہ نہ تھا کہ ہماری زندگی کے ہر ممکن واقعے کے متعلق ہر تفصیل بتادی جائے، یہ محض ایک خاکہ تھا اور ہمیں اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لے کر اس کی روشنی میں اپنے یومیہ معاملات ترتیب دینے چاہیے۔اگر ہم یہ یاد رکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ خود ہمارے آزاد استدلال کی کارفرمائی کے لیے کتنا وسیع میدان موجود ہے۔جب تک ہم شریعت کے اجتماعی و سیاسی قوانین کا مجموعہ مرتب کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے، مدت سے فراموش کردہ اس کام پر توجہ نہیں دیں گے اور اسے اپنی اجتماعی زندگی کی بنیاد نہ بنائیں گے تو جب تک یہ نہ ہو گا، مسلمان ان اجتماعی طور طریقوں کے متعلق حد درجہ مخالف نظریات پر قائم رہیں گے، جن کے مطابق کاربند ہو کر اسلام کے فروغ پانے کی امید ہے۔

نظریہ اسلام کو عملی یا غیر عملی ثابت کرنا ہم مسلمانوں کا کام ہے، اگر ہم دور ماضی کے فقہی قیاسات تک اسلامی تصور کا دائرہ محدود رکھیں تو یہ بالکل غیر عملی رہے گا۔اگر ہم حوصلے اور فکر و نظر سے کام لیتے ہوئے اس پر متوجہ ہوں، تازہ اور بے میل نقطہ نگاہ اختیار کرتے ہوئے رسمی فقہی قیاسات کے دائرے سے اسے باہر نکال لیں تو اس کی عملیت روز روشن کی طرح نمایاں ہو جائے گی۔یقیناً یہ بدیع نقطہ نگاہ ہم میں سے اکثر کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے، کیونکہ اکثر طرق فکر سے واضح انقطاع اختیار کرنا لازم ہو گا اور یہ طرق فکر مدت سے مسلمانوں کی عادت ثانیہ چلے آتے ہیں۔جو اجتماعی مراسم صدیوں کے عمل سے تقدس کا درجہ حاصل کر چکے ہیں انہیں ترک کرنا پڑے گا اور ان نئے مراکز کی طرف پیش قدمی کرنی ہو گی، جنہیں ابھی تک ہمارے نقشے پر جگہ نہیں ملی۔

---

1 اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول، محمد اسد، ص:١١١

نتائج بحث

مقالہ نگار موضوع: ''پاکستان میں تجدید واحیائے دین کی معاصر جہتیں و منہاج پر تحقیقی بنیادوں''پر کام کرنے کے بعد درج ذیل نتائج پر پہنچا۔

- عقائد کی اصلاح کے لیے عقلی و نقلی دلائل کو بنیاد بنانا ہے۔
- عقائد کے معاملے میں کسی بھی طرح کی مصلحت سے کام نہ لینا ہے۔
- پاکستان میں بدشگونی کی ہر سطح پر مذمت عقائد کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے۔
- عبادت کے اصل مفہوم سے لوگوں کی ناواقفیت ہے۔
- عبادات کے بنیادی فلسفے سے ناواقفیت، عبادات کے اثرات سے محرومی کا سبب ہے۔
- عبادت سے اللہ کو مقدار نہیں بلکہ معیار مقصود ہے۔
- پاکستان میں نکاح وقت کے ساتھ بڑھتے ہوئے رسم ورواج کی وجہ سے مشکل بن گیا ہے۔
- نکاح میں سادگی معاشرے میں بڑھتی بے راہ روی کو ختم کرنے کا ذریعہ ہے۔
- جدید معاشی معاہدات سے ناواقفیت کی وجہ سے کم لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
- غیر اسلامی فکر تسکین نفس کو بنیاد قرار دیتی ہے اگرچہ وہ کسی بھی طریقے سے حاصل کی جائے۔
- مغرب کے نزدیک علم کی بنیاد عقل ہے جبکہ اسلام میں بنیادِ علم وحی اور عقل ہے۔
- حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اسی لیے تمام معاصر علماء نے پاکستان کے سیاسی ڈھانچے کو اسی تناظر میں ترتیب دینے کی سفارش کی ہے۔

سفارشات و تجاویز

مقالہ نگار درج ذیل سفارشات و تجاویز پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے:

- عقائد کو سمجھانے کے لیے سائنسی بنیادوں اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔
- عبادات پر جدید سہولیات کے اثر کو اصل سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔
- معاملات میں خرید و فروخت کو عام فہم بنانا چاہیے۔
- علم سے ناواقف لوگوں کا دینی علوم پر بحث و مباحثہ معاشرے کی ہر سطح پر روکا جائے۔
- اچھے اور باعلم لوگوں کو فکر اسلامی پھیلانے کے مواقع میسر کئے جائیں۔
- انسانی نفس کی تربیت کے لیے تربیتی پروگرام ترتیب دیے جائیں۔
- محمد اسد کے نظریات کے مطابق پاکستان کے سیاسی منظر نامے کو ترتیب دینے کے لیے ان کے سیاسی نظریات کو عوامی سطح پر عام کرنے کی ضرورت ہے۔
- مولانا مودودیؒ، ڈاکٹر اسرارؒ اور محمد اسدؒ کے نظریات میں مشترکہ نظام حکومت کے نکات کی روشنی میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی میں نظام حکومت کا ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

فنی فہارس

۱۔ فہرست آیات

۲۔ فہرست احادیث

۳۔ فہرست اصطلاحات

۴۔ فہرست اعلام

۵۔ فہرست اماکن

۶۔ فہرست مصادر و مراجع

الف۔ فہرست آیات

1	سورۃ الفاتحہ: ۱	4	اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ	20
2	سورۃ البقرۃ۲:	۲۱	یا ایها الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم	82
3	سورۃ البقرۃ۲:	۳۴	و اذ قلنا للملائکۃ اسجدوا	31
4	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۲۶-۱۲۸	قولوآ أمنا بالله وما انزل الینا	175
5	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۳۸	صِبغۃ الله وَمَن اَحسَنُ مِن اللهِ	175,186
6	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۶۳	و الهکم اله واحد	29
7	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۷۲	یآیهاالذین آمنوا کلو من طیبات ما رزقنکم	100
8	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۷۵	وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا	148
9	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۸۳	یا ایهاالذین آمنوا کتب علیکم الصیام	98
10	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۸۵	شَہرُ رَمَضَانَ الذِی اُنزِلَ فیہِ	118
11	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۸۷	تِلک حُدُودُالله فَلا تقرَبُو ها	99
12	سورۃ البقرۃ ۲ :	۱۹۷	فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ	152
13	سورۃ البقرۃ ۲:	۱۹۸	لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ	125
14	سورۃ البقرۃ ۲	۲۰۸	یَآیہَاالذِینَ آمَنُوا ادخُلُوفِی السِلمِ	161
15	سورۃ البقرۃ ۲:	۲۲۹	تَلک حُدُودُ الله فَلاَ تَعتَدُوهَا	99
16	سورۃ البقرۃ ۲:	۲۲۹	وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَأْخُذُوْا	134
17	سورۃ البقرۃ ۲:	۲۳۷	بِيَدِه عُقْدَۃُ النِّكَاحِ	133
18	سورۃ البقرۃ ۲:	۲۶۳	قول معروف و مغفرۃ	107
19	سورۃ البقرۃ ۲:	۲٦٤	یَآیہَاالذِینَ آمَنُوا لَا تُبطِلُوا صَدَقتِکُم بِالمَن	206
20	سورۃ البقرۃ ۲	۲۷۵	اَ لَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ	148
21	سورۃ البقرۃ۲:	۲۷۵	وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا	149,157
22	سورۃ البقرۃ ۲ :	۲۷۸، ۲۷۹	يَآيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ	157
23	سورۃ البقرۃ ۲:	۲۸۳	وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا	149
24	سورۃ آل عمران ۳:	۱۱۰	کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	232
25	سورۃ آل عمران ۳:	۲۴	لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ	23
26	سورۃ آل عمران ۳:	۷۷	ان الذین یشترون بعهدالله وایمانهم	123
27	سورۃ آل عمران ۳ :	۱۰۳	نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً	58
28	سورۃ آل عمران ۳:	۱۳۵	وَالذِینَ اِذَا فَعَلُوا فَا حِشَۃً اَو ظَلَمُو	106
29	سورۃ آل عمران ۳:	۱۵۹	وَشَاوِرُهُم فِی الاَمرِ	264
30	ور ۃآل عمران ۳:	۱۹۱	الذِینَ یَذکُرُونَ اللهَ قِیٰمًا و قُعُودًا	105
31	سورۃ النساء ۴ :	۱۹	وَعَاشِرُوهُنَّ بِالمَعرُوف	127

32	سورۃ النساء ۴:	۱۹	وَعَاشِرُو هُن بِا لْمَعرُوفِ	108
33	سورۃ النساء ۴:	۲۹	يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ	157
34	سورۃ النساء ۴:	۳۴	والّتِىْ تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ	131
35	سورۃ النساء ۴:	۳۵	وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا	132
36	سورۃ النساء ۴ :	۳۶	وَاعبُدُواللّٰہَ وَلَا تُشرِكُوا بِہٖ شَيئًا	91,108
37	سورۃ النساء ۴ :	۵۸	اِن اللہ يَامُرُكُم اَن تُؤَدُوا الاَمٰنٰتِ اِلٰی اَهلِهَا	108
38	سورۃ النساء ۴:	۵۹	يَآيُهَا الذِينَ اٰمَنُوا اَطِيعُو اللہَ وَ اَطِيعُوا الرَسُولَ	111
39	سورۃ النساء ۴ :	۶۵	فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ	55
40	سورۃ النساء ۴:	۷۴	فَليُقَاتِل فِی سَبِيلِ اللهِ الَذِينَ يَشرُونَ	108
41	سورۃ النساء ۴ :	۱۲۸	وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا	132
42	سورۃ النساء ۴:	۱۶۵	رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ	32
43	سورۃ النساء ۴:	۱۷۰	يٰٓ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ	33
44	سورۃ النساء ۴:	۱۷۱	لا تغلوا فی دینکم	16
45	سورۃ المائدۃ ۵:	۲	وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	149,152
46	ورۃ المائدۃ ۵ :	۳	اَليَومَ اَكمَلتُ لَكُم دِينَكُم	111
47	سورۃ المائدۃ ۵:	۱۸	نَحْنُ اَبْنٰۗءُ اللهِ وَاَحِبَّاۗؤُهُ	22
48	سورۃ المائدۃ ۵:	۱۸	بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ	22
49	سورۃ المائدۃ ۵:	۷۲	اِنَّه مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ	59
50	سورۃ المائدۃ۵:	۹۰	يَا أَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ	145,151,158
51	سورۃ الانعام ۶ :	۱۰۸	وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللهِ	159
52	سورۃ الانعام ۶:	۱۶۲	قُل اِن صَلَاتِی وَنُسُكِی وَمَحيَایَ وَمَمَاتِی	105
53	سورۃ الاعراف ۷:	۲۹	كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ	67
54	سورۃ الاعراف ۷:	۵۹	یقوم اعبد اللہ ما لکم من الہ غیرہ	83,49
55	سورۃ الاعراف ۷ :	۱۴۰	قال اغیر اللہ ابغیکم الها	31
56	سورۃ الاعراف ۷:	۱۵۸	قل یا ایها الناس انی رسو ل اللہ الیکم جمیعا	59
57	سورۃ الاعراف ۷ :	۱۸۷	یسئلونک عن الساعۃ ایان مرساها	47
58	سورۃ الاعراف ۷:	۱۸۸	ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر	63
59	سورۃ الاعراف ۷ :	۱۸۹	هوالذی خلقکم من نفس واحدۃ	127
60	سورۃ انفال ۸:	۴۶	وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَه وَلَا تَنَازَعُوْا	34
61	سورۃ الانفال ۸:	۶۳	لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ	58
62	سورۃ التوبۃ ۹ :	۱۰۳	خذ من اموالهم	89,100
63	سورۃ یونس ۱۰:	۲	اکان للناس عجبا ان اوحینا الیٰ رجل منهم	61
64	سورۃ یونس ۱۰:	۱۸	هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللهِ	22
65	سورۃ یونس ۱۰:	۳۰	هُنَالِكَ تَبْلُوكُلُّ نَفْسٍ مَّآاَسْلَفَتْ	72
66	سورۃ یونس ۱۰:	۴۹	قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعاً الا ماشاء اللہ	64
67	سورۃ الرعد ۱۳:	۱۹-۲۲	اَفَمَن يَعلَمُ اَنَمَا اُنزِلَ اِلَيکَ مِن ربکَ الحَقُ	112

68	سورة الرعد ۱۳:	۲۸	الا بذکر اللہ تطمئن القلوب	116
69	سورة الرعد ۱۳:	۴۰	وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ	65
70	سورة النحل ۱۶ :	۳۶	وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا	33
71	سورة اسراء ۱۷:	۲	كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَآءِ مِن عَطَاءِ رَبِّکَ	102
72	سورة اسراء ۱۷:	۵۲-۴۹	وَ قَالُواءَاِذَاكُنَّاعِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّالَمَبْعُوثُونَ	69
73	سورة اسراء ۱۷:	۷۰	ولقد کرمنا بنی آدم	61
74	سورة اسراء ۱۷:	۹۳	قل سبحان ربی هل كنت الا بشرا رسولا	61
75	سورة اسراء ۱۷:	۹۴	وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى	62
76	سورة الكهف ۱۸ :	۴۹	ما لهٰذالكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة	43
77	سورة الكهف ۱۸:	۱۱۰	قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ	16
78	سورة مريم ۱۹:	۶۶،۶۷	وَ يَقُولُ الْاِنسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ	67
79	سورة مريم ۱۹:	۸۷	لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا	23
80	سورة مريم ۱۹:	۹۳	اِن كُلُّ مَن فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	72
81	سورة طٰہٰ ۲۰ :	۱۴	انتی انا الله لا اله الا انا فاعبدنی و اقم الصلوة لذكرى	29
82	سورة طٰہٰ ۲۰ :	۵۵	مِنْهَا خَلَقْنَا كُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ	67
83	سورة الانبياء ۲۱:	۳	وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا	61
84	سورة الانبياء ۲۱:	۷،۸	وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ فَاسْاَلُوْٓا	62
85	سورة الانبياء ۲۱ :	۲۵	وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ	49
86	سورة الانبياء ۲۱:	۳۴	وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ	65
87	سورة الانبياء ۲۱ :	۷۳	وجعلنهم ائمة يهدون بامرنا	88
88	سورة الانبياء ۲۱:	۱۰۸	قل انما يوحى الیّ انما الهكم	30
89	سورة الحج ۲۲:	۵	وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا	147
90	سورة الحج ۲۲:	۳۲	تقوى القلوب	82
91	سورة الحج ۲۲:	۳۷	لَن يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا	206
92	سورة المومنون ۲۳:	۵۱	يآيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحا	100
93	سورة النور ۲۴:	۲۴	يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيدِيهِمْ	73
94	سورة النور۲۴:	۵۵	وعدالله الذين آمنوا و عملو الصّٰلحٰت	95
95	سورة الفرقان ۲۵:	۴۳	اَرَئَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ	25
96	سورة الفرقان ۲۵ :	۵۴	وهوالذی خلق من الماء بشرًا	128
97	سورة النمل ۲۷:	۶۵	قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ	52
98	سورة القصص ۲۸:	۵۶	انک لا تهدی من احببت	64
99	سورة العنكبوت ۲۹:	۹	اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ	70
100	سورة العنكبوت ۲۹ :	۴۵	وَاَقِمِ الصَّلوٰةَ اِنَّ الصَّلوٰةَ تَنْهٰى	97,116
101	سورة الروم ۳۰ :	۲۷	وَ هُوَ الَّذِی يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُه	70
102	سورة لقمان ۳۱ :	۱۲	ومن يشكر فانما يشكر لنفسه	87
103	سورة لقمان ۳۱:	۲۸	مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ	69

104	سورة الاحزاب ۳۳:	۴۰	ما کان محمد ابا احد منکم من رجالکم	59
105	سورة سبا ۳۴:	۲۸	وما ارسلنک الا کافۃً للناس بشیرًا و نذیرً	59
106	سورة سبا ۳۴:	۲۲	قل ادعو الذین زعمتم من دون اللہ لا یملکون	63
107	سورة فاطر ۳۵ :	۱۸	انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب	116
108	سورة یٰس ۳۶:	۷۷،۷۸،	اَوَلَمْ یَرَ الْاِنسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ	68
109	سورة الصٰفٰت ۳۷:	۱۱	فَاسْتَفْتِہِمْ اَھُمْ اَشَدُّ خَلْقًا	71
110	سورة الزمر ۳۹:	۳	مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُونَا اِلَی اللہِ زُلْفٰی	22
111	سورة الزمر ۳۹:	۳۰	انک میت وانھم میتون	65
112	سورة المومن ۴۰ :	۵۷	لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ	71
113	سورة حٰم سجدہ ۴۱:	۴	اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیَاتِنَا	65
114	سورة فصلت ۴۱:	۳۷	لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ	23
115	سورة الشوریٰ ۴۲:	۳۸	وَامرھُم شُوریٰ بَینَھُم	50
116	سورة الشوریٰ ۴۲:	۵۲	ما کنت تدری ماالکتاب ولا الایمان	62
117	سورة الزخرف ۴۳:	۱۵	وجعلوا لہ من عبادہ جزءا	60
118	سورة الجاثیۃ ۴۵:	۴	وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ	23
119	سورة الجاثیۃ ۴۵:	۲۶	قُلِ اللہُ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یَجْمَعُکُمْ	66
120	سورة الاحقاف ۴۶:	۹	قل ما کنت بدعامن الرسل وما ادری ما یفعل	63
121	سورة محمد ۴۷ :	۳۸	وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ	50
122	سورة الحجرات ۴۹:	۱۳	یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَاُنْثٰی	177
123	سورة الحجرات ۴۹ :	۱۳	ان اکرمکم عندا للہ اتقاکم	185
124	سورة ق ۵۰ :	۱۵	اَفَعَیِینَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ	70
125	سورة ق ۵۰ :	۱۶	ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس بہ	40
126	سورة ق ۵۰ :	۱۸	ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید	41
127	سورة الذاریات ۵۱:	۵۶	وما خلقت الجن الانس الا لیعبدون	83,104
128	سورة الذاریات ۵۱:	۵۷	ما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون	83
129	سورة الرحمٰن ۵۵:	۹	وَاَقِیمُوالوَزنَ بِالقِسطِ	109
130	سورة المجادلۃ ۵۸:	۶	یَوْمَ یَبْعَثُھُمُ اللہُ جَمِیعًافَیُنَبِّئُھُم بِمَا عَمِلُو	72
131	سورة المجادلۃ ۵۸ :	۷	ثُمَّ یُنَبِّئُھُم بِمَا عَمِلُو	72
132	سورة الحشر ۵۹:	۷	وَمَآ اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا	34
133	سورة الممتحنہ ۶۰:	۴	لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَا اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللہِ مِنْ شَیْءٍ	18
134	سورة الصف ۶۱ :	۱۰۲	یَا اِبرٰھِیم قَد صَدَقتَ الرُّءیاء	207
135	سورة الجمعہ ۶۲ :	۱۰	فَإِذَا قُضِیَتِ الصَّلَاۃُ فَانْتَشِرُوْا	125
136	سورة التغابن ۶۴:	۸	فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا	33
137	سورة الملک ۶۷ :	۱۵	ھُوَالَذِی جَعَلَ لَکُمُ الاَرضَ	109
138	سورة المعارج ۷۰ :	۱۹،۲۲	ان الانسان خلق ھلوعا	117
139	سورة الجن ۷۲:	۲۲	قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا	64

140	سورة الجن ٧٢ :	٢٥	قل ان ادرى اقريب ما توعدون	63
141	سورة الجن ٧٢:	٢٧،٢٦	عٰلم الغيب فلا يظهر علىٰ غيبه احدا	62
142	سورة القيامة ٧٥ :	٢،٣	اَيَحْسَبُ الْاِنسَانُ اَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَه	69
143	سورة القيامة ٧٥ :	٣٦،٤٠	اَيَحْسَبُ الْاِنسَانُ اَن يُتْرَكَ سُدًى	68
144	سورة النازعات ٧٩:	٢٧-٢٩	ءَاَنتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا	70
145	سورة اليل ٩٢ :	١٨	وسيجنبها الاتقى الذى يؤتى ماله يتزكّٰى	81
146	سورة التين ٩٥:	٤	لقد خلقنا الانسان فى احسن تقويم	31
147	سورة العصر ١٠٣:	١-٣	والعصر ، ان الانسان لفى خسر	192

ب۔ فہرست احادیث

نمبر شمار	احادیث	کتاب	صفحہ نمبر
1	انْطَلَقْتُ فِي وَفْدِ بَنِي عَامِرٍ	الادب المفرد	17
2	اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي أَنْ أَسْتَغْفِرَ لِأُمِّي	صحيح مسلم	18
3	"أَلَا أَبْعَثُكَ عَلَى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ	صحيح مسلم	56
4	اِن الله لَا يَنظرُ اِلَى صُوَرِكُم وَ اَموَالِكُم	صحيح مسلم	79
5	الْعِيَافَةُ، وَالطِّيَرَةُ، وَالطَّرْقُ مِنَ الْجِبْتِ	سنن ابی داؤد	20
6	اَلَا وَاِن فِی الجَسَدِ مُضغَۃً اِذَا صَلَحَت	صحيح مسلم	79
7	اَللٰهُم مُصرِفَ القُلُوبِ صرف قُلوبنا	صحيح مسلم	79
8	انما الاعمال بالنيات	صحيح بخاري	81
9	اِنَ مِن اَعظَم الجِهَاد	سنن ابی داؤد	110
10	اَرْبَعَ من كن فيہ كان منافقا خالصا	صحيح بخارى	113
11	"ان الله يقول انا ثالث الشريكين	سنن ابی داؤد	124
12	البيعان بالخيار مالم يتفرقا	صحيح بخارى	124
13	أيما امرأة سألت زوجہا طلاقًا	سنن ابی داؤد	130
14	إِنْ كَانَ يَدًا بِيَدٍ فَلَا بَأْسَ	صحيح بخاري	149
15	استَوصُوا بالنِّسَاء خَيْرًا، فانَّہُنَّ خُلِقنَ مِن ضلع	صحيح بخاري	127
16	الا فليبلغ الشاہد الغائب فرب مبلغ	صحيح بخاري	245
17	اذا حكم الحاكم فاجتهد ثم اصاب فلہ اجر ان	صحيح بخاري	264
18	بنی الاسلام علی خمس شہادة ان لا الٰہ الاالله	صحيح بخاري	92
19	تنكح المرآة لاربع : لمالها ، ولحصبها	صحيح مسلم	135
20	اَلتَقوٰى هَاهُنَا	صحيح مسلم	79
21	التاجر الصدوق الامين مع النبين	سنن ترمذی	124
22	الرهن مركوب ومحلوب	سنن دار قطنی	150
23	الراشی والمرتشی فی النار	المعجم الاوسط	151
24	الشِّرْكُ الْخَفِيُّ أَنْ يَعْمَلَ الرَّجُلُ	مستدرک علی الصحيحين	26
25	عمل الرجل بيده و كل بيع مبرور	مسند احمد	126
26	" لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ	صحيح مسلم	50
27	"لَا عَدْوَى، وَلَا طِيَرَةَ	سنن ابی داؤد	20
28	لَا غُولَ	سنن ابی داؤد	21
29	لا ربا بين مسلم وحربي في دار الحرب	معرفة السنن والآثار	152
30	لا تبع ما ليس عندك	سنن ا بی داؤد	153
31	مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطَى لِلّٰہِ	سنن ا بی داؤد	37

32	"مَنْ أَتَى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ،	صحیح مسلم	52
33	مَنْ أَتَى عَرَّافًا أَوْ كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ	مسند احمد	52
34	" مَن سَأَلَ الله الشَهَادةَ بِصِدقٍ بَلَّغَهُ الله	صحیح مسلم	81
35	مَن لَم يَدَع قَول الزُورِ وَالعَمَلَ بِہ	صحیح بخاری	99
36	من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليحسن اِلى جاره	صحیح مسلم	112
37	من غش فليس منا	صحیح مسلم	114
38	نهى رسول الله ﷺ عن بيع الغرر	سنن ترمذی	124
39	النكاح من سنتى	سنن ابن ماجہ	126
40	وَأَنَا المَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللَّهُ بِي الكُفْرَ	صحیح بخاری	26
41	"واما طہ الاذى عن الطريق	صحیح بخاری	107
42	وَاللهِ لَو اَنَّ فاطمةَ بنتَ محمدٍ سَرِقَتْ لَقَطَعَ محمدٌ يدَها	صحیح بخاری	178
43	يَا سَيِّدَنَا، وَابْنَ سَيِّدِنَا، وَيَا خَيْرَنَا، وَابْنَ خَيْرِنَا،	مسند احمد	17
44	يَا مُعَاذُ أَتَدْرِي مَا حَقُّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ	صحیح بخاری	49
45	يا معشر الشباب من استطاع منكم	صحیح بخاری	126

ج۔ فہرست اصطلاحات

نمبر شمار	اصطلاحات	صفحہ نمبر
1	اسلامائیزیشن	11
2	تجدید	8
3	مجدد	11
4	سود	147
5	غرر	147
6	قمار	144
7	بیع العینہ	159
8	جہیز	138

د۔ فہرست اعلام

صفحہ نمبر	شخصیات	نمبر شمار
61	حضرت عمر فاروقؓ	1
54	احمد بن عبد الحلیم المعروف بہ ابن تیمیہ	2
54	ابو عبداللہ شمس الدین محمد بن ابو بکر المعروف بہ ابن القیم	3
130	مولانا اشرف علی بن عبد الحق	4
224	شیخ احمد سرہندی ابن شیخ عبد الاحد فاروقی المعروف مجدد الف ثانی	5
145	حضرت شاہ ولی اللہ ابن شاہ عبد الرحیم	6
85	شیخ محمد عبدہ	7
19	عدی بن حاتم	8

ہ۔ فہرست اماکن

نمبر شمار	جگہ	صفحہ نمبر
1	حجاز	53
2	یمن	53
3	شام	53
4	عراق	53
5	مصر	54
6	خراسان	54
7	ملائشیا	267
8	انڈونیشیا	267
9	انڈیا	261

فہرست مصادر ومراجع

القرآن الکریم

احکام اسلام عقل کی نظر میں 'اشرف علی تھانوی 'مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی کراچی، ۲۰۰۹

اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش 'ڈاکٹر محمد امین 'بیت الحکمت لاہور 'اشاعت ۲۰۰۶

اسلام اور سیکولرزم 'یوسف القرضاوی، مطبع ادارہ تحقیقاتی اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷

اسلام اور عصر حاضر، مولانا سمیع الحق، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور، ۱۹۷۶ء

اسلام اور مغربی تہذیب میں فرق 'عادل لطیف، اشاعت ۲۰۱۷

اسلام اور جدید فکری مسائل 'مولانا خالد سیف اللہ رحمانی' مکتبہ قاسم العلوم 'اردو بازار لاہور 'بدون تاریخ

اسلام دور جدید کا خالق، مولانا وحید الدین خان، مکتبہ الرسالۃ نئی دہلی، ۲۰۰۲ء

اسلامی ریاست، ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، اشاعت ۱۹۹۳ء

اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم 'ڈاکٹر یوسف القرضاوی مترجم: خدا بخش کلیار ایڈووکیٹ 'الفیصل ناشران '۲۰۰۸

اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب 'علامہ ابن تیمیہ 'لکھنوٴ پبلیشنگ ہاؤس لکھنوٴ '۱۹۷۹ء

اسلامی تہذیب حقائق اور خصوصیات 'نایاب حسن سیتامڑی، دارالعلوم دیوبند، ۱۴۳۲ ہجری، بمطابق ۲۰۱۱ء

اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید، ڈاکٹر محمد علی ضناوی، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۶ء

اسلامی تہذیب وتمدن 'عبادالحسن فاروقی 'ریاظ، ۱۹۹۶

اسلامی دستور حیات 'غلام احمد حریری، لاہور پولیمر پبلیکیشنز، ۱۹۸۰

اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول، محمد اسد، المکتبۃ الرحمانیہ لاہور، ۲۰۰۶ء

اصلاح الرسوم 'مولانا اشرف علی تھانوی 'مکتبہ رحمانیہ لاہور، ۲۰۱۵ء

افہام القرآن 'پروفیسر مسز کنیز فاطمہ، قریشی برادر پبلشرز، اردو بازار لاہور، بدون تاریخ

انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا، ناشر دائرۃ المعارف بریطانیکا انکارپوریشن، ۲۰۱۰ء

انشورنس اسلامی معیشت میں 'ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی 'اسلامک پبلیکیشنز لاہور 'بدون تاریخ

الاجتہاد الجماعی ودور المجامع الفقہیۃ فی تطبیقہ، الدکتور محمد شعبان اسماعیل، ناشر دار البشائر الاسلامیہ، حلب، سوریا 'بدون تاریخ

الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، الدکتور عبدالمجید السّوسوہ ناشر وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ الدوحۃ قطر 'بدون تاریخ

الادب المفرد، محمد بن اسماعیل بخاری، مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع الریاض '۱۹۹۸

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابن عبد البر، دار الجیل بیروت، ۱۹۹۲
الاسماء الصفات، بیہقی، الطبعۃ الاولے فی المطبع المسمے بانوار احمدی، الہ آباد، ہند، ۱۳۱۳ھ
الاعلام خیر الدین زرکلی، دار العلم للملایین، ۲۰۰۲ء
تاریخ ابن کثیر، علامہ حافظ ابو الفدا عماد الدین ابن کثیر، نفیس اکیڈیمی کراچی، ۱۹۸۷ء
بدائع الصنائع، علاؤ الدین المعروف ابو بکر الکاسانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۶
بدعات اور انکا شرعی پوسٹ مارٹم، شیخ احمد بن حجر، دار الکتب السلفیہ، لاہور، ۲۰۱۰ء
بہشتی زیور، مولانا اشرف علی تھانوی، توصیف پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور، بدون تاریخ
پادریوں کے کرتوت، محمد متین خالد، انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف تحفظ ختم نبوت، جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۳ء
تاریخ اخلاق یورپ، پول لیکی ایڈورٹ ہارٹ، مترجم عبد الماجد دریاآبادی، سٹی بک پوائینٹ کراچی، ۲۰۰۶ء
تجدید واحیائے دین، سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز، کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور پاکستان، فروری ۲۰۱۰
تجدید دین، مولانا وحید الدین خاں، مکتبہ الرسالۃ نئی دیلی، اشاعت ۱۹۹۰ء
تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۹۶ء
تعارف تہذیب مغرب اور فلسفہ جدید، پروفیسر مفتی محمد احمد، ۲۰۱۴
تفسیر القرآن الکریم، تفسیر المنار، محمد رشید بن رضا، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۹۰ء
تفسیر القرآن العظیم، عبد الرحمٰن بن محمد بن ادریس الرازی ابن ابی حاتم، مکتبہ نزار مصطفی الباز، بدون تاریخ
تہذیب النسواں، نواب شاہ جہان بیگم صاحبہ، نعمانی کتب خانہ لاہور، ۲۰۱۵ء
مختصر الترغیب والترھیب، حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، دار العلم ممبئی، ۲۰۰۷ء
اسلام اور جدید معیشت و تجارت، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن کراچی، ۲۰۱۶ء
چند معاشی مسائل اور اسلام، یعقوب شاہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۴ء
حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ، کتب خانہ شان اسلام لاہور، ۲۰۱۲ء
حضارۃ الاسلام، انور الجندی، دار الانصار، ۲۰۰۹ء
حلال و حرام، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مکتبہ نعیمیہ دیوبند، ۲۰۱۶ء
خدا اور تصور خدا، علامہ نیاز فتح پوری، فکشن ہاؤس ۲۰۱۷ء
خطبات حصہ دوم، حقیقت صوم و صلوٰۃ، ابو الاعلیٰ مودودی، ادارۃ ترجمان القرآن لاہور، مئی ۲۰۰۳ء

خواتین اسلامی انسائیکلوپیڈیا' ابوالفضل نور احمد' اسلامیکا فاؤنڈیشن کراچی' ۲۰۱۱ء
خواتین کا اسلام' ہفتہ روزہ' طبع ۱۷ جنوری ۲۰۱۷ء
ردالمختار علی الدر المختار (حاشیہ ابن عابدین)' عالم الکتاب' ۲۰۰۹ء
ذکر و فکر' مفتی محمد تقی عثمانی' مکتبہ معارف القرآن کراچی' ۲۰۰۶ء
رسوم اقوام' علی عباس جلالپوری' جلال پور شریف' ۱۹۳۸ء
روزنامہ اوصاف اسلام آباد تاریخ اشاعت ۲۲ تا ۲۴ جون ۲۰۱۸ء
روزنامہ پاکستان لاہور ۱۱ اپریل ۲۰۰۱
روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۵ فروری ۲۰۰۷
سنن ابن ماجہ' امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی' مکتبہ اسلامیہ' ۲۰۱۵ء
سنن ابی داؤد' سلیمان بن اشعث' دارالسلام' ریاض' ۱۴۲۷ھ
سنن دار قطنی' امام ابوالحسن علی بن عمر الدار قطنی' ادارہ اسلامیات کراچی' ۲۰۱۵ء
سنن النسائی' احمد بن شعیب النسائی' دارالسلام الریاض' بدون تاریخ
سنن الترمذی' امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، دارالکتب السلفیہ' ۱۹۷۵ء
سہ ماہی منہاج' طبع: جولائی ۱۹۸۶ء
شعب الایمان' ابو بکر احمد بیہقی' مکتب الرشد ہند' ۲۰۰۳
صحیح بخاری' محمد بن اسماعیل' مکتبہ اسلامیہ لاہور' ۲۰۱۲ء
صحیح مسلم، مسلم بن حجاج نیشاپوری' داراحیاء التراث العربی' بیروت' بدون تاریخ
صوم رمضان' مولانا وحید الدین خاں' الرسالۃ بکس' نئی دہلی' ۲۰۰۳ء
عبادات' علامہ محمد قطب اردو ترجمہ: ڈاکٹر سید شفیق الرحمٰن منبر التوحید والسنۃ' بدون تاریخ
علمی تحقیقی مجلہ فقہ اسلامی' اگست ۲۰۰۶ء
العبودیۃ' ابن تیمیۃ المکتب الاسلامی بیروت' ۲۰۰۵
غیر مسلم تہوار بے حیائی کا بازار' تفضیل احمد ضیغم ایم اے' دارالاندلس لاہور' ۲۰۰۹ء
فتح الباری شرح صحیح بخاری' علی بن احمد بن حجر العسقلانی' دارالکتب السلفیۃ' ۲۰۱۰ء
فقہ السنۃ' السید سابق' مکتبہ اسلامیہ لاہور' ۲۰۱۵ء
الفقہ علی مذاہب الاربعۃ' عبدالرحمان الجزیری' دارالکتب العلمیۃ' ۲۰۰۳ء

قانون شریعت' مولانا شمس الدین' رضوی کتاب گھر دہلی' ۲۰۱۸ء
قصص الانبیاء' مولانا عبدالعزیز ہزاروی' مکتبہ عزیز کراچی' ۱۹۹۴ء
کتاب الہند' البیرونی' الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور' ۲۰۱۲ء
کفایت المفتی' مولانا مفتی کفایت اللہ' دارالاشاعت کراچی' ۲۰۰۱ء
لغات روزمرہ' شمس الرحمان فاروقی' کراچی' ۲۰۱۲ء
ماہنامہ مجلۃ الدعوۃ، فروری ۲۰۰۳
ماہنامہ تعمیر افکار' کراچی فروری ۲۰۰۷
ماہنامہ زندگی نو' مارچ ۲۰۰۷
ماہنامہ "زندگی نو" نئی دہلی۔ جولائی ۲۰۱۶
ماہنامہ الشریعہ' جامعہ فریدیہ اسلام آباد ۲۰۰۵
ماہنامہ الشریعہ' گوجرانوالہ تاریخ اشاعت نومبر ۲۰۰۲
محاضرات فقہ' ڈاکٹر محمود احمد غازی' الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور' ۲۰۱۵ء
مرقاۃ المفاتیح، ملا علی قاری، دار الفکر بیروت لبنان، ۲۰۰۶
مصادر التشریع فیما لا نص فیہ' شیخ عبدالوھاب، خلاف، بدون تاریخ
مرقاۃ المفاتیح' مولانا علی قاری' دار الفکر بیروت' لبنان' ۲۰۰۲
مستدرک علی الصحیحین' ابو عبداللہ حاکم' دار الکتب العلمیۃ' بیروت' ۱۹۹۰
مسند احمد بن حنبل، احمد بن محمد بن حنبل، مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۱ء
معاشیات اسلام' ابوالاعلیٰ مودودی' اسلامک پبلشرز لمیٹڈ لاہور' ۱۹۷۹
معرفۃ السنن والآثار، ابو بکر البیہقی، دار الوفاء قاھرۃ ۱۹۹۱ء
منہج نبوی انقلاب، ڈاکٹر اسرار احمد، ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۹ء
موطا امام مالک' موسسۃ زاید بن سلطان الامارات' ۲۰۰۴ء
المعجم الکبیر طبرانی' المکتب الاسلامی' دار عمار' ۱۹۸۵ء
المعجم المختص بالمحدثین' ذہبی' مکتبۃ الصدیق' الطائف ۱۹۸۸ء
واہ رے مسلمان' سلیم رؤف' صفہ دعوت اصلاح گوجرانوالہ' ۲۰۱۰ء
ہفت روزہ القلم' پشاور ۲ تا ۸ مارچ ۲۰۰۷ء

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے'صباح الدین عبدالرحمان' معارف پریس اعظمگڈھ' ۱۹۸۰ء

George Gamow, Biography of the Earth, New American library Mentor, 1948.

Man the Unknown, Alexis Carrel, France, 1935.

king of the castle ,Gai Eaton, New Edn. Cambridge Islamic text Society,1991.

Postmodernity , Lyon david , open university press, buckingam , Britain 1994.

Western civilization, Burns Em, Norton,Newyork, 1973.

Urduweb.org/mehfil/threads/62384

/http://www.urdumajlis.net/threads/21084.

https://hamariweb.com/articles/16004

https://www.urdunews.com/node/20035

http://www.theholidaysspot.com/newyear/history.htm

http://www.suite101.com/references/new-year-history

http://www.infoplease.com/spot/aprilfools1.htm

http://xn--fools-xu3b.us/history-april-fools.htm

https://www.javedahmedghamidi.org